بنگلہ دیشی ناول

دریا بی بی

شوکت عثمان

ترجمہ: ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زہرا

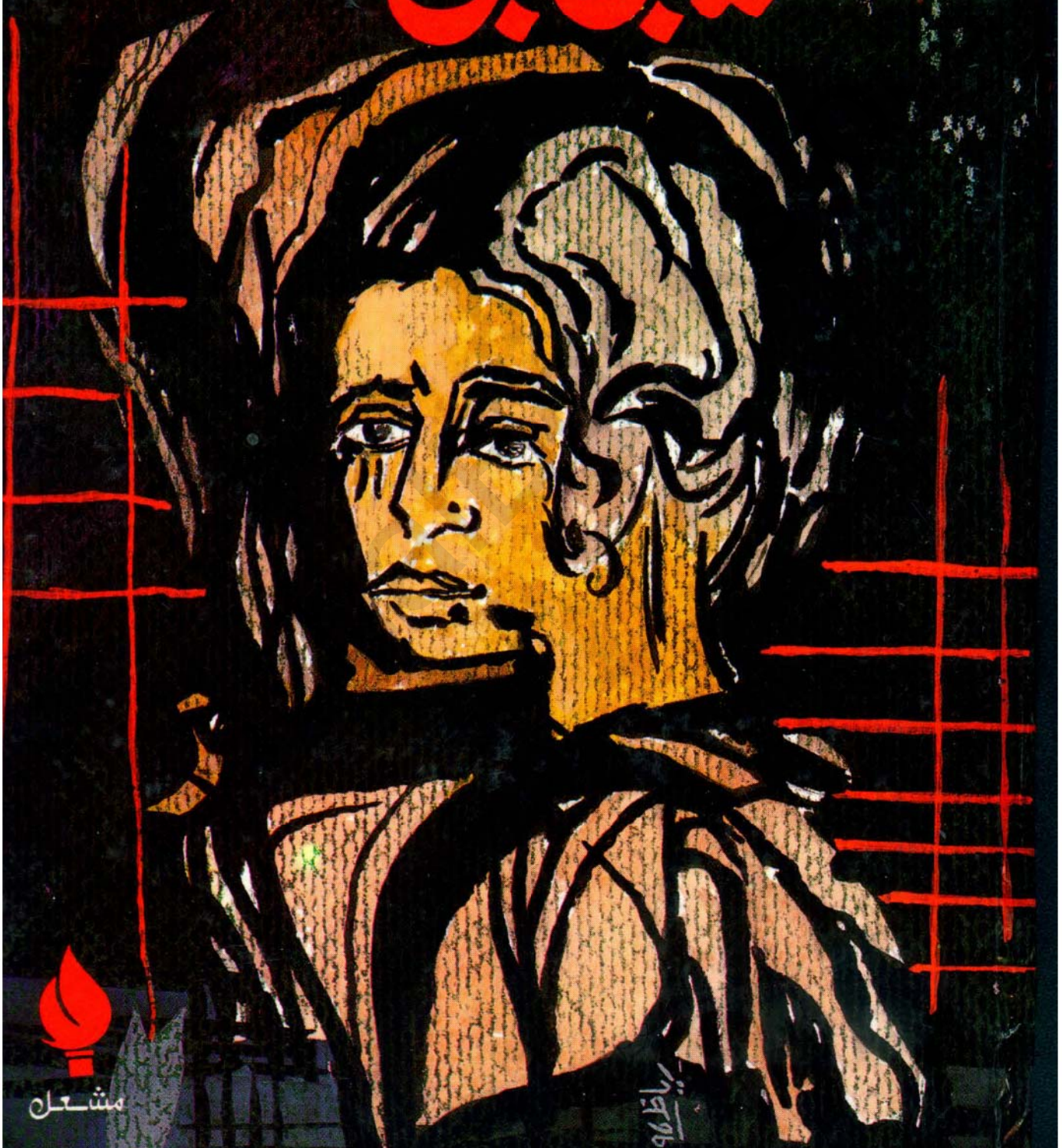

مشعل

دریابی بی

بنگلہ دیشی ناول

مصنف: شوکت عثمان

ترجمہ: ڈاکٹر عارفہ سیدہ زہرا

مشعل

آر-بی 5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور 54600، پاکستان

MashalBooks.org

پیش لفظ

شوکت عثمان کے ناول کے اصل نام ''جننی'' کا ترجمہ کرنا ناممکن ٹھہرا۔ ایک زبان کے مترادفات دوسری زبان میں مل جاتے ہیں معنی کا ترجمہ کرنا ہی سہل نہیں ہوتا۔ احساس کا ترجمہ کرنا ناممکن ہے۔ ہندی اور بنگالی زبان کا یہ لفظ زمین کے لیے بھی ہے اور عورت کے لیے بھی۔ دونوں کے مقدر بھی ایک دوسرے سے مختلف نہیں اور ان دونوں اپنے ظرف میں ایک دوسرے سے مماثل ہیں۔ لازمی طور پر ان کے ساتھ برتاؤ بھی ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ وہ مادروطن کی پناہ ہو یا مامتا کی چھاؤں۔ انسان دونوں کا برابر محتاج ہے۔ دونوں اپنے سے متعلق لوگوں کے لئے بے زبان میزبان ہیں، چاہے کسی حیثیت میں ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ دریا سے چلو بھر پینے والوں کو دریا کی وسعت اور درد کی گہرائی سے کوئی غرض نہ رہی ہو۔

ناول کا مرکزی کردار دریا بی بی ہے جو اردو ترجمے میں ناول کا نام ٹھہرا۔ یہ بی بی واقعی دریا ہے۔ اپنی ذات میں اکیلی اور پھر بھی ایک اکیلی ذات نہیں۔ زندگی اس کو کس کس رنگ میں ملتی ہے اور وہ اس سے کس کس طرح نبٹتی ہے۔ اس ایک عورت کی زندگی میں تین مرد شامل ہیں۔ زندگی وہ پھر بھی اکیلے ہی بسر کرتی ہے۔ وہ تینوں کے بچوں کی ماں بنتی ہے۔ اور بچے اس کی رگ جاں ہیں۔ ممتا اولاد کی خاطر عزت نفس کو زہر پلا دیتی ہے۔ لیکن اولاد کی نظروں سبک میں ہو جانا برداشت نہیں کر پاتی۔ اور اس سودے میں جان سے گزرنا قبول ہو جاتا ہے۔ یہی پائمالی اس زمین کا مقدر ہے جہاں دریا بی بی کی کہانی جنم لیتی ہے۔ سیاست اور مذہب کی بساط پر زندگی مہرہ بنی رہتی ہے۔ یہ کہانی میں بھی ہے اور حقیقت میں بھی ایک وہ

MashalBooks.org

ہیں جو چال چلتے ہیں اور ایک وہ ہیں جو چال میں آجاتے ہیں۔ ایک کا کبھی نقصان نہیں ہوتا اور ایک کے ہاتھ کبھی کچھ نہیں آتا۔ شوکت عثمان نے اس رمز کو سمجھا آج ۴۶ء کی یہ کہانی ۹۶ء کی کہانی سے نہ الگ ہے نہ مختلف ۔ ہوس کے پیمانے احساس کے ظرف سے اسی طرح ٹکراتے چلے آئے ہیں۔

دریا بی بی کا کردار ایک حساس اور مضبوط عورت کا کردار ہے۔ زندگی کی کسمپرسی اور رسم و رواج کی بے بسی اسے کچل نہیں پاتیں۔ وہ زندہ رہنے کا سلیقہ جانتی ہے، زندگی کی حقیقتیں اس کے سامنے ننگی اور بھیانک ہو کر آتی ہیں۔ وہ تب بھی اس قرینے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ اس کے پاس دینے کو ایک جان ہے، سودے دیتی ہے۔ کسی سے اپنے لئے کچھ نہیں مانگتی۔ کچھ نہیں کہتی۔ اور جان بھی اسی اولاد کی عزت و ناموس کے لئے دیتی ہے۔ جن کی خاطر اس نے بے عزتی کا داغ اٹھایا۔ ایک نظر میں تو یہی شائستہ میزان ہے کہ اس کا انجام ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ لیکن کیا واقعی یہ میزان شائستہ ہے کہ ایک پابند، مجبور اور بے وسیلہ عورت اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی اور زمانے سے تن تنہا چومکھی لڑے؟ وہ غیرت و حمیت کے گھونٹ بھر لیتی ہے، مگر اولاد کی بے حسی اور بے دردی اسے مار ڈالتی ہے۔ اظہر خان آسودگی کی خاطر کچھ سوچے سمجھے بغیر جب چاہتا ہے، غربت و عسرت کا سارا بوجھ اس پر ڈال کر نئے جہانوں کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ اور ہر بار خالی ہاتھ پلٹ آتا ہے۔ اس کے ان فیصلوں میں دریا بی بی کہیں شریک نہیں ہے لیکن ان فیصلوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی دشواریاں اور دکھ دریا بی بی کا حصہ ہیں۔ یہ انہونی باتیں نہیں ہیں، نہ صرف کہانیاں ہیں۔ زندگی کی تصویریں ہیں جو ہمارے لئے نامانوس نہیں۔

یہ ناول ایک گہرا ناول ہے۔ بنگال کے دریاؤں کی طرح جو اپنے اندر طوفان لئے پھرتے ہیں۔ بپھرنے پر آتے ہیں تو سب کچھ تہس نہس کر ڈالتے ہیں۔ خود کو بھی اور اپنے گرد و پیش کو بھی۔ دریا بی بی کہانی بھی ایسی ہی طاقتور کہانی ہے۔

عارفہ سیدہ زہرا

۲۸۔ جون ۱۹۹۶ء

MashalBooks.org

پہلا باب

جھٹ پٹے کا وقت بھی گزر چکا تھا۔

آنگن میں بنے باورچی خانے کی چھت نہیں تھی۔ چولھے کی آگ میں بانس کے اساروں اور سرکنڈوں کا سایہ کبھی کبھی جھلک جاتا۔ ایک پکا باورچی خانہ بھی آنگن میں دکھن کی طرف تھا مگر گرمیوں میں ایک بند جھونپڑی میں کام کرنا تکلیف دہ تھا اس لئے اظہر نے دریا بی بی کے لئے ایک اور باورچی خانہ بے چھت کا آنگن میں بنا رکھا تھا۔ دریا بی بی چولھے میں آگ سلگا رہی تھی۔ ہنڈیا پک رہی تھی۔ ہوا کے ہر جھونکے سے آگ کی لو بھڑک اٹھتی تو دریا بی بی کا چہرہ نظر آجاتا ماتھا پسینے سے بھیگا ہوا۔ امجد ماں کے پاس بیٹھا اسے کھانا پکاتے دیکھ رہا تھا۔ دوسری طرف کونے میں اظہر خان، اس کا باپ بھوسے کے گٹھے گاٹ رہا تھا۔

''میں نے بچھڑے کو سب جگہ ڈھونڈھ ڈالا ابا'' امجد نے کہا۔''وہ بڑا نٹ کھٹ ہے اور اس کی ماں بھی ویسی ہی ہے۔ اپنے بچھڑے کو اس طرح کھو آئی۔'' اظہر، کٹا ہوا بھوسہ بید کی ٹوکری میں رکھتا جا رہا تھا۔ اچانک ہوا سے ٹوکری ایک طرف کو اوندھ گئی اور کٹا ہوا بھوسہ اڑنے لگا۔ اظہر چلایا۔''امو پکڑ، بیٹے پکڑ اسے، اکٹھا کر لے۔''

میاں کی مدد کو دریا بی بی بھی اٹھی۔ کوئی تیس برس کی رہی ہوگی۔ دبلی پتلی سی، اس کا چہرہ گول تھا مگر سنجیدہ۔

امجد بھوسے کے تنکوں کے پیچھے ادھر ادھر دوڑتا پھر رہا تھا۔

''دیکھو ابا، یہ تو اڑے جا رہے ہیں؟''

ہوا تنکوں کو اونچا اڑا لے گئی۔

تھکی ہوئی دریا بی بی نے میاں کی طرف دیکھا اور بولی''ایک تو جس طرح تم کام کرتے ہو۔'' اظہر نے دھیرے سے کہا''ایک دم سے تو سب کچھ ہو گیا۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔'' اس کے بال بکھر گئے تھے۔ مٹھی بھر بھوسہ پکڑے وہ بولی''امو ذرا یہاں آ بیٹے، دیکھ تو

MashalBooks.org

مری آنکھ میں کیا پڑ گیا؟'' دریا بی بی بیٹھ گئی۔ امجد ماں کے پاس لپک کر آیا۔''یہ ٹوکری میں ڈال دے۔''امجد نے فوراً ماں کا کہا مانا۔

''مری آنکھ میں کچھ پڑ گیا۔ کھٹک رہی ہے۔'' دریا بی بی نے ساڑھی کے کونے کا گولا سا بنایا اور منہ تک لے گئی۔ اسے اپنی سانس سے گرم کر کے آنکھ سینکنے لگی۔

''کچھ ٹھیک ہوا۔ ماں؟''

''ذرا دم لے بیٹا۔''

امجد بے سلی لنگی پہنے تھا۔ ماں کی دیکھا دیکھی اس نے لنگی کا کونا اپنے منہ پر رکھ لیا۔

''ہنڈیا جل رہی ہے۔''

دریا بی بی چولھے کی طرف لپکی۔''امور ذرا سا پانی تولا دے۔''

امجد سے مدد مانگنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ دریا بی بی دوسرے باورچی خانے تک خود ہی دوڑ گئی، جہاں مٹکا رکھا تھا۔

ایک پیالہ پانی ہنڈیا میں انڈیلتے ہوئے بولی''باپ بیٹے نے مل کر یہ کارنامہ کیا۔ آنکھ ابھی تک دکھ رہی ہے۔''

اظہر بھوسے کے ایک گٹھے پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ناریل کا حقہ تھا۔''دریا بی بی، چولھے میں کچھ انگارے ہیں؟'' دریا بی بی چولھے کے پاس بیٹھی اپنے بکھرے بال سمیٹ رہی تھی۔''کیوں نہیں؟ بڑھیا ایندھن جلاتے ہیں ہم تو۔ ہے نا؟''

اظہر نے دریا بی بی کو دیکھا۔ تھکن کا سایہ اسکے چہرے پر لہرا گیا تھا۔ اس کا چاؤ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اظہر نے حقہ زمین پر لڑھکا دیا۔

''جانتے تو ہو، پتے جلاتے ہیں ہم۔ سارا دن پتے اکٹھا کرنا بھی آسان نہیں۔ ابھی اسی دن ذاکر کی ماں کہہ رہی تھی''بنو، ہمارے پیڑ کے پتے مت جھاڑو۔ کیا تم نے سب بھوسہ بیچ دیا؟''

اظہر حقہ بہت پیتا تھا۔ نشہ اب ٹوٹ رہا تھا۔ مگر اب اس سے رہا نہ گیا۔ حقہ پکڑے دریا بی بی کے سامنے آن کھڑا ہوا۔''زمین کا بیعانہ اور کہاں سے دیا میں نے؟''

''مویشی پل جاتے اس پر اگر تم نے.....''

MashalBooks.org

میاں کی طرف دیکھتے ہوئے۔ دریابی بی نے ساڑھی کا پلو سر پر کھینچا اور چپکے سے اظہر کے ہاتھ سے حقہ لے لیا۔

''امو، بیٹا ایک ڈھکنا لے آ۔''

''اب ڈھکنا کس لئے؟'' دریابی بی کی آواز اب بڑی ملائم تھی۔

''ہوا پھر زور سے چلی تو چلم کی چنگاریاں آگ لگا سکتی ہیں۔''

جب وہ چلم سلگا چکی، تو اس نے احتیاط سے ڈھکن رکھ دیا۔ آنکھیں موندے، اظہر حقہ گڑگڑاتا رہا۔

''تالاب کے کنارے کچھ پیڑ ہیں، ان کو کاٹ لیں تو کیسا رہے گا؟ کچھ مہینوں تمہیں ایندھن کی فکر نہ رہے گی۔'' وہ بولا۔

''اگر تم نے کاٹ لئے تو پھر کیا کروگے؟ جب تمہیں ضرورت ہوگی تو کیا ہوگا؟ بچوں کے بیاہ کا بھی تو سوچنا ہے۔''

امجد ماں کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ بولا ''ماں، کس کا بیاہ ہو رہا ہے؟''

''تیرا'' دریابی بی مسکرائی۔ اس کے سنجیدہ چہرے پر بجلی سی کوند گئی۔ پھر اظہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ''یہ لڑکا بات نہیں کرنے دے گا۔ تیرے ابا کا بیاہ ہو رہا ہے امو۔''

اظہر خاموشی سے حقہ پیے گیا۔ کچھ بیگھے زمین اس نے آج جوتی تھی۔ دریابی بی کی بات اس نے سنی ہی نہیں۔ تمباکو کے سرور میں وہ اونگھ سا رہا تھا۔

پھر جیسے کوئی نیند سے چونکے، وہ بولا ''کس کا بیاہ ہو رہا ہے؟''

''میرا، تمہارا، سارے گاؤں کا۔'' دریابی بی ہنسی۔ اظہر نے بس ایک نظر اسے دیکھا اور پھر حقہ پینے لگ گیا۔ اظہر خان کچ دلا بودا سا آدمی تھا۔ دن بھر کی مشقت کے سوا اسے کسی چیز سے سروکار نہ تھا۔

دریابی بی نے پاس بیٹھے بیٹے سے کہا ''اپنے باپ کو تو پکارو دیکھو جاگ رہے ہیں کیا؟''

''بابا جی''

''کیا ہے؟ امو!''

MashalBooks.org

دریا بی بی نے میاں سے کہا ''کھانا بس اب پکا ہی جاتا ہے۔ تب تک لڑکے سے بات کرو''

''ماں''

''کیا ہے؟''

''گائے کے چھپرے میں جا کر دیکھوں، شاید اب بچھڑا واپس آ گیا ہو؟''

''کام کی بات یاد دلائی تم نے۔''

وہ اظہر سے بولی۔ ''جاؤ، دیکھ آؤ بچھڑا آ گیا؟''

اظہر کو اس بات کا اطمینان تھا کہ بچھڑا محفوظ ہے۔

''کل سویرے آ جائے گا وہ واپس، تم دیکھ لینا''

امجد چپکے سے بولا۔ ''ماں ان سے کہو، جا کر دیکھ آئیں۔''

''تم جا کر کیوں نہیں دیکھ لیتے؟''

''سویرے دیکھا جائے گا۔''

سفید بچھڑا امجد کا پیارا تھا اس کے سوا اور کوئی وجہ اس کی پریشانی کی نہ تھی۔ ''ماں مگر آج کل لومڑیاں؟'' امجد نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو آج کل لومڑیاں۔ خود کیوں نہیں جا کے دیکھ لیتے۔'' دریا بی بی نے بناوٹی غصے سے میاں سے کہا۔ او ر بیٹے سے پوچھنے لگی۔ ''بچھڑے، کو ڈھونڈھنے کہاں تک گیا تھا تو، امو؟''

''قبرستان تک''

دریا بی بی نے ایک برتن اٹھایا او ر دوسرے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ پچھم کی طرف ایک جھونپڑی تھی جس میں دو کمرے تھے۔ جہاں وہ رہتے بستے تھے۔ اس کی چھت پوال کی او ر دیوار بانس کی چٹائیوں کی تھیں۔ اس کے برابر ہی یہ باورچی خانہ تھا جس میں برتن باسن رکھے رہتے تھے۔

برتن باورچی خانے میں رکھ کر دریا بی بی واپس آئی۔ ''پرانے قبرستان بھی گئے تم!'' پرانے قبرستان میں شہید دفن تھے۔ نئے قبرستان میں اب نئے مردے دفن کئے جاتے

MashalBooks.org

تھے۔

''میں تم سے ہزار بار کہہ چکی ہوں وہاں مت جایا کرو۔ مگر تم سنتے کب ہو؟''

''مجھے ڈر نہیں لگا، ماں۔''

''فکر مت کرو۔ میں بڑے پیر کا پانی لاتی ہوں۔''

دریا بی بی پانی کی بوتل اور آبخورہ لے آئی۔ اظہر جس کا جی کچھ اچھا نہ تھا اونگھ رہا تھا۔اس نے توجہ نہ دی کہ ماں بیٹے کے درمیان کیا معاملہ ہو رہا ہے۔

''کیا لائی ہو، دریا بی بی؟'' اظہر بے خیالی سے بولا۔

''پڑھا ہوا پانی ہے لڑکے کے لیے۔''

اظہر تیر کی طرح ان کی طرف بڑھا۔''کیا کر رہی ہو تم؟'' کیا ہے یہ سب کچھ؟''

''کیوں کیا ہرج ہے اس میں؟''

''پڑھا ہوا پانی! ایسی بدعت ایک وہابی کے گھر میں۔ لوگ کیا کہیں گے؟''

''بیٹھ جاؤ'' دریا بی بی نے اکھڑ لہجہ میں کہا۔''اپنی بدعت رکھو اپنے پاس۔''

''اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ دریا بو۔'' اظہر نے رساں سے جواب دیا۔

''ہر بات میں جھگڑا کیوں کرتے ہو؟ بچے بیمار ہو جایا ہی کرتے ہیں۔ میں تو نہیں پی رہی''

اتنے میں آبخورے کا متبرک پانی امجد کے حلق سے نیچے اتر چکا تھا۔ خاموش طبع اظہر ذرا دیر بیزار سا کھڑا رہا۔ دریا بی بی کو کون سمجھا سکتا تھا؟ اپنا حقہ تھامے وہ پھر اپنی جگہ واپس چلا آیا۔ دریا بی بی کو لگا کہ میاں خفا ہو گیا ہے۔ ماحول کو معمول پر واپس لانا ضروری تھا۔

امجد ہچکچایا''جاؤ، ابا سے باتیں کرو'' اس نے بیٹے سے کہا۔''میں آنچ تیز کرتی ہوں۔''

اظہر چپ تھا مگر حقہ کی آواز آ رہی تھی۔ امجد جا کر کچے فرش پر باپ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ تب اظہر بولا۔''تم فرش پر بیٹھے ہو آؤ، میری گود میں بیٹھ جاؤ۔''

''میں بھی آ جاؤں کیا؟'' دریا بی بی نے پکار کر کہا۔

''آ جاؤ، اماں۔''

MashalBooks.org

''بیٹے کو گھٹنوں پر بٹھائے اظہر حقہ کے کش لیتا رہا۔

''چھوڑو بیٹے'' دریا بی بی بولی، ''میرے آنے سے کوئی فائدہ نہیں۔'' اظہر نے دریا بی بی کو دیکھا۔ وہ ہتھیلی پر سالن ڈال کر نمک مرچ چکھ رہی تھی۔ اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ لکیریں بن کر پھیلی ہوئی تھی۔

آگ بجھ گئی تھی۔ کھانا پک گیا تھا۔ اب دریا بی بی نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اس کی ہنسی سنی جا سکتی تھی۔ آنگن کے پار ایک سایہ سا لہرایا، کوئی وہاں تھا۔ تین سال کی ایک ننگی پھتنگی بچی چلی آ رہی تھی۔ بال اس کے الجھے ہوئے تھے۔ اور آنکھوں میں اتنے چیپڑ بھرے تھے کہ ہوا نہیں کھول نہیں پا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے آنگن میں نگرانی کرنے آئی ہو۔ سب سے پہلے اسے اظہر نے دیکھا۔

''یہاں آؤ، بیٹا۔ آجاؤ، کہاں تھیں تم؟''

''بھتنی آ گئی'' امجد چلایا۔

دریا بی بی نے مڑ کر دیکھا اور ہنس پڑی۔ ''بڑی اماں، جاگ گئیں آپ؟'' نعیمہ، دریا بی بی کی تین سال کی بیٹی تھی۔ وہ دریا بی بی کو شام کے وقت کام نہیں کرنے دیتی تھی۔ اس وقت دریا بی بی کو بہت کام کرنا ہوتے تھے۔ سو دریا بی بی اسے سلا آئی تھی۔

نعیمہ اظہر کے پاس نہیں گئیں، سیدھی ماں کے پاس چلی گئی۔ ''ذرا ٹھہرو، منی۔''

دریا بی بی نے چولھے سے ہنڈیا اتاری اور نعیمہ کو گود میں لے لیا۔ اس کو آنکھوں سے چیپڑ پونچھے نعیمہ بالکل نہیں بولی وہ جمائیاں لیتی رہی جیسے اس کی نیند پوری نہ ہوئی ہو۔

''کیوں، اور سوؤ گی کیا؟''

نعیمہ نے کچھ نہ کہا۔ اپنا منہ ماں کے سینے میں چھپا لیا۔

''ذرا ٹھہرو بھی۔ تمہارے ابا کو کھانا دیدوں اموبھی کھائے گا اور تم بھی۔''

کھانے کا نام سن کر نعیمہ ماں کی گود میں مچلنے لگی۔

اظہر کی طرف مخاطب ہو کر دریا بی بی بولی ''تم عشاء کی نماز پڑھ لو، اور دیر کرنے سے کیا فائدہ یہ تو ابھی تک نیند میں ہے۔''

بھوسے کے گھٹے پر بیٹھا امو جھوم رہا تھا۔ ایک دنیا کی نیند اس کی آنکھوں میں بھر گئی

MashalBooks.org

تھی۔

دریابی بی بدھنے میں پانی لے آئی۔ ''سنو'' وہ بولی، ''ادھر دکھن کی طرف میں نے کدو کے بیج بوئے ہیں کلے پھوٹ گئے ہیں۔ میں انہیں روز پانی دیتی ہوں۔ جاؤ وضو ادھر ہی کرلو۔ وضو کا پانی ان پر پڑ لینے دو۔ مالک کے پیروں کا دھوون۔''

ایک حرف کہے بغیر، اظہر دکھن کی طرف وضو کرنے چلا گیا۔ دریابی بی کے ایسے مذاق اسے اچھے نہیں لگتے تھے۔

کھانا تو پک گیا تھا۔ دریابی بی نے چولھے کا منہ ایک برتن سے ڈھک دیا۔ تاکہ ہوا سے جلتے پتے ادھر ادھر نہ اڑیں۔ آج رات کے لیے اس کا کام نبڑ گیا تھا۔ وہ ایک اور برتن میں پانی لے کر آئی اور نیند میں دھت امجد کے منہ پر چھینٹے مارے۔

''اٹھو بھی، سب کھانا کھا رہے ہیں۔ آج شام تو تم نے بالکل نہیں پڑھا۔''

نعیمہ ابھی تک بڑبڑا رہی تھی۔

اظہر خان نماز پڑھ چکا تھا۔ اور پھٹا پرانا مصلیٰ لپیٹ رہا تھا۔

دریابی بی کہنے لگی۔ ''ایک نیا مصلیٰ نہ خریدنا۔ اللہ سے ہر بات میں بے ایمانی۔''

''ہاٹ میں ڈیڑھ روپیہ مانگ رہے تھے ایک مصلے کا۔''

بات یہاں ختم ہو جانا چاہئے تھی۔ مگر دریابی بی بات نہیں چھوڑ رہی تھی۔

''پھٹی چٹائی۔ ماتھا زمین پر لگتا رہے جب لوگ کٹا پڑا دیکھیں گے تو کہیں گے کیسا نیک پرہیز گار آدمی ہے۔''

پھٹی چٹائی لپیٹنے کے بعد اظہر نے منہ کھولا۔ ''اظہر خان اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کو نماز نہیں پڑھتا۔'' اس نے جیسے اعلان کیا۔ ''مرے پردادا علی اسجد خان کو ہر کوئی جانتا ہے۔ میں اس خاندان سے ہوں۔''

''میرے پردادا ایک بہت پڑھے لکھے مولوی تھے۔ تو کیا مجھے بھی لکھنا پڑھنا سیکھنا پڑے گا؟'' دریابی بی طنز سے بولی۔

اظہر خان کو اپنے خاندان کی توہین گوارا نہ تھی۔ عام طور پر وہ خود کو قابو میں نہیں رکھتا تھا۔ لیکن آج وہ صبر کر گیا۔

MashalBooks.org

''اس مصلےٰ پر تو تم بھی نماز پڑھتی ہو۔ اظہر نے کہا۔''تو کیا اپنے خیال میں تم بھی نیک اور پرہیز گار ہو۔''

''ہماری جنت تو تمہارے پیروں تلے ہے۔ اگر تم اس کو استعمال کر سکتے ہو تو مرے لیے کیسے غلط ہوگا۔''

ایک لمحے کو اظہر خان سے غصہ برداشت نہ ہوا۔

''پھر کچھ اور مت مانگنا ایک چٹائی ہی تو ہے۔ اب میں ضرور لے کر آؤنگا۔ چاہے کسی بھاؤ بھی ملے۔''

''اتنے خفا مت ہو۔ اس مصلےٰ پر ماتھا گھس گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک نیا خریدنے کی توفیق نہیں دی۔''

اظہر چپ رہا۔ دریا بی بی کی بات نے اس کے سینے میں ہلچل مچا دی تھی۔ وہ بہت گستاخ ہوتی جا رہی ہے۔ وہ غصہ میں بھرا کھڑا رہا پھر اس نے تین بار لاحول پڑھی۔

''بچوں کا ذرا دھیان رکھنا میں تالاب تک جا رہی ہوں۔''

سارے دن کے بعد یہ گھڑی چین کی اسے نصیب ہوئی تھی۔ شام کی ہوا سرسرا رہی تھی اور اپنے ساتھ کہیں دور کھلے پھولوں کی خوشبو بھی لے آئی تھی۔

وہ جلدی واپس آ گئی اظہر دالان میں بچوں کے پاس بیٹھا تھا۔ بولا'' بڑی جلدی آ گئیں تم تو۔''

لگتا ہے بکری بیاہنے والی ہے'' جاؤ جا کر اسے یہاں لے آؤ۔''

''نہیں وہ ابھی نہیں بیاہے گی۔''

''گھڑی گھڑی تو وہ ممیا رہی ہے، اگر کہیں رات کو بچہ دے دیا، تو وہ بچھڑا ایسا بد ذات ہے لات مار کر مار ڈالے گا۔''

تالاب ایک اجڑے گھر سے ذرا پرے تھا۔ تالاب کے اتر کی طرف گائے کا باڑا تھا۔ جہاں گائے بکریاں بندھتی تھیں۔ تالاب کے چاروں طرف لمبی گھاس میں سانپوں کی بن آئی تھی اس لئے اظہر کا جی جانے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ اور کہے بغیر دریا بی بی باورچی خانے میں چلی گئی۔ وہ پیالے میں سالن نکال رہی تھی لیکن اس کے کان بکری کے ممیانے پر

MashalBooks.org

لگے ہوئے تھے۔

نعیمہ اپنے ہاتھ سے نہیں کھا پاتی تھی۔ سو جب سب کھانا کھا چکے، تو دریا بی بی نے اسے اپنی گود میں لے لیا۔ اونگھتی نعیمہ ماں کے ہاتھ سے خاموشی سے کھاتی رہی۔

دریا بی بی کے کان ابھی بکری کی آواز پر لگے تھے۔ یہ بے وقوف جانور اس غریب خاندان کے لیے ایک سرمایہ تھے۔ پچھلے سال بھی باڑے میں دو میمنوں کو گایوں نے مار ڈالا تھا۔ اب پھر تو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر وہ دونوں اب ہوتے تو اچھے داموں بک جاتے۔ کچھ پیسے ہاتھ آجاتے۔ ابھی اگلے ہی دن بیوپاری انہیں پوچھ رہے تھے۔

کھانے دانے سے فارغ ہو کر بھی چین کی ضمانت نہ تھی۔ بادل گھرے ہوئے تھے۔ اگر رات میں مینہ برس گیا۔ تو آنگن میں رکھے اپلے گیلے ہو جائیں گے اور صبح چولھے میں آگ کیسے سلگے گی؟ سوکھی پتیوں پر عورتیں لڑ لڑ کر مری جاتی تھیں۔ دریا بی بی ٹوکری میں اپلے جمع کرنے کو دوڑی۔ وہ نہا دھو چکی تھی۔ اب اسے پھر اپلے چھونا پڑیں گے۔ وہ آسانی سے تھکنے والی نہ تھی۔ لیکن آج اس کا برا حال تھا۔

امجد ماں کے پاس نہیں سوتا تھا۔ وہ دوسری جگہ ہوتا تھا۔ اظہر خان کی دور پار کی ایک چچی تھی عاشق جان۔ اسے نہ ٹھیک سے دکھائی دیتا تھا اور نہ ڈھنگ سے سنائی دیتا تھا۔ وہ اس گھر میں اس لئے رہتی تھی کہ اس کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ گاؤں کے کھاتے پیتے مسلمانوں کی زکوٰۃ خیرات اور عید، محرم اور دوسرے تہواروں کے صدقے خیرات پر اس کی گزراں تھی۔ وہ اندھیرا ہونے سے پہلے اپنی کوٹھڑی میں چلی جاتی تھی اور پھر کہیں جانے کو نہ نکلتی۔ وہ کھانا بھی گھر میں کھاتی تھی۔ امجد اس کے پاس گھس کر سوتا تھا۔ عاشق جان یوں تو آہٹ سے بھی جاگ جاتی لیکن اپنی کمزور نظر کی وجہ سے لڑکے کا دھیان نہیں رکھ پاتی تھی۔ دریا بی بی رات گئے اٹھی اور اندر والے دروازے سے کوٹھڑی میں آئی تا کہ امجد کو دیکھ سکے۔ امجد بے سدھ سوتا تھا۔ اور اکثر کروٹ لینے میں فرش پر سوتا ملتا۔ ہاتھ میں چراغ پکڑے دریا بی بی نے اسے دیکھا لیکن وہ بھلے مانس بچے کی طرح سو رہا تھا۔ پیروں کی چاپ سے عاشق جان کی آنکھ کھل گئی۔

''اظہر ہو کیا؟''

MashalBooks.org

''نہیں، دریا ہوں خالہ۔''

''کیا بات ہے، دریا بو؟''

''ایسے ہی آئی تھی''

''سارا دن جتی رہتی ہو۔ جاؤ جا کر اب سو رہو۔''

''اچھا''

''دریا بو'' عاشق جان پھر بولی،''اب تم آ ہی گئی ہو تو ایک گھونٹ پانی دے دو مجھے۔ میں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے بچ جاؤں گی۔''

دریا بی بی نے گھڑے سے پانی انڈیلا۔

''دریا بو، صبح میں ساتھ کے گاؤں جاؤں گی۔ شاید کوئی کپڑے کا ایک ٹکڑا دے دے۔ پچھلی عید پر مسلمان منشی نے مجھے دے دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس پر اپنا کرم کرے۔''

دریا بی بی اس وقت شاید برس پڑتی۔ اب اتنی رات گئے انہیں باتیں سوجھ رہی تھیں لیکن وہ خاموش رہی۔ دریا بی بی کے جاتے ہی کمرہ پھر اندھیرے میں ڈوب گیا۔ بہرے پن کے مارے، عاشق جان اپنی آواز کا اندازہ نہیں کر پاتی تھی۔ چلا کر بولی۔''جانے کمبخت زمانے کو کیا ہو گیا ہے؟ لوگوں کے پاس اتنا بھی نہیں کہ ایک غریب کو معمولی کپڑے کا ایک ٹکڑا ہی خیرات کر دیں۔ دنیا کا آخری وقت آ گیا ہے۔ کانے دجال کے آنے میں اب زیادہ دیر نہیں۔ چودھویں صدی ہے۔ قرآنِ مجید تو غلط نہیں ہو سکتا نا؟''

ذرا دیر بعد عاشق جان کو احساس ہوا کہ کمرے میں کوئی نہیں ہے تو وہ چپ ہو گئی۔ پھر اپنے سفید بالوں میں جوئیں ٹٹولتے ہوئے اس نے ایک آہ بھری۔

دریا بی بی کے لئے لیٹنا دوبھر ہو گیا۔ بکری اگر اس وقت بیاہی تو وہ اکیلی اس کام سے نہیں نمٹ پائے گی۔ اسے اظہر کو جگانا پڑے گا۔

''سنو بکری تکلیف میں ہے''

دریا بی بی نے میاں کی بات کی تعمیل کی۔ اظہر اٹھ کر بیٹھ گیا۔''میں جا کر دیکھتا ہوں۔ چراغ جلاؤ۔'' اظہر نے دروازہ کھولا اور دیکھا کہ بادل گھر گھر آ رہے ہیں اور ہوا تیز ہو گئی ہے۔

MashalBooks.org

طوفان کسی گھڑی آ سکتا تھا۔ تالاب کنارے لگے پیڑ لگتا تھا ٹوٹ کر گر پڑیں گے۔ یوں لگتا تھا جیسے جنگل ایک وحشی ناچ ناچ رہا ہو۔ اور دیوانوں کی سی ہنسی ہنستا ہو۔

چاروں طرف کراہنے کی سی آواز گونج رہی تھی۔

چراغ ہاتھ میں لئے ،دریا بی بی احتیاط سے آگے چلتی رہی۔ ''گائے کا باڑا گھر کے پاس تو بنا لوں'' اظہر بولا ''لیکن جگہ کہاں سے آئے گی۔ یہ تو رائے صاحبوں کی عنایت ہے کہ تالاب کنارے باڑا بنانے کی اجازت دے دی۔''

دریا بی بی کو چراغ کی فکر تھی۔ اس نے اظہر کی بات نہیں سنی۔ ککروندوں کی گھنی جھاڑی کنارے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اظہر نے ایک چھڑی سے اسے راستے سے ہٹایا۔ انہیں بڑی احتیاط سے پاؤں اٹھانا تھے۔ پگڈنڈی کانٹے دار ٹہنیوں سے بھری پڑی تھی۔ باڑے کے سامنے پہنچ کر انہوں نے سکھ کا سانس لیا۔ بکری کا کراہنا اب سنائی نہیں دے رہا تھا۔

جیسے ہی انہوں نے باڑے کا دروازہ کھولا۔ سامنے جھاڑیوں میں سے ایک سفید بچھڑا دوڑ کر نکل آیا۔

''دن ڈھلے کہاں تھا تو، کم بختی مارے؟''

اظہر کے پاس کھڑا بچھڑا دم ہلائے، جا رہا تھا۔ جیسے انسانوں کی جھاڑ ان کے لاڈ کا پیش خیمہ ہو۔

دریا بی بی نے اس کے گلے میں رسی ڈالی ورنہ اپنی ماں کا سارا دودھ پی جائے گا۔

پہلے گایوں کا تھان تھا، بکریوں کا تھان دوسرے کونے میں تھا۔ جہاں اندھیرا زیادہ تھا۔

باڑے میں ہوا کا زور قدرے کم تھا۔ اس کے چاروں طرف ککروندے کی گھنی جھاڑیاں تھیں جو ہوا کے خلاف قلعہ کا کام دیتی تھیں۔

چراغ پکڑے دریا بی بی بکریوں کے تھان تک گئی او رخوشی سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ بے بس بکری دو کالے میمنوں کو چاٹ رہی تھی۔

نال ابھی باہر نہیں آیا تھا۔ دریا بی بی بولی، میں نکالتی ہوں اگر کہیں کہ اسے نگل گئی تو میمنوں کو دودھ پلانے کو پیسے کہاں سے آئیں گے اور یہ کیسے بچ پائیں گے؟''

MashalBooks.org

وقت ضائع کیے بغیر دریا بی بی نے خاموشی سے دائی کا کام کیا۔

''اب چلنا چاہیے، ہوا اور تیز ہو جائے گی۔تم بکری کو لے چلو، میں بچے اور چراغ کو لے لیتی ہوں۔''

اظہر ہچکچایا۔اسے اس بکری کو چھونا اچھا نہیں لگ رہا تھا جو ابھی زچگی سے فارغ ہوئی تھی۔

''اچھا تو تم بابو بننا چاہتے ہو؟''

''اسے رات تو یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔میمنوں کو لے چلتے ہیں۔''

دریا بی بی کی آواز گونجی''تم یہ بچے لے لو، میں بکری لے چلتی ہوں۔''

دریا بی بی کی کاٹھ اچھی تھی۔اس نے آسانی سے بکری اٹھالی۔خوشی نے اس میں اور چستی بھر دی تھی۔

ذرا دیر بعد چراغ کا مسئلہ شروع ہوا۔اظہر میمنے کو سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ چراغ کو بھی برتن کے اندر دھیان سے لے کر چلنا تھا۔اگر ہاتھ ذرا بھی کانپ جاتا تو ہوا سے چراغ بجھ جاتا۔

ککروندے کی جنگلی جھاڑی پار کرتے ہی ہوا کے جھونکے نے چراغ بجھا ڈالا۔دریا بی بی طیش میں آ گئی۔''تمہارا یہ کام نہیں ہے؟ ہے نا؟ مجھے میمنے دے دیئے ہوتے۔''اظہر نے جواب نہ دیا۔دونوں اندھیرے میں کسی نہ کسی طرح چلتے گئے۔

گاؤں پر کالے بادل ٹوٹ پڑے تھے۔بارش مصیبت کو کم نہیں کرتی۔گھپ اندھیرے میں دریا بی بی نے کئی دفعہ اللہ تعالیٰ کو پکارا۔نعیمہ اس کوٹھڑی میں اکیلی سو رہی تھی۔ جس کی دیواروں کے بانس گل چکے تھے۔دریا بی بی کو سارا غصہ اظہر پر تھا۔رنج کے مارے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ایسے آدمی کے ساتھ جینا بدا تھا۔

''اب بہت دور نہیں، دریا بو'' اظہر نے کہا۔

بجلی کے کوندنے میں پگڈنڈی نظر پڑ گئی تھی۔وہ تالاب کے آخر تک آن پہنچے تھے۔ بارش اب ٹوٹ کر برسنے لگی۔اظہر مانوس راستے پر دوڑتا چلا گیا۔دریا بی بی بکری کا بوجھ اٹھائے، بارش اور طوفان میں سنبھل سنبھل کر چلتی رہی۔

MashalBooks.org

دالان تک پہنچ کر، دریا بی بی نے دیکھا کہ کمرے کا دروازہ ہوا کے زور سے کھل گیا ہے اور نعیمہ گلا پھاڑ کر چلا رہی ہے۔ عاشق جان الگ چیخ رہی تھی۔ گو اس کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

بکری کو فرش پر اتار کر، دریا بی بی خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ اس وقت اسے کچھ خیال نہ تھا کہ وہ کہاں بیٹھ رہی ہے۔ تھکن کے مارے اس کا برا حال تھا۔

اظہر نے چراغ جلا لیا اور ایک چٹائی پر بیٹھ گیا۔ تیل کے چکتے پڑتے تکیے کے سوراخ میں سے میلی کچیلی روئی نکل آئی تھی۔ اظہر لیٹ گیا۔

تھکی ماندی دریا بی بی ترس بھری آنکھوں سے اپنے میاں کو دیکھتی رہی۔

MashalBooks.org

دوسرا باب

رات کو مینہ برسا تھا صبح کو اظہر ہل کندھے پر رکھ کر کھیت کو چلا گیا۔ کھیت میل بھر دور تھا۔ وہ دوپہر کو کھانا کھانے تو آ سکتا تھا لیکن پھر واپس جا کر کھیت میں کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔اس لئے امجد اس کا کھانا لے کر آ جاتا۔ دریا بی بی کو یہ اچھا نہیں لگتا تھا۔اس کے لئے امجد کو اسکول چھوڑنا پڑتا تھا اور اس کی تعلیم کا ہرج ہوتا تھا۔لیکن کوئی اور حل بھی نہ تھا۔ دریا بی بی گھر کا سارا کام کاج کرتی تھی۔ اسے برا نہ سمجھا جاتا تھا۔لیکن پردہ کرنے والی بیبیاں کھیتوں میں جائیں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ویسے امجد کو اس میں مزہ آتا تھا۔مکتب میں گھنٹوں فرش پر بیٹھے رہنا جو کھم کی بات تھی۔ اس کا سر دکھنے لگتا۔ جمائیاں لے لے کر جبڑے دکھنے لگتے، لیکن مولوی صاحب پھر بھی چھٹی نہ دیتے۔ لیکن یوں وہ کھیتوں میں مزے سے پھر سکتا تھا۔ اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔

امجد کھانا لے کر ٹھیک وقت پر نہ پہنچ پاتا تھا۔ دریا بی بی تو جلدی پکا ریندھ لیتی تھی۔ پھر امجد خود کھانا کھاتا اور تھوڑا بہت سستاتا بھی۔ اتنے میں دوپہر ڈھلنے لگتی۔

اظہر کو اس بات پر غصہ آتا، اس دن مسکرا کر اس نے پوچھا ''دیر کیوں ہو گئی، بیٹا؟''

''کھانا دیر میں پکا، اور پھر میں بہت تیز نہیں چل سکتا''

بچے کے منہ سے پسینہ پونچھتے ہوئے اظہر بولا ''کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی مجھے پیاس لگی ہے۔ جاؤ ندی سے پانی تو بھر لاؤ۔''

امجد نے باپ کی بات کی تعمیل کی۔ وہ اپنے باپ سے کچھ کم تھکا ہوا نہیں تھا۔ دوپہر کی جلتی دھوپ میں چل کر وہ اور بھی تھک گیا تھا۔مگر وہ ساری تھکن مکتب کے بندی خانے سے آزاد ہو کر بھول گیا تھا۔

MashalBooks.org

بیل کے پیڑ کے سائے میں اظہر کھانا کھانے بیٹھا۔

پانچ سال پہلے بیل کے پودے سیلاب کے ریلے میں بہتے چلے آئے تھے۔ اظہر نے اپنے ہاتھوں سے انہیں لگایا تھا۔ اب دوسرے تھکے ماندے کسان بھی ان گھنے کیلوں کے سائے میں ستانے کو آجاتے۔ کھیت کے دوسرے کنارے جنگلی کیلوں کے تھے۔ اچھی ذات کے کیلے کوئی بھی کھیت کنارے نہ لگا تا تھا۔ راتوں کو ان کا پھل چوری ہو جاتا اور کچھ ہاتھ نہ آتا۔ کچھ سال پہلے اظہر دوپہر کا کھانا کیلوں کی چھاؤں میں کھایا کرتا تھا۔ کچھ کسان اپنے کھیتوں میں ہی رہنے لگے تھے۔ یہ زیادہ تر باگڑی اور تیورا اچھوت تھے۔

اظہر خود چاہتا تھا کہ کھیت کے پاس ہی رہنے لگے۔ ایک تو فصل پر نظر رہتی تھی اور دوسرے کام کرنے کی آسانی تھی جب جی چاہا اٹھ کر آ گئے۔ لیکن دریا بی بی اس کے لئے راضی نہ تھی۔ ایک تو ایسے کھلے میں عزت داری قائم رکھنا مشکل تھا۔ دوسرے یہاں کوئی تالاب نہیں تھا۔ دریا کا سب سے قریب کا کنارا اونچا تھا اور گرمیوں میں پانی ادھر نہیں رہتا تھا۔ پرہیز گار مسلمان گھرانے کی عورت پردہ نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اچھوتوں کو ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ننگ دھڑنگ بچے دوپہر کو اپنی ماں کی انگلی سے لگے دریا پر نہانے جایا کرتے۔ جو کہیں سیلاب آجاتا، تو آفت ٹوٹ پڑتی۔ چاہئے کتنے ہی اونچے ٹیکرے پر گھر کیوں نہ بنایا ہوتا جینا عذاب ہو جاتا۔ چند سال پہلے ہی راشک باگڑی کے دولڑکے سیلاب میں بہہ گئے، اور ان کا کہیں پتہ نہ چلا۔ جب بھی کبھی کھیت میں گھر بنانے کی بات ہوتی دریا بی بی یہ کہانی اور بھی نمک مرچ لگا کر دہراتی، حتیٰ کہ اظہر کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا۔

باپ کے سامنے پانی کا بدھنا رکھتے ہوئے امجد بولا ''بدھنا گرم ہو گیا تھا۔ کل سے اپنے ساتھ صبح کو لے آیا کیجئے اور کہیں سائے میں رکھ دیا کیجئے۔

اظہر چاولوں کا بڑا سا نوالہ چباتے ہوئے بولا'' کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بھوک سے مرادم نکلا جا رہا ہے۔''

بھوسے کے گھٹے پر بیٹھا امجد باپ کو کھاتے دیکھتا رہا۔ کھانا کچھ اچھا نہ تھا۔ ذرا سی دال اور؟.....''

امجد نے چاروں طرف کے کھیتوں کو دیکھا جو دھوپ میں جل رہے تھے۔ دریا کے

MashalBooks.org

دونوں کناروں پر اگی موسمی فصل بھوسلی سی تھی۔ لو کے بگولے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں مٹی اڑاتے پھر رہے تھے۔

اس سال اظہر نے صرف حلوہ کدو لگایا تھا۔ دھوپ میں ان کی بیلیں ایک دوسرے میں الجھی، سانپوں کی طرح لگتی تھیں۔ ایک کدو، مٹی کے تودے پر ٹکا، پکنے والا تھا۔ کڑکتی دھوپ میں اس کا پیلا رنگ ملگجا لگ رہا تھا۔ امجد کی نظر بار بار ادھر ہی جاتی تھی۔

''ابا''

اظہر خان نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا۔ دھوپ سے مرجھایا ہوا۔ اس کی داڑھی کالی تھی۔ منہ کے ایک کونے پر چاولوں کے کچھ دانے لگے ہوئے تھے۔ باپ کی ایسی شکل دیکھ کر امجد کا جی چاہا کہ ہنس دے۔

''وہ کدو پک گیا ہے، ابا''

''نہیں ابھی پوری طرح نہیں۔''

'' آپ تو کہتے ہیں کہ اگر گھر میں انہیں کوٹھڑی میں رکھ دیں تو بھی پک جاتے ہیں۔

''ہاں کیوں نہیں۔'' اظہر ایک اور نوالہ چاول کھاتے ہوئے بولا۔'' تم اسے گھر لے جانا چاہتے ہو۔''

''جی'' امجد نے ایسے جھینپ کر کہا، جیسے اس سے کوئی غلطی ہوگئی ہو۔

''نہیں بیٹا، مجھے اگلے ہفتے سوکدہ منڈی پہنچانا ہے میں نے پیشگی لے رکھی ہے۔''

اظہر نے بیٹے کے منہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کی چمک بجھ گئی تھی۔

رکابی میں کچھ چاول بچ گئے تھے۔ اظہر کا جی اداس ہو گیا۔ اپنے کھیت سے سو کدو اکٹھا کرنا شک والی بات تھی۔ شاید اسے دوسرے کسانوں سے کچھ خریدنا پڑیں۔ بچوں کی معمولی خواہش پوری کرنا بھی اس کے بس سے باہر تھا۔ تھوک کا ایک بیو پاری پچھلے ہفتہ آیا تھا، اظہر نے اس سے کچھ پیشگی لے لی تھی۔ قول سے پھر جانا اسے اچھا نہ لگتا تھا۔ کبھی ایسے بھی ہوتا کہ کدو پڑے پڑے گل سڑ جاتے اور تھوک کے بیو پاری انہیں چھوتے تک نہیں۔

اظہر کو بیٹے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ سر نیچا کیے ہی اس نے بیٹے

MashalBooks.org

سے کہا ''وہ ادھر کھیت میں تربوز ہیں۔ لوگے تم ایک؟''

امجد نے مسکرا کر اظہر کی طرف دیکھا۔ تربوز کا نام سن کر اس کا چہرہ خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔

''بیٹا، تم یہاں ٹھہرو، میں دریا پر ہاتھ منہ دھو کر آتا ہوں۔''

اظہر دریا کے کنارے کی طرف اوجھل ہو گیا۔ کہیں ہلکی ہوا چل رہی تھی، جو سخت گرمی کو گوارا بنا رہی تھی۔ مویشی میدانوں میں چر رہے تھے۔ اور کچھ بچے ایک جھونپڑی کے پاس پاکھر کے پیڑ تلے کھیل رہے تھے۔ ان کے شور کی آواز امجد کے کانوں تک آ پہنچی۔ اس نے گردن موڑی تو اسے سیٹی کی آواز سنائی دی۔ یہ بڑی عجیب سی سیٹی تھی۔ شاید کوئی ایسی چڑیا بول رہی تھی، جسے امجد نہیں پہچانتا تھا۔ امجد نے چاروں طرف دیکھا۔ سیٹی کی آواز بند ہو گئی۔

''کس کے لڑکے ہو تم؟''

امجد چونک پڑا۔ کیلوں کے جھنڈ کے پیچھے سے ایک آدمی نکلا۔ اس کے لمبے بال الجھے ہوئے تھے اور بالکل کالا بھجنگ تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھرپا اور درانتی تھی۔ سیٹی کی آواز پھر آنا شروع ہوئی۔ اچھا تو یہ آدمی سیٹی بجا رہا تھا۔ آدمی کی آنکھیں بڑی بڑی اور گہری کالی تھیں۔ وہ خود چوڑا چکلا تھا۔ امجد کو کچھ کچھ ڈر لگنے لگا۔

اس کی طرف دیکھتے ہوئے آدمی بولا ''کس کے بیٹے ہو تم، تربوز تاڑ رہے ہو کیا؟''

امجد ڈر کے مارے دبک کر رہ گیا۔ اظہر کہیں نظر نہ آ رہا تھا۔ کہاں رہ گیا وہ؟''

''تربوز چرانے آئے ہو تم؟''

''نہیں، میں تو کھانا لے کر آیا تھا۔''

آدمی بے وجہ ہی ہنسا، پھر سیٹی بجا کر گانے لگا۔ سرسوں کے کھیت پیچھے چاند اڑا جائے، نین تیرے موہنی۔''

گانے والے کے لمبے بال ہوا میں اڑتے رہے۔ دو چار سیٹیوں کے بعد گانا بند ہو گیا۔

''کھانا لائے تھے، تم؟''

امجد کھسیا کر بولا ''ابا نے سب کھا لیا۔''

MashalBooks.org

سر ذرا نیوڑھا کر وہ شرارت سے مسکرایا۔ پاگل ہے شاید، امجد نے حیران ہو کر سوچا۔

اپنا بایاں ہاتھ کولھے پر رکھے وہ ٹھٹک کر کھڑا رہا۔ دوسرا ہاتھ منہ پر رکھ کر وہ چلایا ''اے کون ہے تربوزوں میں؟''

امجد نے دریا کی طرف والے کھیتوں کی طرف دیکھا۔ وہ بچے ابھی تک کھیل رہے تھے۔ دور دور تک کسی او رجان دار کا نام نشان نہ تھا۔ سوائے ان گایوں کے جو جگالی کر رہی تھیں یا سر چھپانے کو سایہ ڈھونڈھ رہی تھیں۔ آدمی پھر بھی چلاتا رہا۔ شاید اپنے گیت کی ان دیکھی بے پروا موہنی پر۔

پھر وہ اطمینان سے امجد کے پاس سائے میں بیٹھ گیا۔ اس کی سانس سے تاڑی کی بو آ رہی تھی۔ امجد زرا پرے کھسک گیا۔

''واہ بھئی واہ سارے چاول کھا ڈالے تم نے او راپنے چچا کے لئے کچھ بھی .....'' اس نے اپنا انگوٹھا ٹھینگے کی طرح دکھایا۔

اظہر دریا کے کنارے آتا دکھائی دیا۔ وہ نہا دھو چکا تھا۔ اس آدمی کو جیسے نئی چستی مل گئی۔ اس نے اب اور زور زور سے گانا شروع کر دیا۔

کدو کے کھیت کے پرے اظہر کو دیکھ کر وہ چلایا، ''او رخان بھائی۔'' اظہر نے کہا ''کون؟ چندر۔''

یہ آدمی موہیش ڈنگا کا چندر کوتل تھا۔ جو یہاں کھیتوں میں ہی رہتا تھا۔ اس کی ایک سوانگ منڈلی تھی۔ جو پوجا او ردوسرے تہواروں پر دور دور کے گاؤں میں تماشا کرنے کو بلائی جاتی تھی۔ گاؤں والوں سے اس کا کوئی ناتا تعلق نہیں تھا۔ چند سال پہلے رشتہ داروں سے جھگڑے کے بعد اس نے گاؤں چھوڑ دیا تھا۔ پڑوسی کا نام بھی اس سے برداشت نہ ہوتا تھا۔ لیکن کھیت میں اس کی سب سے اچھی راہ رسم تھی۔ اس نے اور اس کی بیوی ایلوکشی نے بہت سختیاں جھیلی تھیں۔ پانچ سال پہلے اس کی دونوں بیٹیاں چیچک سے مر گئی تھیں۔ چندر کوتل، ایک دن رات مست رہنے والا آدمی تھا۔ ان کی جھونپڑی کے پاس تاڑ کے کچھ پیڑ تھے، جو اظہر کے گھر سے نظر آتے تھے۔ سارا سال چڑھنے کو بانس او رتاڑی جمع کرنے کو بانڈیاں ان

MashalBooks.org

پیڑوں کے ساتھ لگی رہتیں۔لیکن چندر کی بہار گرمیوں میں آتی۔

''ارے خان؛ جلدی کر'' پھر وہ امجد کی طرف مڑکر پوچھنے لگا''یہ داڑھی والا بڈھا کون ہے؟''

''میرے ابا''

''تمہیں کیسے پتہ؟'' چندر انگلیوں سے اپنی مونچھیں درست کرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

''وہ میرے ابا ہیں اور مجھے ہی پتہ نہیں ہوگا؟''

ان کی بات چیت اظہر کے کانوں میں پڑی، پاس آکے وہ بولا،تم نے پھر اس حرام چیز سے پیٹ بھرلیا! اس لئے یوں مست گاتے پھرتے ہو؟ نعوذ باللہ۔''

''چلو خان بھائی،تم پھر شروع ہو گئے مجھے برا بھلا کہنے۔''

چندر اظہر خان کی دیانت کی بہت عزت کرتا تھا۔اور پھر خان برادری کو سارا گاؤں جانتا تھا۔ چندر اس بات کا بھی مان کرتا تھا۔

''مچھلی پکڑنے کا کہاں حال ہے؟''

چندر کے گھر کے سامنے دو ندیوں کا سنگم تھا۔ پانی یہاں پورا سال کھڑا رہتا۔ برسات میں چندر کو کھیتی باڑی کی پرواہ نہ ہوتی۔وہ مچھلیاں پکڑکر کافی کما لیتا۔اور ندیوں کے سنگم میں وہ بانسوں کا جال بچھائے رکھتا۔

''نہیں بھیا، وقت کچھ اچھا نہیں۔لاؤ تمبا کو ہی پلا دو۔''

اظہر خاں نے رکابی اور بدھنا رکھا اور اپنا ناریل اٹھایا جسے وہ پیڑ سے ٹکا کر گیا تھا۔

''میں حقہ تیار کرتا ہوں۔تم بچے کو ایک تربوز دے دو۔اس دفعہ میری زمین میں فصل اچھی نہیں۔''

پیار سے امجد کی ٹھوڑی پکڑ کر چندر بولا''بیٹے یہ بات پہلے کیوں نہ کہی؟''

چندر اٹھ کھڑا ہوا۔ دو چار بیگھے زمین پار کر کے اس نے پھر سیٹی بجانا شروع کر دی۔

''میں اپنا گھر بار کھیتی باڑی بیچ ڈالوں کیسری پلو کی ساڑھی کے لئے انجیر کے پیڑ

MashalBooks.org

تلے، کون، جائے مجھے چاہتا نہیں.....''

''باولا چندر'' اظہر خان نے امجد سے کہا وہ باپ کی بات سن کر ہنس دیا وہ کہہ رہا تھا امجد بولا تم نے بھی چاول کھا لئے مرے لیئے کچھ نہ بچایا ''تم نے کیا کہا''

''کچھ بھی نہیں میں ڈر گیا تھا''

''ارے اس باولے چندر سے ڈرنے کی کیا بات ہے'' اظہر خان بھی ہنسا چندر سیٹی بجاتا آیا اور دو بڑے تربوز لا کر دھر دئے۔ امجد کی آنکھیں مارے خوشی کے چمک اٹھیں۔

''اب اتنے بڑے بڑے دو لانے کی کیا ضرورت تھی'' اظہر نے کہا۔

''پھر کیا ہوا۔''

کیا تم انھیں منڈی میں نہیں لے جاؤ گے؟''

''نہیں میں اس دفعہ منڈی نہیں جاؤں گا۔''

ایک تربوز کا ہی رنگ کا تھا اور دوسرا سفید تھا جس پر گہری دھاریاں تھیں چیتے کی طرح کی۔ چندر نے تربوز انگلی سے ٹھونک کر دیکھے کہ پک گئے ہیں۔

''یہ ہرا والا تیار ہے''

وہ درانتی سے تربوز کاٹنے ہی کو تھا کہ چندر رک گیا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟ بیٹا''

''امجد''

''اتاولے مت ہو۔ ذرا ٹھہرو''

''کیا بات ہے چندر؟''

یہ دھوپ سے تپے ہوئے ہیں بچہ بیمار ہو جائے گا۔''

''تو تم کیا کرنے کی سوچ رہے ہو؟''

''بس ذرا دیر کو پانی تلے ریت میں دبا دیا جائے ان کو ٹھنڈے یخ ہو جائیں گے''

اظہر نے پھر کچھ نہ کہا۔ چندر تربوز اٹھائے دریا کی طرف چلا گیا۔

اظہر نے بیٹے کو دیکھا۔

''دیکھا، باوَلا ہے نا۔''

MashalBooks.org

اب امجد باپ کی ہاں میں ہاں نہ ملا سکا۔ اس نے دریا کی طرف دیکھا اسے چندر بہت اچھا لگنے لگا تھا۔

بیل کے پیڑ پر دو سال سے پھل نہیں آیا تھا۔

''دو چار پھل بھی تو نہیں ہیں پیڑ پر'' اظہر نے بد دل ہو کر کہا۔

امجد نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چندر کا انتظار کر رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے وقت تھم گیا ہو۔ سہ پہر ہوتے ہوتے دھوپ کی جلن کم ہو چلی تھی۔ ہوا کے ایک ٹھنڈے جھونکے سے پیڑ میں سرسراہٹ ہوئی۔ گائیں اپنے لٹکتے تھن لئے ایک بار پھر گھاس کی تلاش میں تھیں۔

''کون ہے ادھر تربوزوں میں؟''

چندر دریا کنارے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دریا میں ٹھنڈے کئے تربوز تھے۔ ان سے پانی ٹپک رہا تھا۔ امجد کو اطمینان ہو گیا۔

''چلو ہو جائیں شروع'' چندر ہنسا۔

''تم کاہے کو بے کار چلا رہے تھے؟ کوئی بھی تو نہیں ہے کھیتوں میں۔'' اظہر بولا

''ارے رات کو بھی چلانا پڑتا ہے گھڑی میں کوئی نہیں ہے اور گھڑی میں کوئی گھس گیا۔ چور کو آتے کیا دیر لگتی ہے۔''

حقہ ہاتھ میں لے کر چندر بس یونہی کش لگاتا رہا۔

''تم بچے کے لیے تربوز کاٹ دو'' وہ بولا۔

امجد زمین پر پڑی پیال پر بیٹھا تھا۔ چندر بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ امجد کو اس کے منہ کی بدبو سے ناگواری ہوئی اور وہ ذرا سا پرے کھسک گیا۔

''ڈرتے ہو، بیٹے؟''

''نہیں''

''ڈرنے کی کیا بات ہے؟'' اظہر نے جیسے اسے یقین دلایا۔ ''یہ تمہارا چچا ہے امو۔ چندر کا کا۔''

اظہر نے تربوز کاٹا۔ یہ اچھا پکا ہوا تھا۔

''ڈٹ کے کھاؤ، اور''

MashalBooks.org

''چندر، ایک آدھ ٹکڑا تم بھی لے لو۔''

''نہیں بالکل نہیں ۔میں نے بہت رس پی لیا ہے، اب اور کچھ نہیں۔'' چندر نے دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

''جی چندر کا کا۔''

''یہ باتیں خوب کرتا ہے۔''

چندر امجد کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ بڑے دکھ کی بات ہے۔اظہر بھائی۔''

''اب کس کی بات کر رہے ہو تم؟''

''یہ بچے..... یہ بھی ہماری طرح ننگے بھوکے ہی زندگی بتائیں گے۔''

''کیوں؟''

''تمہیں نظر نہیں آتا کیا؟'' انہیں پالنے پوسنے کو ہمارے پاس ہے کیا؟''

اظہر کے دل کو یہ بات لگی نہیں۔ وہ اپنے بچے کے مستقبل کے بارے میں اتنا مایوس نہ تھا۔

''اللہ تعالیٰ نے ان کی قسمت میں جو بھی لکھا ہے۔''

''تم قسمت کی بات کرتے ہو؟ ہرن چکتی کے بیٹے کو بھول گئے؟ بالکل بدھو تھا میں اس کے کان کھینچا کرتا تھا۔ زبانی جمع تفریق کرنے میں بالکل صفر۔ اب وہ مجسٹریٹ ہو گیا ہے۔ اور مجھے دیکھو۔ گاؤں کے پرائمری اسکول کا سب سے ہونہار شاگرد، اب تاڑی گھان کرتا ہوں اور دھت رہتا ہوں۔''

ایک خوف کا سایہ اظہر کے چہرے پر لہرایا۔ وہ نہیں چاہتا تھا امجد یہ سب کچھ سنے۔

''اس کا باپ اسے شہر لے گیا۔'' چندر بولے گیا۔'' اور وہ لادو گدھا مجسٹریٹ بن گیا۔،تم قسمت کی بات کرتے ہو۔ ہری چمکتی کو آئے دن لگان نہیں دینا پڑتا۔ اگر میرے باپ کو لگان نہ دینا پڑتا اور اگر مجھے نہ دینا پڑے تو۔ مری آمدنی بڑھ جائے۔ پھر دیکھیں گے پانی کس رخ بہتا ہے۔ اور کس کی قسمت میں کیا لکھا جاتا ہے۔''

اظہر نے اس کی بات دھیان سے سنی مگر کہا کچھ نہیں۔ دریا بی بی بھی اس طرح کی

MashalBooks.org

باتیں کیا کرتی تھی۔اظہر اس سے بھی کتراتا تھا۔ امجد بڑے شوق سے تربوز کھا رہا تھا۔ بیٹے کے مستقبل کا خیال ایک لمحے کو اسکے ذہن میں کوند گیا۔ اسے اس طرح کی باتیں اچھی نہ لگتی تھیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''چندر، ذرا حقہ تو دو۔ ابھی ایک بیگھے زمین مجھے جوتنا ہے۔''

ایک دوکش لے کر اظہر نے حقہ چندر کو لوٹا دیا۔

بیل آنکھیں موندے، پیڑ تلے جگالی کر رہے تھے۔ اظہر جیسے ہی ان تک پہنچا جانور اٹھ کھڑے ہوئے جیسے انہیں اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس ہو۔ ان کے گلے میں سہاگہ جوت کر اظہر کھیت کی طرف چل پڑا جہاں اس برس اس کا شکر قندی بونے کا ارادہ تھا۔

امجد تربوز کھا چکا تھا۔ گچھے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس نے چندر کا شکریہ ادا کیا۔

''تمہارے تربوز بڑے مزے کے ہیں۔ چندر کا کا۔''

''دوسرا ماں کے لیے لے جانا۔آج اس نے ، کیا پکایا تھا؟''

امجد سات برس کا تھا۔ مگر اسے اتنی سمجھ تھی کہ اپنے گھر کی روکھی سوکھی کا ذکر کسی دوسرے سے نہ کرنا چاہئے۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

''ایک دن مجھے بھی بلاؤ۔''

امجد جیسے بد بدایا۔''جی اچھا۔''

''اظہر بھائی، اجازت وہ تو لڑکا تربوز کی فالیز دیکھ لے۔تم ابھی گھر تو نہیں جاؤ گے؟

''ٹھیک ہے، امو دیر مت کرنا۔''

''دیر نہیں کرونگا۔ابا۔''

چیت کے مہینہ کی سر پہر تھی۔ آسمان پر بادل صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ کھیتوں میں مصروفیت کی بھنبھناہٹ تھی۔ اگر انہیں طوفان نہ آیا، تو کام یونہی بے رکے ہوتا رہے گا۔ موسمی فصل کے لیے زمین کی تیاری ہوتی رہے گی۔ کڑکتی دھوپ سے سہمے کسانوں کو، چندر ماسہ کے ساتویں پھیر کی اس رات سے یہ آس تھی کہ وہ ان کی زمینوں کی جان بچالے گی۔

امجد اپنے ارد گرد کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ جانے پہچانے راستوں پر آنے جانے

کے سوا، وہ یہاں اس طرح کبھی نہیں گھوما پھرا تھا۔ آج چندر کا کا کا ساتھ ملا تو اسے حوصلہ ہوا کہ وہ جنگل اور اس کی دنیا کو جان سکے۔

تمباکو کے تین فٹ اونچے پودوں میں سفید پھول لہرا رہے تھے۔ پھوٹ کی ایک کیاری کے ساتھ مرچوں کے پودے تھے۔ امجد مرچوں کے ایک پودے کے سامنے ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایسی مرچیں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ لال مرچیں پودوں میں یوں لگی تھیں جیسے سر کے بل کھڑی ہوں، اور اس کی طرح ٹانگیں اوپر کئے قلا بازی لگا رہی ہوں۔ چندر اس سے ذرا آگے چل رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

''امو بیٹا، کیا دیکھ رہے ہو؟''

''یہ کس قسم کی مرچیں ہیں چندر کا کا۔''

''کیا، کسان کے بیٹے ہو کر اتنا نہیں جانتے، ارے انہیں دھوپ مرچ کہتے ہیں۔ توڑ لو، تھوڑی سی، ہاں ہاں توڑ لو۔''

امجد کو ہچکچاہٹ تھی یہ تو کسی اور کی کھیتی تھی۔ چندر نے خود کچھ مرچیں توڑیں اور اس کو دے دیں۔ اس نے انہیں لنگی کے پلو میں باندھ لیں۔

کسانوں نے جھنگا تر کاری کی کیاریوں کے گرد کانٹے دار ببلا جھاڑیوں کی باڑ بنا دی تھی۔ امجد چندر کے پیچھے پیچھے بہت دھیان سے چل رہا تھا۔ وہ پلٹا اور بولا ''ٹھہرو، امو''

ان دونوں کے بیچ میں ایک پتلی لکیر سی کیاری تھی جس میں تمباکو کے گھنے پودے اگے ہوئے تھے۔ امجد کو چندر پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے لیے چلنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے رک کر چندر کی بات سنی۔

''یہ مٹی کی زمین ہے۔ اسی کی طرح کانٹے دار ہے۔ میرا جی چاہتا ہے اسے یہاں سے نکال بھگاؤں۔''

دوسری گھڑی چندر امجد کے پاس کھڑا تھا۔

''اچھا، اب تمہیں نہیں چلنا پڑے گا۔''

امجد کو بولنے کا موقعہ دیئے بغیر، ایک پل میں چندر نے اسے کندھوں پر اٹھا لیا۔ پہلے تو امجد کو ڈر لگا۔ لیکن پھر اسے مزہ آنے لگا۔ چندر کا کا سے کس بات کا ڈر۔ چندر کے

MashalBooks.org

کندھوں پر چڑھ کر دور کسانوں کے گاؤں امجد کو اور بھی من موہنے لگے۔

کھیتوں سے پرے جنگلی گھاس میں گزرتا ہوا راستہ تھا۔ جس میں ٹڈوں اور بھنبریوں کی بھرمار تھی۔

''بیٹے مرا سر پکڑلو، گھبراؤ نہیں گروگے نہیں۔''

ایک خیالی بانسری ہونٹوں سے لگائے چندر نے پھر سیٹی بجانا شروع کی۔ امجد کو ڈر تھا کہ کہیں وہ لڑکھڑا نہ جائے۔ اس نے نیچے جھک کر دیکھا تو جنگلی گھاس کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اب اسے احساس ہوا کہ چندر کاکا نے اس کا اتنا لاڈ کیوں کیا تھا۔

امجد نے مڑ کر اپنے کھیت کی طرف دیکھا۔ لیکن اسے اپنا ابا کہیں نظر نہ آیا۔ ہر چیز تاڑ کے پتوں کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔ یہ پتے ڈھلتی دھوپ میں چمچما رہے تھے۔ چندر سیٹی بجاتے بجاتے رک گیا۔

''امو، ٹھیک ہو تم۔ مرے کندھوں پر سواری کے؟''

''جی'' امجد نے اتنا ہی کہا۔

''پھر ٹھیک ہے۔ مزہ آرہا ہے نا۔ کندھوں پر چڑھ کر دنیا کچھ اور ہی لگتی ہے۔ زمیندار کی طرح جم کر بیٹھ۔ بیٹا۔''

امجد کی سمجھ میں چندر کی ترنگ نہیں آئی۔ اونچی نیچی زمین پر چندر چلتا رہا۔ امجد نے اس کے بال اور زور سے پکڑ لئے۔

''وہ رہی میری جھونپڑی۔''

امجد نے مڑ کر دو ندیوں کا سنگم دیکھنے کی کوشش کی۔ ندی کہاں بڑی بڑی نہریں اور اونچے ٹیکرے پر قطار میں کچھ جھونپڑیاں۔ ان سے پرے میلوں تک پھیلے ہوئے بل کھاتے گڈمڈ کھیت۔ جن پر زمین کے بیٹوں کے مکان جزیرے معلوم ہوتے تھے۔

امجد نے آنگن میں شور مچاتے بچوں کو تجسس سے دیکھا۔ چندر نے پھر سیٹی بجانا شروع کی، بچوں نے اور زیادہ شور مچانا شروع کر دیا۔

آنگن تک پہنچتے ہی چندر نے آواز دینا شروع کی۔ ''ایکوکشی! ایلوکشی!'' بچوں کی بھڑ میں سے ایک بچہ بولا ''چندر کاکا کو پھر چڑھ گئی۔''

MashalBooks.org

مٹی کے ٹیلے پر ایک عورت آن کھڑی ہوئی۔ ایک کسان عورت، جس کی جوانی ڈھل چکی تھی، بدن بھاری تھا اور چہرہ تھکن سے اترا ہوا۔

''کس کا بیٹا ہے تمہارے کندھے پر؟''

''میرا'' چندر بولا ''اب اسے کچھ چیوڑا و یوڑا لا کے دو۔''

چندر نے ایک ہاتھ امجد کے سر پر رکھا اور دوسرا اسکے گھٹنے کے نیچے۔ جیسے بچوں کو جھولا جھلاتے ہیں۔ جیسے ہی سیٹی اور جھلانا ختم ہوا امجد نے خود کو زمین پر بیٹھا پایا۔ بچوں کی بھیڑ اس کے گرد اکٹھی ہوگئی۔ وہ سب دریا پار سے یہاں کھیلنے آتے تھے۔ دریا پار کرنے میں انہیں کوئی کھٹنائی نہیں ہوئی تھی، کیونکہ پانی گھٹنوں گھٹنوں ہی رہتا تھا۔

''بیٹا، میرے پاس آؤ، ایلوکشی نے اپنی بانہیں پھیلا دیں۔

MashalBooks.org

تیسرا باب

نویں کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔

امجد اپنے باپ کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا جو بیلوں کو آگے ہنکائے لئے آ رہا تھا۔ ہل کا سایہ زمین پر پڑ رہا تھا۔

جیسے جیسے انسانوں کی دنیا پھیلتی بڑھتی گئی بہت سے بدنصیب لوگ اس بات پر مجبور ہوئے کہ گاؤں سے باہر میدانوں میں بس جائیں۔ امجد کو ان لوگوں کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا۔ اس کی ماں اسے ان بچوں کے ساتھ گھلنے ملنے نہیں دیتی تھی۔ چرواہے بچے اپنے ڈھور ڈنگر لے کر دور دور تک میدانوں میں چلے جاتے تھے۔ لیکن امجد کی قسمت ان جیسی اچھی نہ تھی۔

بچہ کا معصوم ذہن ایک انجانی خوشی سے سرشار تھا۔ چاند کی پھیلتی روشنی میں موسمی فصلوں کے کھیت ایک خواب کا عکس سا لگ رہے تھے۔ کاہے کا خواب؟ امجد کو پتہ نہ تھا۔ ایک دم سے اسے اپنی ماں کی باتوں کا رنج ہوا۔ یہ بچے اچھے نہ تھے۔ اس لئے اسے ان سب سے الگ رہنا چاہئے۔ اسکول کے بعد اس کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہوتا۔ سوائے اس کے کہ ماں کے سامنے حاضر رہا کرے۔

امجد کو ایلوکشی اور چندرکا کا خیال آ گیا۔ وہ کسی اور دنیا کے لوگ تھے۔ امجد نے ان کے رہن سہن، کھانے پینے، طور طریقوں کی ایک جھلک ہی دیکھی تھی۔ ایلوکشی نے بڑی خفت سے کہا تھا'' بچے تم ہمارے گھر آئے بھی تو کس دن۔ تمہاری خاطر کو چیوڑے کے سوا کچھ بھی نہیں اس وقت ہمارے پاس۔''

چندرکا کا پیر جھلا جھلا کر ہنستا رہا اور باتیں کرتا رہا۔

شرمایا ہوا امجد، سر جھکائے تھوڑا سا چیوڑا منہ تک لے گیا۔

''خان کا لڑکا ہے نا؟'' ایلوکشی نے پوچھا۔

MashalBooks.org

''ہاں۔اسے اپنا ہی کیوں نہیں کہتیں؟''

''دادی ان کے گھرانے کی کیسی کیسی باتیں بتایا کرتی تھی۔''

امجد نے ایلوکشی کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر فوراً نظر جھکالی کہ کہیں وہ دیکھتا پکڑا نہ جائے۔

''اوراب کے خانوں کی باتیں تم نے نہیں سنیں۔'' چندر بولا۔

موہیش ڈنگا اب دو زمینداروں کی عمل داری میں تھا۔ حاتم بخش خاں اور اس کے رشتہ داروں کے پاس گاؤں کی تین بٹہ آٹھ زمین تھی۔ اب وہ نئی جگہ جا کر بس گئے تھے۔ اور نئے خان کہلاتے تھے۔

''رحیم خان کے باپ کو کون نہیں جانتا۔لٹیرا؟'' ایلوکشی بولی'' لوگوں کو لوٹ لوٹ کے زمیندار بن گیا۔''

چندر نے اس کی بات کاٹی۔'' پتہ نہیں تمہیں جب گائے کو خارش ہوتی ہے۔تو ان لٹیروں کے نام اس کی گردن میں باندھتے ہیں تو فوراً ہی کیڑے مر کر گر جاتے ہیں۔ پہلا نام جو لکھتے ہیں وہ رحیم خان کے باپ کا ہوتا ہے۔تمہاری گائیں تو ٹھیک ٹھاک ہیں؟'' اس نے امجد سے پوچھا۔

امجد کے اردگرد باتوں کی بھنبھناہٹ سی ہو رہی تھی۔ اور چندر کاکا کی ہنسی کے جادو سے ہوا بھی دھیرے دھیرے لہریں لے رہی تھی۔

تربوز کے بوجھ کے باوجود گھر پلٹنا نعمت تھا۔ اتنا بڑا پھل امجد کی حیثیت سے زیادہ تھا۔ وہ کبھی ایک بازو پر کبھی دوسرے بازو پر اس کو اٹھاتا۔ شکر تو یہ تھا کہ اس کا باپ بہت تیز نہیں چل رہا تھا۔ آخر تھک ہار کر اس نے تربوز کو سر پر اٹھالیا۔

بادل کی ایک پتلی سی لکیر چاند پر سے گزر گئی اس مدھم سا سایہ کھیتوں پر پڑا۔ پگڈنڈی پر اندھیرا مکڑی کی طرح پھیلا ہوا تھا۔

اظہر خان تھکا ہوا تھا۔ چندر کو تل جب لڑکے کو واپس لایا ہے تو شام پڑ چکی تھی۔ پہلے تو اس نے بیٹھ کر انتظار کیا۔لیکن خالی بیٹھنا اس کے طبیعت میں نہ تھا۔سو اس نے پھر کام کرنا شروع کر دیا اور ادھر ادھر کے کچھ کام نبٹائے۔ چندر کو تل لڑکے کو لے کر بھی آ گیا پھر بھی

دیر لگ گئی۔ چندر کے پاس کرنے کو اتنی باتیں تھیں۔ نشہ اس کا اب اتر گیا تھا۔ رات دھیرے دھیرے دکھ سکھ کی باتوں میں گزر رہی تھی۔ چاندنی رات تھی اظہر کو بھی، ایسی کوئی جلدی نہ تھی۔ چندر کو گھر واپس جانا ہی نہ تھا۔ وہ کھیتوں میں رات بسر کرنے کو تھا کہ تربوزوں کی رکھوالی کر سکے۔

''بچے کو پھر ساتھ لانا۔ اظہر بھائی۔''

چندر کھیت کے پار سیٹی بجاتا چلا گیا۔ امجد اس کی جھومتی مستانی چال دیکھتا رہا۔

چاند کے چہرے سے جیسے ہی بادل کا پلو سرکا تو ایسی چکا چوند روشنی ہوگئی جیسے دن کا اجالا رستے پر بکھر رہا ہو۔ امجد نے پلٹ کر گاؤں کی طرف دیکھا۔ ترکاری کی کیاریوں میں گڑے بانسوں کا ہیولی اوران پر بیٹھے کو چکر لگاتے ہوئے الو۔ وہ چاندنی میں جنگلی چوہوں کی تلاش میں اندھیاری چھائی رہتی تھی رات کو چوہوں جیسے چالاک جانوروں کی تاک لگائے رہتے تھے۔ چندر کا کا شاید کچھ بتا سکیں۔

گاؤں کی گلی کے دونوں کناروں پر کسانوں کی جھونپڑیاں تھیں، او ر یہاں ابھی زندگی کا کاروبار چل رہا تھا۔ پہلے تو نئے خانوں کا پختہ مردانہ مکان تھا جہاں بچے اندھا دھند پڑھے جا رہے تھے۔ کسان شاید حاتم خان کے دربار میں جمع تھے اور وہاں کوئی سازش ہو رہی تھی۔ محبوب پنساری کی دکان پر ابھی دو چار گاہک موجود تھے۔ تیل کے ایک لیمپ کی ملگجی روشنی میں محبوب ترازو لئے بیٹھا تھا۔ ایک پیسہ کا تیل، دھیلے کی مرچیں، او رکوڑی کا نمک۔ پھنساری کی ایک ذرا سی دکان اپنے گاہکوں کی ضرورت کو کافی تھی۔ دن میں تو کسی کو فرصت نہ ہوتی۔ دوکانداری شام کو چلتی۔ محبوب کی دوکان پر روز کی طرح لیمپ ابھی تک جل رہا تھا۔ اظہر خاں نے ہل کندھے سے اتار کر زمین پر رکھا۔ خود بھی بیٹھ گیا اور اپنے گمچے سے خود کو ہوا دینے لگا۔

''ہاؤ'' بیل اظہر کی آواز سنتے ہی رک گئے۔

''امو بیٹے، تربوز نیچے رکھ اور ذرا دوکان تک تو دوڑ۔

امجد نے پھل احتیاط سے زمین پر رکھا کہ کہیں زور سے رکھا تو پھانکوں کی کھیلیں ہو جائینگی۔

MashalBooks.org

''لو یہ دو پیسے لو۔ میں ذرا سستا لوں۔ یہ ہل بھاری ہوتا جاتا ہے۔

''ابا، لاؤ''

''ڈیڑھ پیسے کی بیڑی اور دھیلے کی ماچس۔''

اظہر نے لنگی کی ڈب میں سے خالی دبیہ نکالی۔

''لو ڈبیہ لے جاؤ۔ وہ تمہیں کوئی بیس تیلیاں دے گا۔ گن کر لینا، بیٹے۔''

پیسے ہاتھ میں لئے امجد کچھ ہچکچا رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟''

''میرا جی نہیں چاہتا جانے کو۔''

''کیوں؟''

''دھیلے کی تیلیاں لیتے مجھے شرم آتی ہے۔''

''اسی لئے میرا خیال ہے کہ تمہیں اسکول نہیں بھیجنا چاہئے۔ جب غریب کے بچے امیروں کی اولاد کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگتی ہے تو یہی ہوتا ہے۔''

امجد اس سے پہلے دوکان سے ایک پیسے کی گولیاں اپنے لئے تو لینے گیا تھا لیکن گھر کے لئے سودا کبھی نہیں لایا تھا۔ اسے اپنا یہ پہلا کام بڑا بوجھ لگ رہا تھا۔

''جاؤ'' اظہر کی آواز ملائم نہیں تھی۔ ''ہر کوئی اپنی حیثیت کے مطابق خریدتا ہے۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے؟''

امجد لوٹا، مگر شرم سے کھسایا ہوا۔

''اس کے پاس تیلیاں ختم ہو گئی ہیں۔ کہتا ہے دس لے لو۔ کوڑی کا نمک دے دونگا۔''

''ٹھیک ہے، لے آؤ۔''

اظہر خان نے تیلیاں گنیں۔ نمک کی پڑیا، ماچس کی ڈبیا اور بیڑیاں سنبھال کر بولا۔

''چلو، بیٹے چلیں۔''

تربوز اب دس گنا بھاری ہو گیا تھا۔ کھیتوں میں اسے لئے دوڑنے کا چاؤ غائب ہو گیا تھا۔ اپنے باپ کو دیکھ کر اس کا گلا رندھ گیا۔ جیسے دو بیلوں کے ساتھ تیسرا جانور ہل

MashalBooks.org

کندھے پر رکھے چلا جا رہا ہو۔ نفرت کے سانپ نے اس کے سینے میں پھنکار بھری۔ منہ لٹکائے وہ باپ کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

خان کے گھر کا راستہ اور بھی تنگ تھا۔ دونوں طرف بید اور کلک کی جھاڑیاں آگے تک اگ آئی تھیں۔ یہاں چاندنی بھی احتیاط سے درختوں سے نیچے اترتی تھی۔ رستہ بمشکل نظر آتا تھا۔ اظہر خان اور بھی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ کہیں ہل کا دھار بیلوں میں نہ الجھ جائے۔

''امو بیٹے میرے بالکل پیچھے پیچھے آنا۔''

امجد باپ کا لہجہ پہچانتا تھا۔ اس میں فکر و پریشانی محبت بن کر، چاندنی کی طرح چھنتی تھی۔

''امو''

''ابا''

''خفا ہو مجھ سے؟''

''امجد فوراً جواب نہ دے سکا۔ کیا باپ نے اس کا ذہن پڑھ لیا ہے؟

''نہیں ابا''

ہل کی تلوار بیلوں میں پھنس گئی۔ اظہر کو رکنا پڑا۔

''بیٹے، اس بیل کو تو رستے سے ہٹا دو۔''

بڑی مشکل سے امجد نے ہل کا پھل بیلوں سے چھڑایا۔ اظہر اور بھی محتاط ہو گیا۔

اظہر خان نے کہا ''ہمیں اپنی غربت سے نہیں شرمانا چاہئے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے۔ اگر تم ایسا کرو گے تو اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے گا۔''

امجد چپ چاپ سنتا رہا۔

چھدری آبادی کے اس گاؤں میں ٹڈیاں وقت کا حساب رکھتی تھیں۔ گولر کے بڑے سے پیڑ پر لنگور چاند کی روشنی میں ابھی تک ہوشیار تھے ان کے بچے کی تت تت سنائی دے رہی تھی۔

اس رستے پر اکیلے چلنے کی ہمت امجد میں نہ تھی۔ گولر کے نیچے پیر کا مزار تھا۔ جمعہ کی

MashalBooks.org

شام کو گاؤں والے یہاں نذر چڑھانے آتے۔ لوگ کہتے تھے کہ آدھی رات کے بعد، پرہیز گار درویش اژدہے پر بیٹھ کر گاؤں کا چکر لگاتے ہیں۔ مرحوم درویش بہت مہربان تھے۔ شاہ کرمان خراسانی سب کے دکھوں کا بوجھ ایک اکیلے نے اٹھا لیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بیماریوں میں یہ مقبرہ یا مزار گاؤں والوں کی اکلوتی پناہ گاہ تھی۔

امجد میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ آنکھ اٹھا کر گولر کے تنے پر نظر ڈالتا جس کا گھیر ہی تیس فٹ تھا۔

دو بڑی بڑی ٹہنیوں کے بیچ میں ایک سوراخ تھا۔ جس میں اژدھا رہتا تھا۔ وہ دن میں بھی کبھی کبھار نکل آتا لیکن کسی کے غرض نہ رکھتا۔

ہزاروں کہانیاں تھیں۔ ڈھیروں تو امجد نے دریا بی بی سے سنی تھیں او راس کے رونگٹے کھڑے ہو جایا کرتے۔

یہ زندہ پیر تھے۔ ان کے مزار پر ہندو مسلمان دونوں قربانی کا چڑھاوا چڑھاتے اندھیرے میں گولر کے پکتے پھل پٹ پٹ کرتے رہتے۔ امجد اس آواز سے مانوس تھا۔ اس نے سوچا صبح تڑکے ہی وہ یہ پھل چننے آئے گا۔

وہ ایک ویران مکان کے پاس سے گزرے جس کی قلعی کی ہوئی دیواریں ہی کھڑی رہ گئی تھیں۔

بس اب ذرا سا راستہ اور ہے پھر وہ اپنے گھر کی پگڈنڈی پر ہوں گے۔

امجد کا دل خوشی سے ناچ رہا تھا۔ وہ بار بار دھاری دار تربوز کو دیکھتا۔ اماں بہت خوش ہوگی۔

نویں کا چاند دھیرے دھیرے مغرب کی طرف سرک رہا تھا۔ جیسے آسمان کا زینہ اتر رہا ہو۔ سفید بادل اس کے گلے لگے ساتھ ساتھ تھے۔ سب کچھ ایسے تھا جیسے ایک پرسکون جھیل ہو۔ باہر والے مکان تک پہنچتے ہی امجد باپ سے آگے نکل گیا۔ یہ جگہ اسے اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح ازبر تھی۔

چھپر کے سامنے پہنچ کر وہ سہم گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے کسی اجنبی کا سایہ اس کے پاس سے ہو کر گزرا ہو۔

MashalBooks.org

باپ سے اس نے کچھ نہ کہا۔ ایک پل کو رکا اور پھر باپ کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

اظہر خان کا دھیان کہیں اور تھا۔ اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔

''امو، ذرا ٹھہرو۔ میں بیل باندھ لوں اور ہل رکھ دوں۔''

امجد نے بددلی سے تربوز مکان کے برآمدے میں رکھ دیا۔ اسے اپنے باپ سے ڈر لگتا تھا وگرنہ وہ مرا جا رہا تھا کہ بھاگ کے جائے اور اپنی ماں کو اچنبھے میں ڈال دے۔ آج تک اس گھر میں کون ایسا خوبصورت تربوز لایا تھا؟

اس چھپر میں، ایک کونے میں ہل اور دوسرے میں اوزار رکھے رہتے تھے۔ بارش کے دنوں میں دوسرے کونے میں بھوسہ رکھا جاتا تھا۔ اگر مہمان آجائے تو دوسری طرف کے دونوں کونے ان کے لیے ہوتے۔

اظہر ہل رکھ کر جیسے ہی مڑا اسے ایسے لگا جیسے چھپر سے ایک سایہ دالان کی طرف گزرا ہو۔

''کون ہے؟''

کسی نے جواب تو نہ دیا لیکن سایہ ساکت ہو گیا۔

''کون ہے؟''

امجد آنگن میں کھڑا تھا اور اسے ڈر لگ رہا تھا۔ باہر والے گھر میں جن گھس آیا تھا کیا؟ اپنی ماں سے اس نے جنوں کی کہانیاں سنی تھیں۔ اس گھر میں کلام پاک کا نسخہ رکھا تھا جن اسے پڑھنے آتے تھے۔

اظہر کو اس بات پر بہت غصہ آتا کہ بچوں کو اس طرح کی کہانیاں سنائی جاتیں۔ لیکن اس وقت وہ بھی دبدھے میں تھا۔

''کون ہے؟'' وہ زور سے چلایا۔ ایک ڈنڈا ہاتھ میں لئے وہ دالان سے آنگن میں کودا۔ سایہ سسکیاں لینے لگا۔

اظہر نے امجد کو پکارا۔ ''یہاں آؤ۔ امو۔ کون ہے یہ؟''

یہ ایک چھوٹی سی ننگی پتنگی بچی تھی۔ بے نام سی روشنی میں اظہر نے اپنی بیٹی نعیمہ کو پہچانا۔

MashalBooks.org

''نمو،تم یہاں؟''

بچی نے کوئی جواب نہیں دیا۔اور زور سے سسکیاں بھرنے لگی۔

''تم اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہی ہو؟'' اظہر زور سے بولا اور ماں کہاں ہے تمہاری؟''

دریابی بی اندر سے نکلی۔

''اتنا شور کاہے کو مچا رکھا ہے؟''

اظہر خان نے بیوی سے سرزنش کے لہجے میں پوچھا''ایک بھوکی پیاسی بچی اور گھر کے باہر اتنی رات گئے اور تم اتنا بھی نہیں کر سکتیں کہ ہمیں کچھ دھیان رکھنا چاہیے؟''

''میں نے بہت سمجھ لیا۔''

دریابی بی نعیمہ کی طرف بڑھی۔اس نے مارنے کو ہاتھ اٹھایا''ذرا ٹھہر،حرامزادی، تین برس کی ہوگئی اور منہ سے پھوٹ نہیں سکتی۔''

اظہر خان نے غصہ میں آگ بگولا بیوی کو دیکھا۔

''کیا ہوا؟ مجھے بتاؤ''

اتنی بڑی لڑکی اور اپنی دھوتی گنوا آئی۔''

اظہر نے پوچھا''کون سی؟''

وہی جو اگلے دن تم ہاٹ سے لائے تھے۔''

''آہ'' اظہر نے ایک سسکی لی۔

''اور یہ ایسی بے وقوف ہے، بے وقوف کی جنی کہ یہ تک نہیں بتا سکتی کہ دھوتی گم کیسے ہوگئی؟''

''سو تم نے اسے پیٹا؟''

دریابی بی چلائی۔''ہاں مجھے پتہ ہے۔میرے ہاتھ کو پتہ ہے اور اس کی پیٹھ کو۔''

اظہر خان نے بچی کو اپنی طرف کھینچا اور پیار سے اس کی پیٹھ سہلانے لگا۔''کیا کیا ہے تم نے؟ ساری پیٹھ پر بدھیاں پڑی ہوئی ہیں!''

''میں ہی جانتی ہوں غریبی کیا ہوتی ہے۔ اور اس پر یہ لوگ میرے ساتھ یہ

MashalBooks.org

کریں۔''

اظہر خان کو اپنے پڑوسیوں پر غصہ آ گیا۔

''چوروں کا پڑوس ہے! ذرا سی لونڈیا اپنے کپڑوں کا اتنا خیال تو نہیں کر سکتی۔ کھل کر کہیں گر گئی ہو گی سب کے سب چور ہیں۔''

دریا بی بی بولی ''میں نے ایک ایک سے پوچھا۔ کوئی کچھ نہیں بتاتا۔''

''بھاڑ میں ڈالو۔ چلو بچی کو گود میں لے لو۔''

اظہر نے سائبان میں بیل باندھے۔ اور بھوسہ کے ایک دو گٹھے ان کے سامنے ڈالے۔

نعیمہ کسی طرح باپ کو نہیں چھوڑ رہی تھی۔ جیسے ہی دریا بی بی نے اسے اٹھایا اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔ دریا بی بی نے بیٹی کا گال چوما اور بولی ''کس نے لے لیا وہ کپڑے کا ٹکڑا، بیٹا؟'' نعیمہ صرف روتی رہی۔

''چلو اندر چلیں۔ میں نہا کر آتا ہوں''

تربوز ہاتھ میں لئے امجد ماں کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اسے افسوس تھا کہ کسی کا دھیان اس کی طرف گیا ہی نہیں۔ جس فخر کی اسے امید تھی وہ خاک میں مل گئی۔ کمرے میں پہنچ کجر امجد نے تربوز ماں کے سامنے رکھا اور چوروں کی طرح بولا ''ماں، تربوز'' ماں کے چہرے پر مسکراہٹ ایک بچی کی طرح کوند گئی۔

''ارے امو، کس نے دیا رے تجھے اتنا بڑا تربوز؟''

''کھیتوں والے چندر کا کا نے''

''یہ تو پکا ہوا ہے'' دریا بی بی امجد کو دیکھ کر مسکرائی۔ امجد کا جی خوش ہو گیا۔ دریا بی بی نے نعیمہ سے کہا ''دیکھو، ادھر، تربوز کھاؤ گی، ہے نا؟''

اس نے پھل کو کئی بار انگلیوں سے ٹھوک بجا کر دیکھا۔

''بیٹے ابھی یہ پوری طرح پکا نہیں۔ ایک دو دن اسے رکھا رہنے دو۔''

نعیمہ کے چہرے پر مسکراہٹ نظر آئی۔

''ماں، تم بھی کھاؤ گی۔''

MashalBooks.org

ٹانگیں پھیلا کر، دریا بی بی چٹائی پر بیٹھ گئی اور امجد سے بھی اپنے پاس بیٹھنے کو کہا۔ امجد نے دن بھر کی کہانی ماں کو سنائی۔

دریا بی بی ایک دیا اور کرنجے کا تیل اٹھا کر لائی۔ مٹی کا تیل خریدنے کو اس کے پاس پیسے ہمیشہ نہیں ہوتے تھے۔ تڑکے ہی کرنجے کے بیج چننے کو نکل کھڑی ہوتی اور پھر تیلی سے ان کا تیل نکلوالاتی۔

''جاؤ جا کے کچھ پڑھ لو۔ سارا دن جنگلی کھجوریں اور گولر چنتے رہتے ہو۔ کچھ کرنجے کے بیج نہیں چن سکتے کیا؟''

نعیمہ جس نے بڑا درد سہا تھا پڑ کے سو گئی۔

''آج جی بھر کر مار کھائی اس نے''

اتنی رات گئے امجد کو اسکول کا کام کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ لیکن ماں سے شکایت کرنے کا کچھ فائدہ نہ تھا۔ وہ دیئے کی بجھی بجھی روشنی میں پڑھنے بیٹھ گیا۔ دریا بی بی گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔

پڑوس میں اور بھی دو چار لوگوں کے کپڑے لتے چوری ہوئے تھے۔ دریا بی بی کو اس کا رنج تھا۔ وہ کپڑے کا ٹکڑا یوں تو تین روپیہ کا ہی تھا لیکن دریا بی بی جانتی تھی کہ وہ بڑی محنت کے پیسے تھے۔

کھانا کھا کر اظہر دالان میں بیٹھا حقہ پیتا رہا۔ امجد اپنے ہی خیالوں میں گم تھا۔ دریا بی بی سمیل کی روئی سے بیج نکالتی رہی۔

''یہ چوٹٹ، بچوں کے کپڑوں پر ہی نظر رکھتے ہیں۔

''اور کس کس کے کپڑے چوری ہوئے؟'' اظہر نے پوچھا۔

''موتی کے لڑکے کی دھوتی۔ ذاکر کی بیٹی کی ساڑی اور بھی بہت سوں کے۔''

اظہر نے حقہ کا ایک گہر کش لیا۔

''یہ گاؤں نیچ ہوتا جا رہا ہے۔ خانوں کی تو کوئی عزت ہی نہیں رہ گئی۔''

دریا بی بی نے ہونٹ سکیڑے مگر اظہر نے اس پر توجہ نہ کی۔ وہ بولتا رہا۔ ''ان نو دولتیوں کو دیکھو کس طرح اتراتے ہیں اور ان کے مقابلے میں پرانے خاندانوں کو دیکھو۔''

MashalBooks.org

دریا بی بی شوہر کو غصہ نہیں دلانا چاہتی تھی۔ وہ روئی کے پھوئے چھاج میں ڈھیر کرتی رہی۔

''خاک عزت، ہر ایک تو پھٹے حالوں میں ہے۔'' وہ بولا۔ جیسے بس کہنے کو ایک بات کہہ رہی ہو۔

''کسی خاندان کی عزت صرف روپے پیسے سے ہی نہیں ہوتی۔''اظہر نے جواب دیا''موہیش ڈنگا کے خان آج بھی علاقے میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔''

''جانے جاتے ہیں'' دریا بی بی نے اعتراف کیا''مگر پیسے کے بغیر عزت رہتی نہیں۔''اظہر خاموش رہا۔

دریا بی بی کو اپنے میاں کا ایک دم چپ ہو جانا ذرہ بھر نہیں بھاتا تھا۔اس نے بات جاری رکھی۔

''میں پکڑونگی چور کو،تم دیکھ لینا''

سوچو تو اتنے مہنگے کپڑے اور ان شیطان چوروں کے ہتھے چڑھتے رہیں۔''

دریا بی بی نے پکارا''امو''

''کیا ہے اماں''

''دیکھنا بیٹا،تم اپنے کپڑے نہ گنوا بیٹھنا۔''

امجد روئی کا ایک پھویا پھونک مار کر اڑا رہا تھا۔

''نہیں ماں، میں کپڑے نہیں گنواتا۔''

بڑھیا عاشق جان عام طور پر چھٹ پٹے سے پہلے ہی گھر آجاتی۔ آج کوئی نرالی بات نہ تھی۔وہ اونچا سنتی تھی لیکن بعض اوقات جو کچھ دوسرے کہہ رہے ہوتے اسے اتنی اچھی طرح سمجھ جاتی کہ بہری معلوم نہ ہوتی۔ بہت سے اس کو سیانی بہری کہتے تھے۔

میاں بیوی کی باتیں اس کے کانوں تک بھی پہنچیں۔ وہ جلدی لیٹ گئی تھی لیکن اسے نیند نہیں آرہی تھی۔عام طور پر رات کے پچھلے پہر وہ دو چار گھڑی سو لیتی۔ خلاف توقع عاشق جان اپنے کمرے سے باہر آگئی۔اپنی چچی کو دالان میں آتے دیکھ کر اظہر نے پوچھا

''کیا بات ہے چچی؟''

MashalBooks.org

اظہر اس بوڑھی سے نرمی سے پیش آتا تھا۔ایک کوٹھڑی ہی تو تھی اس کے پاس اس کے سوا اس کے لئے کیا کرتا تھا۔اپنے بال بچوں کی ہی مشکل سے پوری پڑتی تھی۔''کچھ نہیں بیٹا'' عاشق جان دالان میں بیٹھ گئی پھر بات کرنے کی خاطر اس نے کہا۔

اگلے وقتوں میں کیسا گھرانا تھا تمہارا!''وہ بولی''اب دریا بوا سے چلاتی ہے۔اچھی لڑکی ہے یہ۔''جن کے لیے ساری تعریف کی جارہی تھی، اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

''تمہاری تکلیف میرے سامنے ہے۔'' عاشق جان نے اضافہ کیا۔

اب دریا بی بی نے اس کی طرف ایک غصہ بھری نظر ڈالی۔میاں بیوی آپس میں اپنے گھر پر ہزاروں باتیں کر سکتے ہیں۔لیکن اس معاملے میں کوئی دخل دے، یہ اسے گوارہ نہ تھا۔عاشق جان نے ابھی بات پوری نہیں کی تھی''نیکی اب تو رہی ہی نہیں''وہ بولی''غریب کو تو کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا، دریا بو۔''

''کیا؟ دریا بی بی نے رکھائی سے جواب دیا۔

''تمہارے پاس کپڑے کم ہیں۔میرے پاس دو چار ساڑیاں ہیں۔''

عاشق جان نے اپنی بغل میں سے انھیں باہر نکالا۔''یہ تم لے لو۔میرے پاس ابھی بہت ہیں۔''

دریا بی بی کی آواز کٹیلی تھی۔''کہاں سے ملیں یہ تم کو۔''

''انیرو چودھری کی ماں مرگئی۔کل اس نے غریبوں کو کھانا کھلایا تھا اور زکوٰۃ میں یہ کپڑے دیئے۔''

''زکوٰۃ، زکوٰۃ'' دریا بی بی پھٹ پڑی۔ دانت پیستے ہوئے اس نے پھر دہرایا ''زکوٰۃ اب میں زکوٰۃ لوں گی؟ میرا میاں ابھی جیتا نہیں کیا؟ میرا بیٹا؟ یہ بات تمہارے منہ سے نکلی کیسے؟''

دریا بی بی نے ٹھوکر مار کر ساڑیاں دالان سے باہر پھینک دیں۔

اظہر کی سمجھ میں یہ معاملہ کچھ آیا نہیں۔ وہ اٹھا اور دالان کے نیچے سے ساڑیاں اٹھا کر لے آیا۔

''میں بتائے دیتی ہوں دوبارہ ایسی بات مت کہنا۔گھر سے نکال باہر کروں گی

میں۔تمہاری زکوٰۃ کو میں سات دفعہ ٹھوکر مارتی ہوں۔''

امجد کے پیر وہیں جم گئے۔ اظہر خان بالکل چپ بیٹھا رہا۔لگتا تھا دالان میں سے کوئی طوفان گزر کر گیا ہو۔

آدھی رات کو دریا بی بی کی آنکھ کھلی۔ امجد وہاں نہیں تھا۔ کہاں چلا گیا وہ؟ بے سدھ سو رہا تھا۔

او رعاشق جان اکڑوں بیٹھی تھی گھٹنوں پر اپنا چہرہ ٹکائے۔ اس کے سن جیسے سفید بال بکھرے ہوئے تھے۔کوٹھڑی میں سسکیوں کی آواز تھی۔ کیا بوڑھی عاشق جان رو رہی تھی؟ دریا بی بی نے اس کی طرف دیکھا۔ ایسا لگتا تھا غریب نے عورت کا روپ لے کر کوٹھڑی کے ایک کونے میں پناہ لے رکھی ہو۔ انسان اللہ تعالیٰ کی سب سے عظیم مخلوق ہے۔کیا ہو گیا انہیں؟ دریا بی بی بے چین ہوگئی۔غربت کی آگ میں زندگی جیسی دولت جل کر راکھ ہوگئی۔

پہلی دفعہ غربت کا ننگا روپ دریا بی بی پر کھلا۔ وہ ایک سنہرے دیس کی جلا وطن شہزادی کی طرح یہاں کیوں آ گئی؟ کیوں آئی وہ یہاں؟ اسے جلتے زخموں کا سا درد محسوس ہوا۔

اس نے دیا پھونک مار کر بجھا یا،اور پھر دریا بی بی اندھیرے میں عاشق جان کے پاس آئی اور بولی:''خالہ''۔

MashalBooks.org

چوتھا باب

شام کے دھندلکے میں نعیمہ بچوں کے ساتھ آنگن میں کھیل رہی تھی۔ اظہر کھیت سے آج جلدی پلٹ آیا تھا۔ اپنے آپ میں مگن اظہر اپنا فالتو وقت گھر پر ہی گزارتا۔ اسے دوسرے پڑوسیوں کی طرح تاش اور چوپڑ میں بے کار وقت لگانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ دریا بی بی سے گھر اور بال بچوں کے بارے میں بات چیت کرتا۔ اور اگر کچھ کرنے کو نہ ہوتا تو اپنا حقہ پیتا رہتا۔ جب امجد دالان میں اس کے پاس آ بیٹھا تب بھی اسے کوئی بات کرنے کو نہ سوجھی اور نہ ہی نعیمہ سے کہنے کو اسکے پاس کچھ تھا۔

بکری کے کالے بھٹ میمنوں پر شفق کی لالی پڑی رہی تھی۔ اور وہ رنگوں کی گانٹھوں جیسے دکھائی دے رہے تھے۔ بکری بھوسہ پر مزے سے لیٹی تھی مگر میمنے کدکتے پھر رہے تھے۔ وہ دوڑ کر ماں تک آتے اس کے تھن چوستے اور پھر ممیاتے ہوئے آنگن میں گھومنے لگ جاتے۔ نعیمہ ان کے پیچھے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ اگر میمنے پکڑائی میں نہ آتے تو نعیمہ خفا ہو جاتی تھی اور جا کے ماں سے شکایت کرتی۔ پھر وہ ان کے ساتھ مل کر کرتی۔ ایسے بن کے بیٹھ جاتی جیسے اپنے میمنوں سے کوئی غرض نہیں۔ ان کی طرف سے بظاہر آنکھیں پھیرے اس نے جھٹ سے ایک میمنے کو پکڑ لیا۔ پہلے تو میمنے نے ڈر کے مارے چیخ ماری، لیکن نعیمہ کے پیار نے اسے پگھلا دیا۔ نعیمہ نے میمنے کو اپنے سینے سے لگا لیا اپنے ملائم ہاتھوں سے لاڈ کرتی رہی۔ لیکن جب بکری اس کے قریب آئی تو وہ پیچھے کو ہو گئی۔

اظہر خان خاموشی سے اپنی بیٹی کا کھیل تماشہ دیکھتا رہا۔ دھوئیں سے اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ کوئی بات بھی اس کے ہونٹوں تک نہ آئی۔ دریا بی بی گھر کے کام کاج میں لگی تھی۔

ذرا دیر بعد امجد کھجور کے پتوں کا ایک بنڈل بغل میں دبائے آ گیا۔ مکتب سے اسے ابھی چھٹی ملی تھی۔ جب تک روشنی رہتی مولوی صاحب کو پڑھانے پر اعتراض نہ ہوتا۔

MashalBooks.org

اس وقت بچے زور شور سے پہاڑے یاد کیا کرتے۔

امجد جلدی آجاتا۔ لیکن پڑھائی کے بعد کھجور کے پتے دھونا ایک اور کام تھا۔ اگر اس سے پتے گم ہو جاتے تو اس کی ماں خفا ہوتی۔ سیاہی کے دھبے آسانی سے چھٹتے نہ تھے اور تالاب کا پانی بھی کچھ ایسا اچھا نہ تھا۔ اس سب میں اسے دیر ہو جاتی لیکن ڈر کے مارے اسے شکایت کا حوصلہ نہ ہوتا۔ کچھ دنوں سے وہ اپنا مقابلہ ان لڑکوں سے کیا کرتا جو کاغذ پر لکھتے تھے اور اس کی طرح کھجور کے پتوں پر نہیں۔

اس کا دل بجھا ہوا سا تھا اس لئے دالان میں اظہر کے پاس جا بیٹھا۔ ماں سے کوئی بات کرنے کو نہ تھی۔ نعیمہ کو کھیل میں مگن دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گیا اور خود بھی جا کر اس کے ساتھ کھیلنے لگا۔

اب میمنے سہم سے گئے۔ دوڑنے میں امجد کو ہرا تو سکتے نہیں تھے اس لئے صرف ممیائے رہ گئے۔

بہن بھائی نے مل کر آنگن میں رونق جما رکھی تھی۔

دریا بی بی کو ذرا فرصت ملی تو وہ بھی آ کر ہوا میں بیٹھ گئی۔

''امو''

''جی ماں''

''میمنوں سے چمٹو نہیں، بگڑ جاتے ہیں اس طرح۔''

''نہیں ماں، میں ان سے چمٹ تو نہیں رہا۔''

نعیمہ نے احتجاج کیا''ماں میں تو بس کھیل رہی ہوں۔''

''ہاں، کھیلو کھیلو۔''

شام آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔ آنگن میں اندھیرا چھا گیا۔ دریا بی بی نے اپنے بال کھول دیئے۔ ذرا پنڈے کو ہوا لگے جو دن بھر کی محنت سے چور اور شرابور تھا۔ آنگن میں اندھیرا تھا۔ امجد اور نعیمہ کی بن آئی تھی۔ اب وہ میمنوں سے جتنا چاہے لاڈ کر سکتے تھے۔ چاہے کتنے زور سے وہ ان کی پیٹھ تھپکتے، ماں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ مگر میمنے بھی ایسے شیطان تھے کہ بچے اگر ذرا بھی زور سے دبوچتے تو وہ اتنے ہی زور سے ممیاتے جس پر ماں فوراً ڈانٹ

MashalBooks.org

ڈپٹ کرتی۔ دریا بی بی ڈانٹ کر بولی ''ذرا اور دبے پاؤں چلو۔ چودھویں صدی کی نسلو!''

امجد نے میمنوں کی نقل اتاری۔ اظہر خان اندھیرے میں دھیرے سے ہنسا وہ تو بھول ہی گئے تھے کہ وہ بھی وہاں ہے۔ دالان میں ایک دیا جل رہا تھا۔ آنگن تک اس کی مدھم روشنی پہنچ رہی تھی جہاں اب سایوں نے ڈیرہ جمالیا تھا۔ انہیں ایک دوسرے کی شکلیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔

آنگن سے پرے جنگلی جھاڑ پھونس اگ رہا تھا۔ گو اتنا گھنا نہ تھا۔ اظہر خان ان میں سے گزرتا تو ایک چپو ساتھ رکھتا۔ پگڈنڈی صرف بارش کے دنوں میں کام آتی۔ جب مچھلی پکڑنے کے لیے تال تلیا تک جانا ہوتا۔

میمنے بھاگ بھاگ کر تھک گئے تھے۔ دریا بی بی چپ بیٹھی تھی۔ اظہر خاں نے دیئے پر حقہ کے لئے خود کوئلے دہکائے۔ کیا دوسروں پر حکم چلانا بھول گئے؟ دریا بی بی اندھیرے میں مسکرائی۔ بچون کا شور اسے برا لگ رہا تھا۔

''مت چیخو، تم دونوں۔''

ایک میمنا امجد کی بانہوں میں زور زور سے ممیا رہا تھا۔ ڈر کے مارے امجد نے اسے چھوڑ دیا۔

میمنا، گر کر سنبھلا، اور اپنی ماں کے پاس ایک ہی جست میں پہنچ گیا۔

بچے اندھیرے میں چپکے سے جا کر دریا بی بی کے پاس بیٹھ گئے۔

ماں بہت زیادہ خاموش تھی۔ امجد کو اس سے کچھ ڈر لگا۔ ''ماں'' اس نے بڑی زخمی سی آواز میں پکارا۔

''کیا ہے؟''

امجد نے اپنا سر ماں سے ٹکا لیا اور ٹانگیں پسار دیں۔ ماں سے کچھ پوچھنے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔

آنگن میں خاموشی کا راج تھا۔

پانچ منٹ بعد دریا بی بی بولی۔ ''نیند تو نہیں آ رہی، تم کو؟''

''نہیں، ماں''

MashalBooks.org

''دیکھو، ابا جاگ رہے ہیں تمہارے؟'' وہ سرگوشی میں بولی۔

''ابا'' امجد نے آواز دی۔

''کیا ہے؟''

''جاگ رہے ہو آپ؟''

''ہوں''

دریابی بی ان کی بات چیت سنتی رہی۔

''پوچھو، کیا وہ شمولیا گئے تھے؟''

''نہیں'' اظہر نے جواب دیا۔

اب دریابی بی نے خود میاں سے کہا ''ان میمنوں کا کچھ کرو۔ کچھ دنوں میں جنگلی ہو جائیں گے۔''

''جانوروں کا ڈاکٹر لے آؤ۔''

''کیوں ہو جائیں گے جنگلی؟ اچھے بھلے تگڑے میمنے ہیں یہ تو۔''

''کھیتوں سے ہی سودا مت کر دینا ان کا۔ ایک دو بیوپاری پوچھ رہے تھے انہیں۔''

''نہیں''

''اس کی آواز سپاٹ تھی۔ وہ تمباکو کے سرور میں جھوم رہا تھا۔

دریابی بی نے دیکھا نعیمہ اونگھ رہی تھی۔ میمنے ابھی تک آنگن میں کدک رہے تھے۔

امجد کا جی ان میں لگا تھا۔ لیکن ماں کا ڈر تھا۔ اس نے ایک چور نظر ماں پر ڈالی۔ وہ کچھ دیر اور ان کے ساتھ کھیل سکتا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹ سکیڑ لئے۔

میمنوں کی طرف سے ذرا دھیان بٹا تو دونوں پلک جھپکتے ہی آنگن کے پرلے سرے پر جا کھڑے ہوئے۔ ایک لال سے جانور کا سایہ نظر آیا اور ہر ایک اچانک زور سے ممیانے کی آواز سے چونک پڑا۔

گھبرایا ہوا اظہر چلایا۔ ''لومڑی لومڑی''

اپنی پوری قوت سے اس نے گاؤں کے کتوں کو بلانے کی کوشش کی۔ ایک میمنا اپنی ماں کے پاس بھاگا۔

MashalBooks.org

دریابی بی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک پل میں کیا ہو گیا۔

گاؤں کے دو کتے دوڑتے آئے۔ ادھر ادھر کئی دفعہ سونگھا اور پھر جنگل کی طرف غائب ہو گئے۔

''لومڑ ایک میمنے کو لے گیا؟'' دریابی بی چیخی۔

''مجھے لاٹھی دو ذرا، میں جا کر تالاب کے آس پاس دیکھتا ہوں''

بانس کی ایک لاٹھی زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اظہر اندھیرے میں گم ہو گیا۔

دریابی بی دیا لئے آنگن میں گے خون کے چند قطرے دیکھتی رہی۔ بچے بھی اس کے ساتھ آ ملے۔

دریابی بی جھنجھلائی ہوئی تھی۔ ''ٹھہر جاؤ یہاں سے، تم لوگ کیا گھور رہے ہو؟''

لومڑ کے باپ دادا کو کوستی وہ بڑبڑاتی رہی۔ جو میمنا ماں کے پاس آ گیا تھا وہ دبلا پتلا تھا۔ دریابی بی کو اسکا افسوس تھا کہ کم بخت لومڑ کی بدنظر اچھے والے کو لگی۔

اظہر پلٹا اور بولا۔ ''ہر طرف ڈھونڈھ آیا۔ ذرا سا میمنا تھا۔ لومڑ اسے منہ میں دبائے ہی بھاگ گیا ہوگا۔''

''ساری محنت اکارت گئی۔'' دریابی بی بولی ''اگلے برس تک وہ چار پانچ روپیہ میں چلا جاتا۔''

نعیمہ کھڑی روتی رہی۔ دریابی بی نے مڑ کر دیکھا تک نہیں۔

''یہ سب ان دونوں کی وجہ سے ہوا۔ روز میں انہیں جلدی سلا دیتی ہوں آج کھیل رہے تھے میں نے سوچا چلو تھوڑی دیر کھیلنے دوں۔''

دریابی بی ان سب امکانات کا ذکر کرتی رہی جو خیال میں آ سکتے تھے۔ اور تھکا ہارا اظہر ایک بار پھر اپنا حقہ لے کر بیٹھ گیا۔

ایک ذرا سا میمنا ہی تو تھا، لیکن ہر کسی کا دل اداس تھا۔ کھانا اور دیر کو ٹل گیا۔ دریا بی بی کا مزاج بگڑا ہوا تھا۔ امجد تک نے رات کے کھانے کے متعلق کچھ نہ پوچھا۔ نعیمہ تو اکثر بے کھائے ہی سوتی تھی اس رات بھی شاید وہ ایسے ہی سو جاتی۔

بکری نے ممیانا شروع کر دیا۔ دریابی بی نے اسے بھوسہ کھلایا۔ وہ بہت اداس

MashalBooks.org

تھی۔جھکی ہوئی پلکوں میں اس کی آنکھیں چھپ گئی تھیں۔

امجد ایک لفظ کہے بغیر ماں کے آس پاس منڈلاتا رہا۔اس میں کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔اس نے جمائی لی اور ترس بھری آنکھوں سے ماں کو دیکھا۔

''نیند آرہی ہے؟ آؤ تمہیں کھانا دے دوں۔''

اظہر خان کو تسلی کا ایک سبب مل گیا۔''الحمدللہ، دونوں میمنوں کو نہیں لے گیا۔''

''تمہاری زبان مبارک ہو'' دریا بی بی نے کہا۔اس کی آواز میں طنز کی کاٹ تھی۔

اظہر کو غصہ آ گیا اور پھر اس نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔

تھکن کے باوجود دریا بی بی کو نیند نہ آپائی۔اظہر تھوڑی دیر بعد سو گیا۔دریا بی بی کے دھیان سے یہ بات نہیں اتر پائی کہ میمنے کو لومڑ نے کس طرح ہڑپ کر لیا۔ساری محنت اکارت ہوگئی۔دو برس سے گائے کی دیکھ بھال کر رہے ہیں،مگر وہ ابھی تک گابھن نہیں ہوتی تھی۔اگر کہیں وہ کھیت سے کسی دن چوری ہو جائے تو وہ کیا کرے گی؟دریا بی بی فکروں کا جال بنتی رہی۔اور اس نے اتھاہ آفتوں میں خود کو جی بھر کے ڈوبنے دیا۔

نعیمہ نیند میں کسمسا رہی تھی۔اس کے الٹی کہنی دریا بی بی کے سینہ سے آ ٹکی۔کوئی اور دن ہوتا تو دریا بی بی ملائمت سے اس کا ہاتھ ہٹا دیتی۔آج اس نے ننھی سی کہنی کو زور سے پرے کیا۔اس کے پاس کسی کے لیے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔اظہر جانور کی طرح سو رہا تھا۔دریا بی بی بستر کے سرے تک سرک گئی۔انجانے میں وہ نعیمہ کی کہنی تھپکتی رہی۔بچی جاگی نہیں تھی۔

امجد عاشق جان کی کوٹھڑی میں سونے چلا گیا تھا۔غریبوں کے بچے جلدی بڑے کیوں نہیں ہو جاتے؟ اس سے مصیبتیں شاید جلدی ختم ہوسکیں؟امجد مکتب سے کب فارغ ہوگا؟ گو پڑھائی مکمل کرنے پر بھی پریشانیاں ختم نہیں ہونگی۔پاس میں کوئی سکینڈری اسکول نہ تھا۔کیا ذرا سا بچہ علم حاصل کرنے لئے چار میل پیدل جایا کرے گا؟نعیمہ کو تو صرف بڑھنا ہی ہے۔غریب کی بیٹی کے لئے اس سے بڑا اور کیا خطرہ ہوسکتا ہے؟ بیاہ کے لائق ہونے سے پہلے اس کے ہاتھ پیلے کرنے میں بڑی مشکل ہوگی۔دریا بی بی دہشت کے سینکڑوں کے ہیولے بناتی اور ڈھاتی رہی۔

اور باہر اندھیرے کا راج تھا۔دریا بی بی اٹھ کر بیٹھ گئی۔امجد ٹھیک سے سو رہا ہے؟

MashalBooks.org

وہ پرے لیٹ گئی۔ اندھیرے میں دکھوں کا کوئی مرہم نہیں سوائے اس کے کہ آدمی اپنی یادوں کی جگالی کرتا رہے۔

یونہی اسے اپنے پہلے شوہر کا خیال آ گیا۔ صرف پہلا شوہر ہی نہیں بلکہ مناظر بھی، کیا وہ مناظر کو بھلا بیٹھی؟ مناظر حسین خان۔ اس کے شوہر نے بیٹے کے لیے بڑا سا نام چنا تھا۔

عقیقہ کے وقت اسے یہ نام اچھا نہیں لگا تھا لیکن بعد میں اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ اس کی تھکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کیا مناظر چچا کے گھر پیار محبت سے پالا جا رہا ہے؟ اس کا اپنا بیٹا، پھر بھی اس کا کوئی حق نہ تھا اس پر۔

وہ ایک کھاتے پیتے کسان کی بہو تھی۔ تین ہل چلتے تھے ان کے۔ لگان کے بغیر زمین کا کوئی ٹکڑا نہیں تھا۔ تنگی انہوں نے جانی نہ تھی۔ اس بڑے سے کنبے میں کام کی تھاہ نہ تھی۔ مگر دن ڈھلتے ہی آرام میں بھی مزہ آتا تھا۔ دریا بی بی کے روبرو اس کے جوان شوہر کا چہرہ اندھیرے میں بھی دمکتا۔ گھر بنانے کے کیسے کیسے خواب وہ دیکھتی تھی اور اب آنے والے دن اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھے۔

''کوئی شکایت ہے، دریا''

''نہ تو''

''ایک کسان کے گھر میں کافی گڑ بڑ ہوتی ہے''

''وہ سب ٹھیک ہے۔''

''یہ لڑکا بہت سوتا ہے۔ ہے نا؟''

''جب بھوک لگتی ہے تو روتا ہے۔ ورنہ اپنے باپ کی طرح سوتا رہتا ہے۔ کوئی بات اسے نہیں جگا سکتی۔'' اندھیرے میں ہنسی پھوٹ پڑتی۔

''بڑا ہونے دو اسے، میں اسے پڑھنے شہر بھیجوں گا۔ بس بڑا ہونے دو اسے، مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔ میں اس کے لیے دن رات دعا کرتا ہوں۔''

''شہر تو مہنگے بہت ہیں۔''

''تو کیا ہوا؟ ہم یہاں کے خرچے کم کر لیں گے۔''

تین برس کی جان کے لیے ایسے ایسے خواب۔

MashalBooks.org

''مشکل یہ ہے کہ میری بھابی سے تمہاری نہیں بنتی۔''

''کمینی ہے وہ تو۔ میں سارا دن کام کروں اور وہ ماں سے یہ لگائے کہ میں تو سارا دن ایسے اینڈتی رہتی ہوں جیسے گھڑے پر مورتیں۔''

''کرنے دو اسے شکایتیں۔لڑنا بھڑنا اچھا نہیں ہوتا۔''

اس کے شوہر کی آواز اندھیرے میں ابھی بھی گونج رہی تھی۔ وہ رات بھی۔صبح کو وہ ہاٹ گیا۔گھر لوٹنے میں سانپ نے اسے ڈس لیا۔گھر بھی نہ پہنچ پایا گاؤں کے بازار میں ہی دم دے دیا۔

مناظر کو چھاتی سے لگائے اس نے دکھ سہنا سیکھ لیا۔

اس کا سسر زندہ تھا۔ پوتے سے اس کی محبت ایک سہارا تھی۔مگر اس نے ایک غلطی کی۔جس کی قیمت دریا بی بی آج تک ادا کر رہی تھی۔ اگر اس کی ساس زندہ ہوتی تو کوئی بات ہی نہ ہوتی۔اس کا سسر دو مہینے بعد بیٹے کے پیچھے ہولیا۔ایک سال بعد دریا بی بی کو پتہ چلا کہ بنجر زمین پر وہ اکیلی اور بے سہارا رہ گئی ہے۔ جائیداد بھائیوں میں بٹی اور اسے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ ملی۔اس کا شوہر سسر کی زندگی میں ہی ختم ہو گیا تھا۔شرع کے مطابق اس کا اور مناظر کا سسر کی جائیداد پر کوئی حق نہ تھا۔دریا بی بی نے سب کے ہاتھ پیر جوڑے۔مناظر کیا کرے گا؟انہوں نے ذرا دھیان نہ دھرا۔ دریا بی بی نے اپنے سسر کی لاعلمی پر ہزاروں لعنتیں بھیجیں۔اگر وہ اپنے جیتے جی جائیداد بانٹ دیتا تو وہ سڑکوں پر یوں بھیک مانگنے کو نہ رہ جاتی۔

دریا بی بی اپنی سسرال سے چلی آئی۔اسے غلامی کی زندگی منظور نہ تھی۔اس کے سسرال والے اس سے اچھوتوں کا سا سلوک کرنے لگے تھے۔ایک دن دھواں دھار لڑائی کے بعد وہ بیٹے کو لے کر میاں کا گھر چھوڑنے کو تیار ہو گئی۔ اسے پالکی کی کیا ضرورت تھی۔جس کے گھر کا گھر وا ہو گیا اسے سونے کو فرش ہی بہت تھا۔

مناظر کو کولھے پر اٹھائے وہ نکلی۔

میاں کا ایک بھائی پیچھے دوڑتا آیا'' کچھ خیال کرو، بھابی۔تم ہماری عزت کو بٹہ لگا رہی ہو۔''

''عزت؟'' وہ عزت کو کیا جانیں جو انصاف کرنا نہیں جانتے؟''

''تم یہاں رہ سکتی ہو۔ کون نکال رہا ہے تمہیں؟''

اس طرح رہنا ہو گا مجھے یہاں؟ تمہاری بیویوں کی لونڈی بن کر؟ اس سے تو بھوکوں مرنا بہتر ہے۔''

''تم یہاں بھوکی نہیں رہو گی۔''

''مجھے خیرات نہیں چاہئے۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ کیا میرا حق مل سکتا ہے یہاں؟''

''ہم نے وہ کیا ہے جو قرآنِ پاک بتلاتا ہے۔ پھر ہم پر الزام کیوں؟ باپ کی زندگی میں اگر بیٹا مر جائے تو اس کے وارثوں کا جائیداد میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔''

''اب مجھے حدیثیں مت سناؤ۔ کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ بتایا ہے کہ تم اس کے بندوں کو بھک منگا کر دو؟''

''لڑکا دے دو ہمیں؟''

''نوکر کم پڑ گئے کیا؟''

''بڑی بھابی کے کوئی بچہ نہیں وہ پالے گی اسے۔''

''دیکھ بھال تو ہمیں ہی کرنا پڑے گی۔ اتنا سا بچہ کیا خاک نوکری کرے گا۔''

انہوں نے مناظر کو چھین لیا۔ دریا بی بی نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اچھا ہے سب رشتے ناطے ختم ہو جائیں۔ جیسے واقعی اسے کسی بات کا ملال نہ ہو۔

''گھر کی عزت'' دریا بی بی سارا دن اونٹنی رہی۔

وہ ان کی عزت خاک میں ملانے کو کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے گی۔ پانچ مہینہ بعد اس نے رنڈوے اظہر سے بیاہ کر لیا۔

دریا بی بی اپنے پچھلے دنوں سے آنکھیں نہیں پھیر پا رہی تھی۔ جیسے وہ پھن لہلا لہلا کر اسے زہریلی نظروں سے دیکھتے ہوں۔ کتنے چہرے یادوں میں بہتے چلے آئے..... جاوید حسین..... احد حسین..... مناظر۔ مناظر کے ماتھے پر ایک پیدائشی نشان تھا۔ کیا ان لوگوں نے پیار کر کر کے ماتھے کا وہ گول نشان مٹا ڈالا ہے؟ دور کہیں جلتے گھاٹ پر مردے جلانے والے

MashalBooks.org

ہوشیار تھے۔ اندھیرے میں جیسے قہقہوں کی گونج تھی۔

دریابی بی نے آنسوؤں میں بھیگے ہونٹ نعیمہ کے ننھے چہرے پر رکھ دیئے۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔

دریابی بی کو ایک مہربان روح کی تلاش تھی جو آئے روز اس کا ساتھ نہ چھوڑ دے۔

MashalBooks.org

پانچواں باب

دو چار دن بعد دریا بی بی عاشق جان کی کوٹھڑی میں گئی تو دیکھا کہ بڑھیا خیرات میں ملی دونوں ساریاں تھامے چپ چاپ بیٹھی ہے۔ دریا بی بی اتنے چپکے سے اندر چلی آئی تھی کہ بیچاری بڑھیا کو خبر ہی نہ ہوئی۔ ''خالہ'' سنتے ہی وہ سٹپٹا گئی اور کپڑوں کو اپنی ساری کے نیچے اس طرح چھپا لیا جیسے چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی۔ دریا بی بی بولی ''خالہ مجھے ان میں سے ایک ساری دے دو۔ میں تمہیں دام پھر دے دونگی۔''

یہ بات تو بڑھیا کے اطمینان کے لئے کہی گئی تھی۔ دریا بی بی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ چھ مہینے تک پیسے نہیں دے سکے گی۔

پوپلے منہ کی مسکراہٹ کے ساتھ بڑھیا نے کپڑے ٹٹول کر باہر نکال دیئے۔

''اچھی والی لے لو، بیٹا۔ وہ جس کا کپڑا اچھا ہے۔''

دریا بی بی چٹائی پر بیٹھ گئی۔

''تم ٹھیک تو ہو، خالہ؟''

عاشق جان نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''نہیں بیٹا، کئی دنوں سے سر درد سے پھٹا جا رہا ہے، ڈھنگ سے دکھائی بھی نہیں دیتا۔''

دریا بی بی کو پچھتاوا ہوا۔ یہ احساس کہ اس کی زیادتی سے ایسا ہوا اسے دکھی کر گیا۔

''باہر دالان میں آ جاؤ۔ میں ٹھنڈے پانی سے تمہارا سر دھلاتی ہوں۔ آج کہیں بازار واہر مت جانا۔''

''ساتھ کے گاؤں کا آج بلاوا ہے۔ دوپہر تک میں جانے کی کوشش کروں گی۔''

''کاہے کا بلاوا؟''

MashalBooks.org

''جلیل شیخ کے یہاں۔آج اس کے بیٹے کا چالیسواں ہے۔''

دریا بی بی کو پتہ تھا کہ جلیل شیخ کا جوان کماؤ بیٹا ملیریا سے مر گیا تھا۔ اسے اس کا چہرہ یاد آیا اور بولی ''بیچارا لڑکا۔''

''وہ ڈھیروں لوگوں کو کھانا کھلائیں گے۔ کیا میں امجد کو ساتھ لے جاؤں؟''

دریا بی بی کو ایسے لگا جیسے کسی نے اس کا سارا وجود کانٹوں سے لہولہان کر دیا ہو۔ لیکن اس کے چہرے پر غصہ یا خفگی کے کوئی آثار نہ تھے۔

وہ دھیرے سے بولی۔''نہیں خالہ،وہ جا کر کیا کرے گا؟تم بھی نہیں جاؤ گی۔آج تم ہمارے ساتھ کھانا۔''

عاشق جان کو گاؤں سے اکثر ایسے بلاوے آتے تھے۔ امیروں کے گھروں میں طرح طرح کے مزیدار کھانے کھلائے جاتے۔ عاشق جان صرف اپنا ہی پیٹ نیں بھرتی تھی۔ کبھی کبھی امجد اور نعیمہ کے لیے وہ ساتھ بھی لے آتی۔ جسے وہ دونوں اسکی کوٹھڑی میں چھپ کر کھاتے۔ایک دو دفعہ وہ دونوں پکڑے بھی گئے اور عاشق جان کو بہت کچھ برا بھلا سننا پڑا۔

چالیسویں کا کھانا گھر لے آنے میں عاشق جان کو کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوتی۔ دریا بی بی احتیاط کے مارے ان سب باتوں کو بدشگونی سمجھتی۔لیکن آج اس بات پر کوئی جھگڑا کھڑا نہ ہوا۔جلیل شیخ پٹ سن کا بیوپاری تھا۔اس کی اپنی تین چار بڑی کشتیاں تھیں۔امیر تھا وہ۔اس کے گھر فاتحہ کے اہتمام کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ عاشق جان کی نیت ڈانواں ڈول تھی لیکن وہ دریا بی بی سے ڈرتی تھی اس لئے وہ چپ رہی۔لیکن اس کا تصور اسے لالچ دلا رہا تھا۔ دریا بی بی نے کوٹھڑی کے ملگجے اندھیرے میں دونوں ساڑیوں کو دیکھا بھالا۔''میں وہ ساڑی لئے لیتی ہوں۔جس کی پتلی لال کناری ہے۔'' وہ بولی۔

''اچھا اچھا یہ چیزیں اب مجھے سجتی نہیں بیٹا، مجھے تو اب بس سفید کفن چاہئے کہ لپیٹ کر قبر میں اتر جاؤں،''

''بری بات،صبح صبح تم کوئی اچھی بات نہیں کر سکتیں؟ آؤ، میں تمہارا سر دھلا دوں اچھی طرح۔''

دونوں دالان میں آ گئیں دریا بی بی ایک برتن میں پانی لے آئی اور اس نے بڑھیا

MashalBooks.org

کے سن سے سفید بالوں پر انڈیل دیا۔

''اب یہاں چپکی بیٹھی رہو۔ میں تین چار بدھنے پانی کے اور لاتی ہوں۔''

''جیسے تم کہو، دو بوند تیل بھی ڈال دو، دریا بو۔''

دریا بی بی نے انگلیوں سے بڑھیا کا سر سہلایا اور بدھنے سے پانی ڈالتی رہی۔ عاشق جان کا بدن جیسے ہلکا ہو گیا۔ دریا بی بی ناریل کا تیل لے آئی اور اچھی طرح سے بڑھیا کے بالوں کی جڑوں میں ڈال دیا۔

''خالہ فکروں سے میرا دل جلتا ہے۔ مجھ سے غصہ نہیں برداشت ہوتا۔ مجھے پتہ نہیں چلتا کہ میں کس سے کیا کہہ دیتی ہوں۔''

''میری طبیعت اب کہیں بہتر ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ برکت دے۔''

تیل ڈالنے کے بہانے دریا بی بی نے عاشق جان کی چمچی کی۔ چٹائی پر رکھی ساڑی دریا بی بی کا من موہ رہی تھی۔

''ہانڈی چڑھا دی تم نے، دریا بو؟''

''جی، آج اموکا پیٹ کچھ خراب تھا۔ میں نے رات کے باسی چاول اسے کھانے کو نہیں دیئے۔ مکتب سے واپس آئے گا تو تازہ چاول کھائے گا۔''

اسی وقت امجد کی آواز سنائی دی۔ وہ دور سے چلا رہا تھا ''ماں ماں''

دریا بی بی کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ آگے بڑھنے کو ہی تھی کہ امجد سامنے آنگن میں آ گیا۔

''ماں''

ایک ہاتھ اوپر اٹھائے وہ پھر چلایا۔ ''ماں''

دریا بی بی کی آنکھوں میں دھوپ پڑ رہی تھی، امجد اسے ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''چھت اڑا دو گے چلا چلا کے؟ کیا ہے؟''

''یہاں آ کر دیکھو۔''

ہاتھ اٹھا کر امجد نے ناچنا شروع کر دیا۔

MashalBooks.org

جب وہ پاس آیا تو دریا بی بی نے دیکھا کہ امجد کے ہاتھ میں دس بارہ جھینگے تھے۔ ان کی پتلی پتلی لال ٹانگیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔

مسکراہٹ دریا بی بی کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

''کہاں سے ملے یہ تم کو؟''

''بتادونگا۔'' ایک ہی چھلانگ میں وہ دالان تک پہنچ گیا۔''چندر کا کا لے کر آئے تھے۔ وہ مکتب گئے تھے۔جبھی تو مولوی صاحب نے مجھے جلدی چھٹی دے دی۔''

''بڑے بڑے جھینگے ہیں یہ، ہیں نا''

ایک بڑے سے جھینگے کو ہاتھ میں لے کر امجد نے کہا۔''یہ میرا ہے۔کیسا لال لال گودا ہے اس کا۔''

دریا بی بی کی خوشی بھی چھپی نہیں رہی۔ وہ اپنے بچوں کو کوئی اچھی چیز کہاں کھلا سکتے تھے۔

''خالہ یہ تو تمہارے لئے بھی اچھے ہیں میں ڈر رہی تھی کہیں کھانا کم نہ پڑ جائے۔''

ابھی تک عاشق جان کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

''کیا ہے یہ، دریا بو؟''

''امو جھینگے لایا ہے۔آج ہم خوب اچھا کھانا کائیں گے۔ چندر کوتل نے دیئے ہیں اس کو۔''

ماں کو جھینگے دیتے ہوئے امجد نے کہا'' کچھ پان دے دو گی۔ ماں چندر کا کا باہر والے گھر میں ہیں۔''

''پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' دریا بی بی جلدی سے اپنی کوٹھڑی میں گئی۔ اتنی دیر میں عاشق جان امجد سے ایک ایک بات پوچھتی رہی۔

''یہ لو'' دریا بی بی پان لے کر آئی''تمہارے کا کا حقہ پیتے ہیں۔''

حقہ پیتے ہیں؟ وہ تمباکو کے سارے کھیت پی جائیں۔'' دریا بی بی تمباکو لینے دوڑی۔

چندر کوتل باہر والے مکان میں بھوسے کے ایک گٹھڑ پر بیٹھا تھا اور اپنے کام میں

مصروف تھا۔ دریا بی بی نے اسے پان کا پورا پتہ، چھالیہ کی ڈلی اور چونا بھیجا تھا۔ وہ پان بنانے میں لگ گیا۔

چندر ایک چھوٹی سی دھوتی باندھے تھا۔ کمر میں درانتی اڑسی ہوئی تھی۔ اپنے لیے پان بناتے ہوئے وہ بولا ''ابا کہاں ہے تمہارا، بیٹا۔''

''یہیں کہیں گاؤں میں ہوں گے۔ وہ کہیں اور تو نہیں گئے۔''

مجھے ان سے کچھ پوچھنا تھا۔''

''ان کا انتظار کرلو، کاکا۔''

چندر کوتل نے اپنے اردگرد دیکھا۔ وہ یہاں دوچار دفعہ ہی آیا تھا۔ برسات میں اس کی مچھلیاں دریا کے گھاٹ پر ہی بک جاتی تھیں اسے گاؤں نہیں آنا پڑتا تھا۔

غیروں کو کسی کونے کھدرے سے چھپ کر دیکھنا عورتوں کے لیے عام بات تھی۔ چندر کا اندازہ صحیح تھا۔ پچھلے دروازے کے پاس گھونگھٹ کی جھلک سے لگا کہ امجد کی ماں آئی ہے۔

پان منہ میں رکھے ہوئے اس نے ذرا زور سے کہا ''تمہاری ماں مجھے بھی کھانا کھلائے گی؟''

امجد اندر جانے کو تھا مگر دریا بی بی وہیں پیچھے کھڑی تھی۔ اس نے اشارے سے بیٹے کو بلایا۔

ماں کے پاس کھڑے امجد نے زور سے پوچھا ''کیا ایک غریب آدمی کے لیے گھر میں کچھ دال بھات ہے؟''

چندر کوتل اور بھی زور سے بولا ''دال بھات سے کام نہیں چلے گا۔ چندر کوتل تو روز ایک گھوڑا ذبح کرتا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ خوش دلی سے اتنی زور سے ہنسا کہ باہر والا مکان گونج اٹھا۔

''بیٹے، اپنی ماں سے کہو، کھانے سے پہلے ہمیں تھوڑی سی تمباکو اور دے دیں۔ نشہ اتر گیا ہے۔''

پانچ منٹ بعد امجد حقہ لے آیا۔ چلم میں دہکتے انگارے بھرے ہوئے تھے۔ امجد

MashalBooks.org

کے ننھے ہاتھوں کو وہ بہت گرم لگ رہی تھی۔

''جلدی سے دے دو مجھے۔''

دونوں ہاتھوں میں حقہ پکڑ کر چندر کش لیتا رہا۔ دھوئیں کے مارے اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ امجد نے حیرت سے اس آدمی کو دیکھا۔ اسے ہنسی روکنا مشکل ہوگیا۔

ذرا دیر بعد چندر نے آنکھیں کھول دیں۔

نیم کے دو پیڑ ہوا میں جھول رہے تھے۔ ناریل کے ایک پیڑ پر اس کی ساری توجہ تھی۔ تازہ کونپلیں اس پر پھوٹ رہی تھیں۔

حقہ زمین پر رکھتے ہوئے چندر نے پوچھا ''یہ ناریل کا پیڑ تمہارا ہے بیٹے۔''

امجد نے سر ہلایا۔

''کیسی اچھی کونپلیں ہیں؟ بانس کے پیڑ ہیں تمہارے؟''

''بہت سے، دو جھنڈوں میں پچاس۔ ابا نے اگلے دن ہی گنے تھے۔''

''تم اس پیڑ سے بہت سی میٹھی تاڑی بنا سکتے ہو۔ بیٹے، مگر تمہارے باپ کو ان باتوں کا کیا پتہ۔ تاڑ پہ چڑھ کے پیڑ پہ ہنڈیا باندھنے میں کیا مزہ آتا ہے۔ لیکن تمہارا ابا.....''

چندر نے مایوسی سے سر ہلایا۔

''مگر تاڑی پینا ہمارے لئے جائز نہیں۔'' امجد نے کہا۔

مونچھیں مروڑتے ہوئے چندر نے ہو، کی آواز نکالی۔

''بڑے ہوکر پینے میں کوئی ہرج نہیں۔ مگر تمہارا ابا تو ایک پکا.....''

امجد نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔

چندر نے حقہ اٹھایا لاور یونہی کش لگانا شروع کر دیئے۔ دھواں امجد کی آنکھوں میں لگا، اور اس نے بدمزہ ہوکر آنکھیں بند کرلیں۔

''تمہارا باپ.....''

امجد نے آنکھیں کھول دیں۔

''تمہارا ابا آج نہیں آئے گا۔''

امجد نے یہ بات نہیں مانی۔ اپنی بھولی آواز میں بولا۔ ''ابا اب کہیں دور نہیں جائیں

گے۔وہ یہیں کہیں گاؤں میں گئے ہیں۔جلدی لوٹ آئیں گے۔''

چندر کو تل سیٹی بجاتا اور گنگناتا رہا۔ کہتے ہیں کہ بھانڈوں کی ٹولی میں اس کا مسخرہ پن دیکھ کر لوگ ہنستے ہنستے بے دم ہو جاتے تھے۔

چندر گنگناتا رہا۔

امجد کا پوچھنے کو جی چاہ رہا تھا لیکن اسے اس آدمی سے ڈر لگتا تھا۔ وہ چپکا بیٹھا اس کی حرکتیں دیکھتا رہا۔

''بیٹا''

''جی کاکا'' امجد چوکنا ہو کر بولا۔

''تمہیں یقین ہے، تمہارا باپ گھر چھوڑ کر نہیں گیا۔؟''

''ہاں، میں بتا تو رہا ہوں وہ کہیں دور پار نہیں گئے۔''

''پھر میں تھوڑا اور انتظار کروں گا۔ جاؤ چلم پھر سے بھر لاؤ۔''

کچھ کہے بغیر امجد چلا گیا اور جلد پلٹ آیا۔

چندر خوش ہو گیا۔ امجد اس کے لیے پان چھالیہ بھی لایا تھا۔

جب اظہر پہنچا ہے چندر آنکھیں بند کئے حقہ کے کش لے رہا تھا۔ اسے اظہر کے آنے کا پتہ ہی نہ چلا۔

امجد خوشی سے چلایا ''یہ لو ابا آ گئے''

''آیئے آیئے، خان صاحب۔''

چندر آج بہت ادب آداب برتنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ تعظیماً کھڑا ہو گیا۔

اظہر ہنسنے لگا۔

''یہ کیا معاملہ ہے، چندر''

''بھگوان جانتا ہے میں یہاں کب سے انتظار کر رہا ہوں۔ گولر کے پھول کا کوئی نشان ہی نہیں۔''

اظہر نے چندر سے حقہ لے لیا اور کش لینے لگا۔

''گھر بیٹھے تو کچھ نہیں بنے گا۔ روزی کی خاطر کام کی فکر میں گھومتا رہا ہوں۔''

MashalBooks.org

''کہاں گئے تھے آپ؟ میں جان سکتا ہوں''

''زمیندار خان صاحب کے گھر۔ حاتم بخش اپنے لیے ایک مقبرہ بنوانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے حساب کتاب لگانے کو بلایا تھا۔''

''اچھا تو وہ مرنے کو ہے''

زمیندار کی پیٹھ اظہر کو اس طرح کی گستاخی کی باتیں اچھی نہیں لگیں۔

''کیا مطلب ہے تمہارا۔ کچھ تو عزت سے بات کیا کرو۔''

بناوٹی شرمندگی کے لہجے میں چندر بولا۔''وہاں وہ حضرت بزرگ ہیں۔ چھپن برس ہوگی ان کی عمر عزیز میں بے تمیزی نہیں کرونگا۔ تو کیا جناب ولا واقعی مرنے کو ہیں؟''

''مذاق مت کرو۔ سب کو مرنا ہے۔ مجھے بھی''

پھر تم اپنے لیے بھی ایک قبر کھودلو۔''

اظہر نے ٹھنڈی آہ بھری۔ اس کے ایسے نصیب کہاں۔

''وہ بہت پیسے خرچ کرنا چاہتے ہیں۔ مقبرے کے تین طرف اینٹیں اور ایک طرف سفید سنگ مرمر۔''

یقیناً وہ بہت پیسے خرچ کرے گا۔ ہمیں جینے کے خرچے مار ڈالتے ہیں اور ان کا مرنا بھی ہمارے خرچے پانی کا بہانہ ہو جاتا ہے۔''

اتنی بڑی بڑی باتیں اظہر کے بھیجے میں نہیں آتی تھیں۔ اس نے بے سمجھے کہا۔

''دو ہزار روے خرچ کریں گے وہ۔ پھر اس کے گرد پھلواری کیاری لگے گی۔ ایک ہزار اور اس کے بھی ہوئے۔''

چندر حیران رہ گیا۔

اس نے سیانے پن سے جواب دیا۔''مجھے تو بس ایک من لکڑی چاہیے۔ بس دریا کا کنارا اور ایک ماچس کی تیلی۔ اگر میری موت اچانک ہو جائے۔ تو بھی کوئی خرچہ نہیں۔ ہمارے رشتہ دار مدد کو ہاتھ بڑھا دیں گے۔''

''اچھا یہ بے ہودہ باتیں بند کرو۔ مچھلی پکڑنے کا کیا حال ہے آج کل؟''

''اسی لیے تو میں آیا تھا۔ یہاں ۔مچھلی پکڑنے سے کیا بھلا ہوتا ہے؟ اس دفعہ

MashalBooks.org

پیداوار اچھی ہوگی۔ مگر سب تھوک کا بیو پاری لے جائے گا۔ دیکھو ان کو۔ مچھلیاں پکڑتے ہم ہیں اور ہمارے پاس پیٹ بھر کھانے کو نہیں اور وہ محل بناتے ہیں۔''

''کرنا کیا چاہتے ہو تم؟'' اظہر نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہمیں کچھ پیسہ چاہیے۔ بھیا۔ پھر میں ریلوے اسٹیشن تک جا کر خود مچھلیاں بیچ سکتا ہوں۔ پانچ چھ سیر مچھلی لے کر منڈی جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر کچھ لوگ مل کر من دو من مچھلی پکڑیں تب ہی اچھا نفع مل سکتا ہے۔''

اظہر کے چہرے پر فکر کی ایک گہری لکیر کھنچ گئی۔

''پیسہ؟ پیسے کی بات کرتے ہو۔ یہ ہی تو مسئلہ ہے۔''

''زیادہ نہیں چاہئے ہمیں۔ پچاس روپے کافی ہوں گے۔ کچھ تم دے دو۔ چلو ہم تم حصہ دار بن کر کاروبار کر لیں۔''

''چندر کے لہجے میں بڑا جوش تھا۔

اظہر تھوڑی دیر کو بالکل چپ رہ گیا۔

''خان بھائی، کچھ کہا نہیں تم نے۔''

چندر نے ایک مشتبہ سی نظر اظہر پر ڈالی۔

''کیا کہوں میں؟ اگر میرے پاس پچیس تیس روپے ہوتے تو کیا میں یوں گم سم رہتا؟ ہماری حالت نہیں دیکھتے تم؟''

اب چندر بھی آہ بھر کر چپ ہو گیا۔

''میرا حال بھی ایسا ہی ہے۔''

''سوجھی کیا ہے تمہیں؟ اپنے فالتو وقت میں کھیتی باڑی کر کے، اور مچھلیاں پکڑ کے تمہارا ٹھیک ٹھاک گزارہ تو ہو جاتا ہے۔''

''اب نہیں ہو پائے گا۔ چندرامنی واپس آ گئی ہے۔''

چندرامنی، چندر کی چھوٹی بہن تھی۔

''کیا تمہارے پاس رہا کرے گی وہ؟''

میاں مر گیا اس کا۔ تین بچے ہیں''

MashalBooks.org

اظہر کو اس بات کی خبر نہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہمدردی تھی۔

''کیا ہوا؟''

''بخار''

''اوہ'' اتنا کہہ کر اظہر چپ ہو گیا۔

''خیر، کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا مجھے۔ ایک فالتو کمرہ بھی نہیں ہے جہاں رہ سکیں وہ۔ ان تھوڑے سے روپئوں سے ہم قسمت آزمائی کر سکتے ہیں۔ کیا تم کچھ کوشش نہیں کر سکتے کہیں سے لے لو۔''

''اتنے ڈھیر روپئوں کے لیے ہم پر بھروسہ کون کرے گا؟''

''کوشش تو کر کے دیکھو۔ مچھلیاں ہم پکڑتے ہیں۔ تھوک والے شہر لے جا کر پیسے بناتے ہیں۔ کیا سارے پیسے شہر کو ہی جائیں گے؟''

''لگتا کچھ ایسا ہی ہے۔''

چندر نے سر ہلایا۔''عجب گورکھ دھندا ہے۔ ہم کھیتی کریں، مچھلی پکڑنے میں اپنی جان گلا دیں۔ اور ہر چیز شہر کی طرف دوڑتی چلی جائے۔ ہمارے پاس نہ پیسے ہیں اور نہ کھانے کو۔''

اظہر کے پاس اس بات کو جواب تھا۔''کپڑا آتا ہے شہر سے اور بہت ساری دوسری چیزیں۔ کیا تمہیں نہیں پتہ؟'' گاؤں کی فصل پیداوار شہر جاتی ہے۔ اور شہر کی بنی ہوئی چیزیں گاؤں آتی ہیں۔''

کیا کام نہیں کرتے ہم؟ اگر دھان نہ بھیجیں ہم ان کو تو کیا کھائیں گے وہ شہر والے؟''

ناراض چندر کو دیکھتے ہوئے اظہر نے نرمی سے کہا''پھر تم ننگے گھوم پھر سکتے ہو؟''

''میں ننگا کیوں پھروں؟'' گاؤں کے جولاہے بنالیں گے کپڑا۔''

''وہ دن لا گئے۔ ابھی جو دو چار جولاہے باقی ہیں۔ ان کے کپڑے کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگاتا؟'' ان کی حالت نہیں دیکھتے تم۔؟'' یہ سب نصیبوں کی بات ہے۔''

چندر چپ ہو گیا۔ لیکن تھوک کا بیوپاری بن کر مچھلی بیچنے کا خواب اسکے ذہن سے

MashalBooks.org

ابھی مٹا نہیں تھا۔

''اب سب کچھ شہروں میں ہی ہے۔ ان بیوپاریوں کے پاس ہمارے زمینداروں سے زیادہ دولت ہے۔ طالب چودھری کو دیکھو لو ہے کے بیوپار میں کیسا پھل پھول رہا ہے۔ حاتم بخش کو دس دفعہ خرید لے وہ۔''

اظہر نے سر ہلا کر تائید کی۔ لیکن کچھ کہا نہیں۔

دونوں چپ تھے۔

امجد ان کی باتیں سن رہا تھا بیچ میں بولنے کی مجال نہ تھی۔

چندر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور بولا، اس بات کو سوچنا، خان بھائی، میں اب چلوں، بہت دیر ہوگئی۔''

چندر کوتل کی آواز میں مایوسی اور ناکامی تھی۔ اظہر نے کوئی جواب نہ دیا۔ امجد خاموش کھڑا تھا۔ چندر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا'' آؤ بیٹا، تم بدا کر کے آؤ مجھے۔''

گاؤں کی پگڈنڈی کے کنارے ایک تالاب میں ڈھیروں کنول کھلے ہوئے تھے۔ تھوڑے سے امجد کے ہاتھ پر رکھ کر چندر بولا'' گھر جاؤ اب، بہت گرمی ہے تمہارے لئے۔''

امجد گھر لوٹ گیا۔

چندر کھیتوں کے پار جا رہا تھا۔ سیٹی کی آواز سن کر امجد نے مڑ کر دیکھا، چندر سیٹی کی دھن پر مست پو قدم چل رہا تھا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔

MashalBooks.org

چھٹا باب

دوسرے دن سویرے اظہر اپنے پڑوسی اور رشتہ دار شاکر سے ملنے گیا۔ وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ کیلوں کے چھوٹے سے جھنڈ کے پار تو گھر تھا۔ شاکر ایک پیشہ ور لٹھ باز تھا۔ اور اسی نے خانوں کی سپاہیانہ آن کی لاج رکھی تھی۔ سخت اور کھردرا سا آدمی تھا وہ۔ اس کی بڑی بڑی گول آنکھیں، گھنی لمبی مونچھیں بچوں کے ڈرانے کو کافی تھیں۔ اظہر کا خیال تھا شاید اس کے پاس کچھ پیسے ہوں دو چار دن پہلے ہی وہ روہنی چودھری کی زمینوں سے قبضہ گیروں کو مار پیٹ کر بھگانے گیا تھا۔ زمینداروں کی مہربانی سے وہ اپنے سب پڑوسیوں سے زیادہ اچھے حال میں تھا۔ لڑنے کے لیے دور دور کے گاؤں سے اس کے لیے نیوتہ آتا۔

شاکر بہت لڑاکا ہوسکتا تھا لیکن اظہر کے سامنے وہ بھیگی بلی بنا رہتا اور بہت رسان سے بات کرتا۔ اظہر کا خیال تھا شاکر اس کی عزت کرتا ہے۔ آج تک وہ اس سے کبھی ادھار مانگنے نہیں آیا، تو شاید آج وہ اسے خالی ہاتھ نہ لوٹائے۔

شاکر گھر پر نہ تھا۔ اس کی ماں نے دالان میں اظہر کے بیٹھنے کو چٹائی بچھائی اور کہنے لگی ''میری کوکھ میں کیسا جنم جلا پیدا ہوا۔ مجھ سے اب نہیں سہا جاتا میری سمجھ سے باہر ہے کہ اسے یہ لٹھ پونگا سیکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک پل چین نہیں ملتا مجھے۔ جب وہ لڑنے جاتا ہے تو بھات ہمارے گلے سے نہیں اترتا۔''

''کہاں گیا وہ، چاچی؟''

''میں نے اسے کل رات سے نہیں دیکھا۔''

اظہر نے بے چین ہو کر پوچھا ''لڑنے تو نہیں چلا گیا کہیں؟''

''نہیں، لاٹھی اس کی کوٹھڑی میں رکھی ہے۔'' وہ اپنی پیتل کی موٹھ والی لاٹھی کے بغیر کہیں نہیں جاتا۔ کہاں جائے گا وہ آخر۔''

اظہر چپ رہا۔ اسے مایوسی ہوئی اور چندر کی شکل اس کی آنکھوں میں بھر گئی۔

MashalBooks.org

شاکر کی ماں نے گھر بار کی باتیں کرنا شروع کر دیں۔

''جوان بیوی کا ڈر کے مارے دم نکلتا ہے۔ میں اس سے کہتی رہتی ہوں۔ اسے سمجھاؤ وہ کھیتی باڑی کرے۔ کچھ قابو میں رکھو میاں کو اپنے۔ مگر اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا دن رات بیٹھی روتی رہتی ہے بچے کے لیے۔ ابھی تو خود بچی ہے۔ کون سی عمر گزر گئی اس کی۔ ہے نا بیٹا؟''

جیسے کوئی نیند سے چونک پڑے۔ اس طرح اظہر بولا ''ارے نہیں۔ ہماری پاشوبی کا ابھی کیا سن ہے۔ بیس سے اوپر نہیں ہو سکتیں؟''

''وہ تو مری جا رہی ہے بچے کے لیے۔ جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈے سب کچھ تو کر کے دیکھ لیا میں نے۔ پچھلے دو چار مہینوں میں تو کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اب اگر یہ ہی لکھا ہے.....''

''سب اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے، چاچی، میرے تمہارے جیسے گناہگار کیا کر سکتے ہیں؟''

''نہ بیٹا، اللہ تعالیٰ نے بہت مہربانی کی ہے'' اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔''

''تمہیں خبر ہے وہ بدنصیب کی جنی کہتی کیا ہے؟''

اظہر نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''وہ کہتی ہے شاکر جیسے مرد اس وقت تک رام نہیں ہوتے جب تک وہ بچے کا منہ نہ دیکھ لیں۔ جس دن سے یہ لڑکا بڑا ہوا ہے۔ میرے دن رات کروٹیں بدلتے کٹتے ہیں۔ کیا مزہ ہے اس جینے میں۔''

اظہر کچھ کہے بغیر سنتا رہا۔ اس کی آنکھیں آنگن پر لگی ہوئی تھیں۔ اچانک، اسے اپنا منہ پھیرنا پڑا۔ شاکر کی بیوی کمر پر پانی کا مٹکا اٹھائے تالاب سے واپس آ رہی تھی۔ جیٹھ کو دیکھتے ہی، وہ ترئی کی بیل کے پیچھے ہو گئی اور منہ پر ساری کے پلو کا گھونگھٹ کھینچ لیا۔

اظہر کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ شاکر کی بیوی واقعی بہت کمسن تھی۔ اس کے چہرے پر بڑی بے بسی تھی۔ بھرپور جوانی میں بھی چہرے پر کوئی رونق نہ تھی۔ جیسے جوانی کی بہار بس ذرا چھو کر گزر گئی ہو۔

MashalBooks.org

آنگن میں دھوپ ابھی ترئی کی بیل سے نہیں اتری تھی۔ بیل کے اسارے سے دو چار تر ئیاں لٹک رہی تھیں۔ دس بارہ شاخیں سانپوں کی طرح بل کھائے ہوئے زمین سے چمٹی ہوئی تھیں۔ پاشو کی ساڑی پتوں میں سے کہیں کہیں سے دکھائی دے رہی تھی۔

اظہر کچھ بے چین سا تھا۔ ایک جوان عورت کے سامنے یوں بیٹھے رہنا کوئی قرینے کی بات نہ تھی۔ وہ اٹھنا چاہتا تھا مگر شاکر کی ماں کی باتیں رکنے میں ہی نہیں آ رہی تھیں۔

''اے بیٹا۔ اللہ تعالیٰ اس کی مراد پوری کرے۔''

''اللہ تعالیٰ فضل کرے گا۔ چاچی۔ بندہ کیا کہہ سکتا ہے۔ مجھے واپس کھیت پہنچنا ہے۔ اس سے زیادہ انتظار میں نہیں کر سکتا۔''

اظہر اٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹا پھر بھی آنا۔ دریا بو سے بھی کہنا کہ ہم سے ملنے آئے۔ مجھے اس سے کچھ کہنا بھی ہے۔''

''شاکر واپس آئے تو مجھے خبر کر دیجئے گا۔''

پگڈنڈی کے دونوں طرف بانسوں کے جھنڈ تھے۔ دھوپ اس وقت تک خاصی تیز ہو گئی تھی۔ لیکن چاروں طرف کی روشنی کے سامنے یہاں سایہ زیادہ گہرا معلوم ہوتا تھا۔ اظہر کے دل میں ہزاروں وسوسے تھے۔ اس کی ساری صبح برباد ہو گئی تھی۔

ایک دم ہی اس نے شاکر کی ماں کی کڑکتی آواز سنی۔ اس کے کان کھڑے ہوئے اور وہ چلتے چلتے رک گیا۔

''حرامزادی، اگر گھر میں پیسے نہیں تھے تو اس وقت کیوں نہ بتایا جب وہ گھر تھا۔ منہ کا چھید تیرے بند ہو گیا تھا کیا؟''

گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ اظہر کو علم تھا کہ بہو اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ لیکن آج اسے اس کا کچھ خیال نہ تھا۔ اسے اس بات کا رنج تھا کہ پیسے شاکر کے گھر میں بھی نہیں تھے۔

چندر کو یہ بات بتانا تھی ورنہ وہ آس لگائے بیٹھا رہتا۔ گاؤں میں کسی اور سے مانگنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ غفور خان کی دوکان قصبے میں پھل پھول رہی تھی۔ مگر اظہر

MashalBooks.org

دو برس پہلے لیا قرضہ ہی نہیں چکا پایا تھا۔ سو وہ دروازہ بھی بند ہی سمجھو۔ اظہر نے اپنے خوشحال پڑوسیوں پر نظر دوڑائی لیکن کسی میں بھی اتنا بوتا نہ تھا۔ دریا بی بی پہلی سسرال سے ایک جوڑی بندے ساتھ لائی تھی مگر وہ بھی پوڈھر کے پاس پچھلے برس نعیمہ اور امجد کی بیماری میں گروی رکھ دئے تھے۔

یہ اچنبھے کی بات نہ تھی اگر سیانا چندر بیوپار میں کامیاب ہوجاتا۔ اظہر کو اپنے مقدر کے تالے کی چھوٹی سی کنجی نہیں مل پا رہی تھی۔

بھاری دل سے کھیت کی طرف جاتے ہوئے اظہر اور ترکیبیں سوچتا رہا۔ اچانک ہی کہیں سے بادل گھر آئے اور سورج چھپ گیا۔ کسی گھڑی بھی بارش ہوسکتی تھی۔

وہ چندر کے گھر کے قریب تھا جب آندھی کے ساتھ مینہ پڑنا شروع ہوگیا۔ اظہر کو بھیگنے کا کچھ خیال نہ تھا۔ دوپہر کو اسے نہانا تو تھا ہی۔ وہ سیدھا دریا کی طرف چلتا گیا۔ دریا چڑھا ہوا تھا اور ایسے میں چندر گھر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ دوسرے مچھلی پکڑنے کا اسے جنون تھا۔

بارش کی بوچھاڑ نے نہر کے دونوں کناروں کے پیڑ پودوں کو دھندلا دیا تھا۔ کوئی آدمی یا جانور دکھائی نہ پڑتا تھا۔ شاید سب کہیں بارش سے بچنے کو ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ اظہر نے کشتی کی غڑاپ غڑاپ سنی تو خوش ہوگیا۔ کشتی کے کنارے پر کھڑا چندر جال پھینک رہا تھا۔ کشتی کا سرا ایک بانس سے بندھا ہوا تھا۔ پانی کی لہروں میں کشتی کی غڑاپ غڑاپ کا شور بارش کی آواز سے کہیں اونچا تھا۔

اظہر نے چلا کر پکارا ''چندر''

نہر کے دونوں کناروں تک اس کی گونج گئی۔

بادل گڑگڑا رہے تھے۔ بارش کا زور ٹوٹ گیا تھا۔

لہر کے پلٹنے سے پہلے چندر نے نہر کے دہانے پر جال کا گھیرا ڈال دیا تھا۔ پانی کا زور اسے باہر دھکیل رہا تھا اور چندر جال کا گھیرا اور تنگ کر رہا تھا۔ وہ پرسکون نظر آرہا تھا۔

اس کے بازوؤں کے پٹھے پھولے ہوئے تھے اور آنکھیں جال پر لگی ہوئی تھیں۔

آنکھ اٹھائے بغیر اس نے کہا۔ ''خان بھائی، بس ذرا ٹھہرنا۔''

جال اچھی طرح کھینچ کر وہ بولا ''میں کسی اور کو پیسے کیوں دوں۔ ایک عمر سے تو میں

خود یہ کام کر رہا ہوں۔''

دو چار سیر مچھلیاں ہی پکڑ میں آئی تھیں۔ دس بارہ توپ شے مچھلیاں دیکھ کر چندر کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

''میں نے سوچا ایک دفعہ کھٹے جال کو بھی آزماؤں۔ اچھا ہوا تم آ گئے۔''

دونوں چندر کے گھر کی طرف چلے۔ چندر ٹھنڈ کے مارے کپکپا رہا تھا۔ وہ بڑی دیر سے بارش میں بھیگتا رہا تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر مچھلیوں کی ٹوکری اٹھائے تیز قدموں سے چل رہا تھا۔

''جلدی چلو، خان، اس وقت چلم تمباکو کی طلب ہے۔''

اظہر پر پھوار اس طرح پڑ رہی تھی جیسے پرندوں کے پر پھڑ پھڑانے سے چھینٹا سا اڑتا ہے۔

چندر نے برآمدے ہی سے پکارا ''ہوشیار خبردار، تیار''

ایلوکشی اور چندرامنی مسکراتی باہر نکلیں۔

''دادا، جنگ کا اعلان کر رہے ہیں جیسے۔''

''تیاری کس بات کی؟'' ایلوکشی نے کہا مگر وہ خوب سمجھتی تھی۔ چندرامنی سے ان کے بٹھانے کا کہہ کر خود حقہ تیار کرنے چلی گئی۔

تو یہ تھی چندرامنی۔ اظہر حیران رہ گیا۔ اس نے چندر کی اس بہن کے پہلے دیکھا تھا۔ وہ دبلی پتلی، گوری اور چندر سے چھوٹی تھی۔ چندر نے بڑے جتن سے اس کا بیاہ کیا تھا۔ اسے اب کیا ہو گیا؟ لگتا تھا پٹ سن کے ڈنٹھل نے انسان کا روپ دھار لیا ہو۔

میرے کپڑے تو بالکل نچڑ رہے ہیں۔ منی۔ میں بھوسے کا گٹھا خراب نہیں کروں گا۔ بس یہیں پالتی مار کر بیٹھ جاتا ہوں۔ تم اتنی کمزور کیوں لگ رہی ہو؟''

''روپ کیا کرے جب کرم ہی پھوٹ جائیں۔''

اظہر چپ ہو گیا۔ پچیس برس کی ابھی نہیں ہوئی وہ۔ اس ذرا سی لڑکی سے کیا قصور ہو گیا جس کی ایسی سزا مل رہی ہے اسے؟

''کیا بخار رہتا ہے، منی؟''

MashalBooks.org

''پچھلے دو مہینہ سے ملیریا جان کو لگا ہے۔ مگر میں اس سے پہلے ہی اچھی نہ تھی۔''

چندرامنی برآمدے کے ایک کونے میں دھنس سی گئی۔ سادہ سفید ساڑھی، اس کی بیوگی کا نشان، اس کے کمزور چہرے سے میل کھا رہی تھی۔

''تمہارے بچے ہیں یہ؟ ہیں نا، منی۔''

''جی، دادا، بڑا گوپال پانچ برس کا ہے۔ جوگین تین کا۔ میرا جی ان کے لیے کڑھتا ہے۔ اگر مرنے سے پہلے وہ ان کے لیے کچھ چھوڑ جاتا.....''

اس کی دھنسی اور بجھی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ گوپال اور جوگین ماں سے لگ کر کھڑے رہے۔

آنسوؤں سے دھندلائی آنکھوں کے ساتھ اس نے کہا ''میرے بھائی کی وجہ سے کم از کم ہمارے سر پر چھت تو ہے۔ لیکن ان کا حال کچھ آپ سے چھپا ہے۔ ان کے اپنے بے جئے نہیں، اور اس پر ہمارا بوجھ آن پڑا ہے۔''

کمر کے گرد ایک سوکھا گمچا باندھتے ہوئے، حقہ کے کش لگاتا چندر باہر آیا۔ اور اس کی نظر چندرامنی پر پڑی۔

''چلو، یہ پھر شروع ہوگئی۔ اظہر بھائی، تم ہی بتاؤ، اسے کیا فکر ہے؟ میں تو نہیں مرا ابھی، کیا مر گیا؟''

چندرامنی اس کی بات کاٹ کر بولی ''نہیں، مجھے کچھ نہیں ہوا۔ اپنی طرف دیکھو۔ ہماری خاطر کام کر کر کے تمہارا کیا حال ہوگیا ہے؟''

''چپ، چھوڑ اسے، بہت ہوگئی۔ میری صحت کو کیا ہوا ہے؟''

حقہ اظہر کو دیتے ہوئے چندر نے اپنے بازوؤں کی مچھلیاں دکھائیں ''دیکھ منی، کس مائی کے لال میں دم ہے جو میرے سامنے خم ٹھونکے۔ شاباش، رسوئی میں جا۔''

مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چندر نے اپنے ہونٹ سکیڑ لئے۔

جوگین ماموں کے مسخرے پن پر ہنس پڑا۔

''تو ہنستا ہے؟ آجا پھر لگا لے جوڑ۔''

تین برس کے جوگین نے ڈرے بغیر اپنا منا سا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

MashalBooks.org

گوپال شرمیلا تھا۔ وہ دور سے اپنے بھائی کو دیکھتا رہا۔

''شاباش، لڑنا سیکھ لے اسی طرح۔ پھر بڑے ہو کر ڈاکے ڈالتے پھرنا۔''

اظہر نے نال منہ سے ہٹائی۔

''بہت اچھا سبق سکھا رہے ہو اسے۔''

چندر نے اپنی لمبی مونچھیں تھپ تھپائیں۔

''میں ڈاکو بناؤں گا ان کو۔ کام کر کے تو پیٹ بھر نہیں سکے گا میں بھی کسی گروہ میں جا ملوں گا۔''

کچھ پاگل ہے یہ چندر، اظہر نے سوچا، مگر پھر بھی اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

''سو تم بھی ڈاکے ڈالا کرو گے، کیوں؟''

''کیوں نہیں.....؟ کام کر کر کے خود کو کھلانے سے کوئی فائدہ؟ دھرم، بھگوان، مجھے پرواہ نہیں کسی کی۔ چوری کرنے میں کوئی گناہ نے جب محنت کر کے کھانے کو دانہ نہ ملے۔''

اظہر کی آنکھیں ماتھے پر چڑھ گئیں۔

''کیا بک رہے ہو تم، چندر''

''میں بھر پایا، سچ مچ، تمہارے خیال میں کوئی خدا ہے، اللہ تعالیٰ؟''

''نعوذ باللہ، نعوذ باللہ''

اظہر دل ہی دل میں لاحول پڑھنے لگا۔

جوگین ابھی تک ماموں سے زور آزمائی کر رہا تھا۔ چندر کسی طرح چپ ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ''ہم جان توڑ محنت کر کے اپنا پیٹ نہیں بھر سکتے۔ اور انہیں گاؤ تکیوں سے لگے لوٹ لوٹ کر کھلایا جاتا ہے۔ خدا کی مرضی، وہ کہتے ہیں؟ قسمت کرم۔ ٹھیک ہے۔ مگر میں ایسے بے انصاف بھگوان کا کیا کروں۔ میں ڈاکہ ڈالوں گا تاکہ میں بھی کھا سکوں۔

چندر نے جوگین کو بھی طوطے کی طرح ساتھ ملا لیا۔ ''میں ڈاکہ ڈالوں گا تاکہ میں بھی کھا سکوں۔''

چندر نے اظہر کو دیکھا اور گاتے گاتے رک گیا۔

اظہر خفا اور بیزار سا لگتا تھا۔

MashalBooks.org

''خفا ہو مجھ سے؟ اچھا چلو اب اصل کام کی بات کرتے ہیں؟''

''کون سا کام!''

''وہ جو میں نے تم سے کہا تھا؟''

اظہر کے ذہن میں کسی خیال کا شائبہ بھی نہ تھا۔ احمقوں کی طرح بولا۔

''کیا کہا تھا تم نے مجھ سے؟''

چندر ہنسنے لگا۔

''یاد نہیں رہا نا تم کو؟ کیوں؟ میں وہ مچھلی کے بیوپار کی بات کر رہا ہوں۔''

اظہر شرمندہ سا ہو گیا۔

''میرا حال تو تم جانتے ہی ہو۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''میں کہیں سے بھی ادھار نہ لا سکا۔''

''اور مجھ سے بحث کر رہے ہو تم، آنکھیں کھول کے دیکھو؟ محنت کر کے ہم اپنا پیٹ نہیں پال سکتے۔ سو بیوپار کرنے کی سوچتے ہیں۔ اور پھوٹی کوڑی پلے نہیں۔''

چندر چپ ہو گیا۔

چندرامنی پلٹ آئی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی ان کی باتیں سنتی رہی۔ اپنی چپ توڑتے ہوئے بولی، جوگین کو بھی مچھلی کے بیوپار کا شوق چڑایا تھا۔''

چندر نے بڑبڑا کر ہاں میں ہاں ملائی۔

جوگین کا ماموں کے ساتھ کھیل ختم ہو گیا تھا وہ کچھ روٹھا سا بیٹھا تھا۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے چندر بولا ''ہماری بات ہی صحیح ہے۔ ہم نہ بیوپار کریں گے نہ کھیتی باڑی۔''

اظہر نے سوچا چندر اس سے خفا ہو گیا ہے۔ کسی بھی غلط فہمی کے امکان کو ختم کرنے کی خاطر بڑی ملائمت سے بولا۔ ''چندر، مجھ سے خفا مت ہو، پچھلے دو برس سے میں گھر کیسے چلا رہا ہوں یہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔''

چندر نے چندرامنی سے کہا کہ چلم پھر سے بھر لائے۔

''تم سے کیوں خفا ہونے لگا۔ مجھے غصہ تو..... کیا کہتے ہو تم اس کی تقدیر پر ہے۔''

اظہر بھیگے کپڑوں میں ہی بیٹھا رہا تھا۔ وہ چندر کے پاس اٹھ کر نہیں جا سکتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس نے چندر کی ہیٹی کر دی ہو۔

MashalBooks.org

چندرامنی دہکتی چلم لے کر آئی۔ اچاٹ جی سے ایک دو کش لے کر اظہر نے حقہ چندر کو دے دیا۔

''خان چلو، دھان کے کھیت دیکھ آئیں تم بھی تو گھر جاؤ گے۔''

وہ پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ چندر کے ہاتھ میں لال مونچھوں والی چند توپ سی مچھلیاں تھیں۔ اظہر بے دھیانی میں چل رہا تھا۔ ہر بات سے بے خبر۔ یہ خیال کہ وہ چندر کی مدد نہ کر پایا کہیں اس کے ضمیر میں کچوکے لگا رہا تھا۔

چندر، بے فکر مست اپنے معمول کی چال سے ساتھ چلتا رہا۔ افق کے داغ بارش سے دھل گئے تھے۔ اتھلے پانی میں کھڑے چھوٹے بگلے اپنی رٹ میں مگن تھے۔ نہر کے کنارے سرکنڈوں کے جھنڈ میں بنے اپنے گھونسلے سے ایک رام چڑیا نے اپنی گردن اچکائی اور اگلے پل ہی وہ نیلے آسمان میں گھل مل گئی۔

اظہر چندر کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ ایسے ہی چندر نے مڑ کر دیکھا۔ اظہر نے بھاری آواز میں کہا''چندر، دکھی مت ہونا۔ یہ میرے نصیب ہیں۔ کاش ہم بیوپار میں قسمت آزمائی کر سکتے۔''

چندر حیران رہ گیا۔

''ہاں، دکھ تو کرو گا میں۔ اگر تم یہ مچھلی تل کر اپنے بچوں کے ساتھ کھالو تو میں خفا نہیں ہوگا۔''

مسکراتے ہوئے چندر نے مچھلیاں اظہر کے ہاتھ میں تھما دیں۔

پہلے وہ چندرامنی، اپنے بال بچوں، گوپال اور جوگین کی فکروں میں تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے دل سے دکھ کا بوجھ ہٹ گیا ہو۔ اسے اظہر کا ساتھ اور بھی اچھا لگنے لگا۔

''اظہر بھائی، ایک دن میں بھی تمہارے ساتھ دور پار کے علاقوں میں جاؤں گا۔ مجھے بھی تھوڑا سا مستری کا کام سیکھا دو۔''

اظہر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا اداس چہرہ دیکھ کر چندر بھی خاموشی سے چلتا رہا۔ ایک بگلے کی شوخ چہکار کھیتوں میں سپنے کی طرح دھیرے دھیرے ڈوب گئی۔

MashalBooks.org

ساتواں باب

اظہر نے چند بیگھہ زمین میں دھان لگائے تھے۔

بالیں پک چلی تھیں۔ اچانک اس نے کنی بسولہ اٹھایا اور دور پار کے علاقے کو نکل گیا۔ گھر بار کی فکر دریا بی بی کے لیے چھوڑ گیا۔ اس کا دستور تھا کہ جانے سے پہلے بیوی سے مشورہ کیا کرتا، اس دفعہ ایک حرف بھی نہیں کہا۔ دریا بی بی نے اسے اوزار اکٹھے کرتے دیکھا تھا لیکن یہ اس کے سان گمان میں نہ تھا کہ وہ پھر گھر چھوڑ کر جا رہا ہے۔ سب سے پہلے امجد کو اس بات کا پتہ چلا اور اس نے ماں کو بتایا۔

''مذاق کر رہا ہے۔ امو۔''

''نہیں ماں۔ ابا کہہ رہے تھے کہ کوئی جگہ ہے نیا مت پور۔ وہ کام ڈھونڈھنے وہاں جا رہے ہیں۔''

امجد اپنے دوستوں کے ساتھ ایسے ہی کھیتوں میں گھوم رہا تھا کہ باپ بیٹے کی ملاقات اتفاق سے ہوگئی۔

دریا بی بی ذرا دیر گم سم سی رہ گئی۔ کیا اس دنیا میں اور لوگ بھی ایسے ہیں جو اس طرح گھر سے جائیں اور کسی گھر والے کو کچھ بتانا بھی مناسب نہ سمجھیں۔

''ماں، تم ابا کو دیکھتیں تو سمجھتیں کہ دماغ خراب ہو گیا ان کا۔ ایک لفظ بھی تو نہیں کہا۔ سر جھکائے چلتے چلے گئے۔''

دریا بی بی کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔

''ماں، ابا کو دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ لنگی تک تو ٹھیک سے پہننا نہیں آتی۔ اس پر ایک اٹنگی قمیض۔''

دریا بی بی کو تاؤ آ گیا۔

''دور ہو جا یہاں سے، بہت سن لی تیری بکواس۔''

MashalBooks.org

امجد سہم کے دبک گیا۔

دریا بی بی چونکی۔شام ہو چلی تھی۔ چاند کی پچھلی تاریخیں تھیں۔آج رات راستوں پر چاند بھی روشنی نہیں کرے گا۔

''کچھ اور نہیں بتایا تمہیں؟'' دریا بی بی نے امجد کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگاتے ہوئے پوچھا۔ وہ اور بھی سہم گیا جیسے وہ کسی بے باپ کے بچے کی ٹھوڑی چھو رہی ہو۔ دریا بی بی آواز شدتِ جذبات سے رندھ گئی تھی۔

''انھوں نے صرف اتنا کہا کہ میں نیامت پور جا رہا ہوں۔ کام ڈھونڈھنے۔ نیامت پور کہاں ہے، ماں؟''

دریا بی بی کچھ نہ بولی۔ اسے غصہ آ رہا تھا۔ ایسا غصہ جس نے رشک سے جنم لیا تھا۔ کاش وہ بھی دنیا کو ایسے ہی بے دھڑک اکھڑپن سے برت سکتی! اس کے لیے تو دن ہزاروں کام لیے نکلتا اور ذہن پر فکروں کے ناگ کنڈلی مارے بیٹھے رہتے۔

اگر امجد وہاں نہ ہوتا تو وہ چھوٹی سی بچی کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتی۔ اپنے بیٹے سے ذرا سی ٹیک لگائے وہ بت کی طرح کھڑی تھی اور اس کی آنکھیں افق پر جمی تھیں۔ نعیمہ اپنے باپ سے بہت ہلی ہوئی تھی۔ اس نے گاؤں میں ایک لڑکے سے سن لیا تھا کہ اس کا باپ کہیں دور چلا گیا ہے اور وہ روئے چلی جا رہی تھی۔

''ابا مجھے نہیں لے گئے، ماں'' نعیمہ روتے روتے بولی۔

''چپ ہو جا، ورنہ مار کھائے گی۔''

نعیمہ چپ ہو گئی۔

دریا بی بی بولی۔''امو، جا بہن کو اپنی کتاب میں سے تصویریں دکھا۔''

اسے اس بات کا دھیان نہیں رہا تھا کہ شام ہو گئی تھی۔ اور دیا نہیں جلا تھا۔ فوراً بولی۔

''ٹھہرو، میں دیا جلا دوں۔''

وہ دیا لے کر چلی تو سوچا مویشیوں پر بھی نظر ڈالی لے۔ اگر بارش نہ ہو تو انہیں کھلا چھوڑا جا سکتا تھا۔ امجد ابھی چھوٹا تھا اور وہ مویشیوں کو پرائے کھیتوں میں جانے سے نہیں روک سکتا تھا۔ یہ بات پریشانی کی تھی۔ جو جرمانہ ادا کرنے کی سکت رکھتے تھے وہ کٹائی کے

MashalBooks.org

دنوں میں بھی مویشیوں کو کھلا چھوڑ دیتے تھے۔

نیم کے پیڑ تلے بھوسے کا ڈھیر آج عجیب لگ رہا تھا۔ سارا گھر ہی سونا سونا لگ رہا تھا۔ دیا اٹھائے گھر کا چکر لگا کر دریا بی بی جلدی سے اپنے بچوں کے پاس چلی آئی۔

دو چار الواڑتے ہوئے گزرے دریا بی بی کا دل بدشگونی سے دہل گیا۔ پچھلے دنوں پھر بچوں کے کپڑے گم ہو گئے تھے۔ اچکوں کے ڈر سے نیند بھی ڈھنگ سے نہیں آتی تھی۔ کم از کم گھر میں ایک مرد تو تھا۔ او ریہ بڑی ڈھارس تھی۔ اسے ایک بار پھر اکیلے پن کا گہرا احساس ہوا۔ اندھیرے سے پہلے ہی وہ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو چکی تھی۔

دریا بی بی امجد کے پاس بیٹھ کر اسے سبق پڑھتے سنتی رہی۔ ''ایک دفعہ دلی جاتے ہوئے.....''

نعیمہ ہنسی ''دلی، بلی''

''چپکی سنو، نعیمہ، غل مت کرو۔ تمہارا بھائی پڑھ رہا ہے۔''

دریا بی بی کی گود میں بیٹھی نعیمہ جھولتی رہی۔ دریا بی بی آج بہت چوکنا تھی۔ امجد پڑھ رہا تھا۔ اور اس کی آواز اونچی نہ تھی۔ باڑ اور چوکھٹ کے آس پاس ذرا بھی آہٹ ہوتی تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے.....''

افق تک ایک سلیٹی مستقبل پھیلا تھا۔ اس کے چاروں طرف بنجر تھا، شادابی کا دور دور تک شائبہ بھی نہیں تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اظہر کی کوئی خیر خبر نہ ملی۔ امجد ڈاکیے کے بے کار دق کیا کرتا۔

دریا بی بی بہت فکر مند تھی۔ اوش دھان کی کٹائی کا وقت تھا۔ اسے یقین تھا اظہر اس سے پہلے ضرور آئے گا۔

دھیرے دھیرے دو ہفتے او رگزر گئے۔ دریا بی بی نے شاکر کو بلوایا او رجی بھر کر شکایتیں کیں۔ شاکر یہ نصیحت کر کے کھسک گیا کہ اگر ایک سمجھ دار مرد کمائی کے لیے کہیں دور چلا جائے تو فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

دریا بی بی کے اپنے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ گھر میں جتنے پیسے تھے وہ ختم ہو چکے تھے۔ کیا وہ بچوں کو کھانا بھی کھلا سکے گی؟ کب تک ادھار مانگتی رہے وہ؟

MashalBooks.org

دریابی بی اندھیرے میں بھٹک رہی تھی۔ اگر میمنوں کی جوڑی اس وقت پاس ہوتی تو اس مشکل میں وہ انہیں بیچ سکتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کو کچھ ایسا ہی منظور تھا۔ مرد گھر میں ہو تو کوئی راستہ نکالا جا سکتا ہے۔ برسات کا موسم تھا اور پڑوسیوں کو اپنی گزر بسر میں مشکل تھی۔ کچھ نے تو اپنے دھان کے بیج بھی کھا لیے تھے۔ سال کے ان دنوں میں لوگ مزدور بھی نہیں رکھتے تھے۔ ان کے اپنے چاروں طرف بھوک کا خطرہ تھا اور وہ خود اپنے لیے پریشان تھے۔

دوسرے دن دریابی بی شاکر کی ماں کے پاس گئی۔ بوڑھی عورت کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے باشو کی مراد پوری کر دی تھی۔ دریابی بی نے ہنسی ہنسی میں یہ بات اٹھائی کہ پھر تو دعوت ہونا چاہیے۔ بوڑھی عورت اس پر صرف رضامند ہی نہ ہوئی بلکہ بہت اصرار کیا۔ دریابی بی یہ دعوت خوش دلی سے قبول نہ کر سکتی تھی۔ اسے یہ بات بہت چبھی۔ پڑوسیوں کی نظر میں اس کی ہیٹی ہو جائے گی۔ اگر وہ ایسے میں کھانے کی دعوت قبول کر لے، جب گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔ اس سب کے باوجود وہ مان گئی۔ ایک وقت کے کھانے کی فکر سے تو وہ بچ جائے گی۔ ان سب کے ساتھ عاشق جان کا بھی بلاوا تھا۔

دریابی بی اب تک عاشق جان پر ایک توہین آمیز ترس کھاتی تھی لیکن اب وہ اسے اور طرح دیکھتی تھی۔ اپنے اندر کہیں اسے اس بات کا احساس تھا کہ عاشق جان کی حالت کو وہ اپنی بے بسی کی ترازو میں تول سکتی ہے۔ پہلے اس نے عاشق جان کی کبھی اتنی پرواہ نہیں کی تھی۔ اس کی بھی ضرورت کبھی نہیں سمجھی کہ اللہ تعالیٰ جانے اس نے کھایا بھی یا بھوکی رہی۔

اب یہ ذمہ داری اٹھانے کو بھی اس کا جی چاہا۔

عاشق جان بارش میں بھی باہر جاتی۔ موسلا دھار بارش بھی اسے باز نہیں رکھتی تھی۔ اسے کسی نے بلایا ہوتا یا نہ بلایا ہوتا، لیکن ہمیشہ وہ ایسا ہی ظاہر کرتی جیسے کہیں نہ کہیں کا بلاوا ہے۔ گھر میں جتنے چاول ختم ہونے کو تھے۔ عاشق جان کو سب خبر تھی۔ ایسی باتوں میں امجد مددگار ہوتا۔ وہ سونے لیٹتا تو عاشق جان اس سے ساری پوچھ تاچھ کر لیتی۔

''مٹکے میں اب زیادہ چاول نہیں رہے، دادی۔'' ماں کو ابا پر آج بہت غصہ آیا۔''

عاشق جان ذرا دیر چپ رہی اور پھر اسے نے پوچھا۔''تم نے آج پیٹ بھر کھایا تھا؟''

''جی، دادی، مگر ماں زیادہ نہیں کھاتی۔''

MashalBooks.org

عاشق جان پھر چپ ہوگئی۔

دوسرے دن مٹکے میں کہیں زیادہ چاول پا کر دریا بی بی نے امجد کو بلایا۔

''اتنے سارے چاول کہاں سے آئے؟''

''ماں مجھے نہیں معلوم۔''

معاملہ سمجھنے میں دریا بی بی کو زیادہ دیر نہیں لگی۔ کوئی اور دن ہوتا تو ایک جھگڑا کھڑا ہو جاتا۔ اس کی اجازت کہاں تھی کے بچے خیرات میں ملے چاول کھائیں لیکن آج دریا بی بی نے جان بوجھ کر بات بدلی۔

''ڈاکیے سے پوچھا تم نے، کوئی خط یا پیسے؟''

''روز پوچھتا ہوں، ماں''

''کل پھر پوچھنا۔''

امجد کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ ماں کا لہجہ اتنا ملائم بھی ہوسکتا ہے۔

''امو، جاؤ، دیکھ کر آؤ دھان پک گئے کہ نہیں۔ کٹائی کے لیے ہمیں ایک مزدور کرنا پڑے گا۔''

امجد نے رضامندی میں سر ہلایا۔

ماں کھانے کے لیے چاول نکالنے آئی تھی۔ اچانک اس نے امجد کو چمٹا لیا۔ جو کچھ وہ کہنا چاہ رہی تھی وہ نہیں کہہ پائی۔ اس نے پیار سے بات کو نمٹا دیا۔ امجد کو ماں کے پیار سے خفت اور الجھن سی ہوئی۔ باہر بانس کے جھنڈ سرسراتے رہے۔

دوسرے دن امجد ششدر رہ گیا۔ اتنی سی بات پر ماں اتنی طرح کیسے پیٹ سکتی ہے؟ اس نے صرف اسکول کی فیس ہی تو مانگی تھی۔ شاید اس کا موڈ اچھا نہیں تھا۔ اسے اس وقت نہیں مانگنا چاہیے تھا۔ لیکن اسے یہ پتہ نہ تھا کہ ماں اتنی بے دردی سے بھی مار سکتی ہے۔

ماں سے پٹنے کے بعد وہ برآمدے میں بیٹھا دیر تک آنسو بہاتا رہا۔ نعیمہ اس کے پاس آئی اور ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔ ماں کو پچھتاوا تک نہ تھا۔ بلکہ اس نے اپنے آپ ہی ایک جھگڑا کھڑا لیا۔ اس میں بات اظہر کے چالیسویں اور اس کی چودہ نسلوں کے بکھان تک جا پہنچی۔ امجد برآمدے سے کھسک گیا۔

MashalBooks.org

وہ کھیتوں میں چلا گیا۔ وہاں اسے کچھ سکون ہوا۔ان ہی کھیتوں میں اظہر اپنے غم کو بامصرف بنا دیتا تھا۔شاید اس طرح امجد اس سے خون کے رشتہ میں بندھا ہوا تھا۔

وہ کھیتوں میں ادھر ادھر گھومتا رہا۔آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے۔لیکن بارش نہیں ہو رہی تھی۔کوئی چیز اسے گھومنے پھرنے سے نہیں روک سکتی تھی۔

سورج ڈھلتے ہی اسے بہت بھوک لگنے لگی۔ برسات کا موسم تھا اور چاولوں کے سوا دوسری کوئی فصل نہ تھی۔اگر کہیں گرمیاں ہوتیں تو کھیرے، ککڑی اور تربوز کھا کر وہ ماں سے بدلہ لیتا۔جیسے کوئی انجانا اسے کھینچے لیے جاتا ہو، وہ چندر کوتل کے گھر کی طرف بڑھے چلا گیا۔

نہر اور دریا کے سنگم پر پیڑ تلے بیٹھ کر امجد خیالی پلاؤ پکاتا رہا۔سیدھا چندر کا کا کے گھر جانے سے کوئی چیز اسے روکے رہی۔

کمر پر گھڑا اٹھائے چندرامنی دریا تک آئی۔ امجد کو دیکھ کر بولی ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

امجد نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ آنکھوں کے نیچے خشک آنسوؤں کے نشان تھے۔

''گھر میں کوئی جھگڑا ہوا کیا؟ چلو چلیں۔تمہارے کا کا گھر پر ہیں۔ ہوا کیا؟''

امجد سر ڈالے بیٹھا رہا۔اس نے چندرامنی کی بات نہ مانی۔اس وقت تک چندر خود آن پہنچا۔

''کیا معاملہ ہے چندرامنی؟''

''دیکھو،تمہارے دوست کا بیٹا یہاں بیٹھا ہے۔ایک حرف تک نہیں بولتا۔''

چندر نے امجد کو غور سے دیکھا۔ وہ ساکت اور خاموش تھا۔ اس کی معصوم اور خوبصورت آنکھیں کہیں دور گم تھیں۔

چندر زور سے ہنس پڑا۔

''سو اب تم پیڑ کے نیچے دھیان گیان کرتے ہو؟ ٹھیک ہی ہے۔تمہارے ابا بڑے نیک مسلمان ہیں۔آخر تم ان کے بیٹے ہو۔''

امجد نے ان دونوں میں سے کسی کی طرف نہیں دیکھا۔دونوں بہن بھائی ہنستے

MashalBooks.org

رہے۔

چندر سیٹی بجاتے ہوئے گانے لگا ''میری مینا، بولے نا''

امجد پھر بھی کچھ نہیں بولا۔ چندر نے پوری قوت سے سیٹی بجائی اور امجد کو ایک جست میں اٹھا کر کندھے پہ بٹھا لیا۔ گونگے درویش نے سسکیاں لینا شروع کر دیں۔

''میری مینا بولے نا، ہائے، ہائے ہائے.....''

چندر نے سر ہلایا۔

''ٹھیک، چندر امنی نے خوب یاد دلایا۔''

وہ گھر کی طرف مڑ گیا۔

MashalBooks.org

آٹھواں باب

بارش مسلسل ہوئے جارہی تھی۔ جیسے ہی ذرا تھمتی پرندے تال تلیا میں نہانے چلے آتے۔ کھلے کھیتوں میں آسمان کی عکس تیرتا۔

سر پہ بوری اٹھائے دریا بی بی سڑک کے موڑ تک چلی آئی تھی۔ ایسا اس نے کبھی پہلے نہیں کیا تھا۔ بارش کے پانی کی ایک لہر اس کے پیروں کے نیچے سے گزر گئی۔ بوری بھی اسے بھیگنے سے نہیں بچا سکی۔ اس کا اوپر کا دھڑ بھیگ چکا تھا۔

دریا بی بی کو اس کی پرواہ نہ تھی۔ اسے سردی لگ رہی تھی لیکن اس کا احساس نہ تھا۔ اسے کس کا انتظار تھا؟

سڑک کے ایک کنارے کچھ پیڑ پودے تھے۔ او ر ان کی وجہ سے کھیتوں میں دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ دوسری طرف گھنے پیڑوں اور بیلوں کا جنگل تھا۔ خاموشی کی گود میں، بادلوں سے گھیرا مانوس گاؤں بھی ڈراؤنا او ر بھوتوں کا سا لگ رہا تھا۔ پتہ بھی کھڑکتا تو گھبراہٹ ہوتی۔

دریا بی بی بے چینی سے بار بار سڑک پر دور تک نظر ڈالتی۔ آسمان پر گھرے بادلوں کی طرح اس کا چہرہ گھمبیر تھا۔

جیسے ہی دور سے ایک لڑکا آتا دکھائی پڑا اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ امجد تیز تیز چلتا آ رہا تھا۔ ایک لال گمچھا اس نے سر پر لپیٹا ہوا تھا۔

بارش کو بوچھاڑ میں اس کا بچکانہ جسم ناچتی پتلی کی طرح من موہنا لگ رہا تھا۔

دریا بی بی کھل اٹھی۔ ابھی امجد اس کے پاس بھی نہ پہنچا تھا کہ وہ بولی ''شیرامی ملی تمہیں؟''

بارش میں بری طرح شرابور امجد سردی سے کانپ رہا تھا۔ وہ فوراً جواب بھی نہ دے سکا۔ وہ ماں کے اور نزدیک ہوگیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ذرا ٹھہر کر اداسی سے

MashalBooks.org

وہ بولا۔ ''نہیں ماں، اس کی بھابی کہہ رہی تھی وہ کھیتوں سے سیدھی ہمارے پاس آئے گی۔''

شیرامی باگڑی اچھوتوں میں سے تھی۔ جو مچھیروں کی بستی سے پرے ایک کنارے رہتے تھے۔ شیرامی کی دنیا میں اکیلا جی اس کا اپاہج بیٹا تھا۔ اس کا میاں کب کا مر چکا تھا۔ ایک لمبی بیماری کے بعد گنیش اپاہج ہو گیا تھا۔ وہ سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا اور اس کے ایک ہاتھ کو سوکھا مار گیا تھا۔

اس بڑھاپے میں بھی شرامی کو اس کی دیکھ بھال کرنا پڑتی تھی وہ اپلے بیچتی ساگ بھاجی اکٹھا کرتی اور لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کرتی وہ اپنے دکھوں کو اپنی محنت میں چھپائے رکھتی۔

شرامی دریا بی بی کو چند سال سے جانتی تھی وہ اس گھر میں اپلے لے کر آتی تھی اور یہاں سے دونوں عورتوں کے بیچ دوستی کے رشتہ کی بنا پڑی۔

بارش ذرا دیر کو تھم گئی تھی۔ ملائم آہٹیں پیڑوں اور پتوں پر اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ کسی چڑیا کے پروں سے پانی جھٹکنے کی آواز سنی جا سکتی تھی۔

''اگر وہ نہ آئی تو؟'' دریا بی بی نے سکوت توڑا۔

''نہیں ماں، وہ آئے گی۔ چلو گھر چلیں۔ مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔''

جیسے اسے ہوش آ گیا ہو۔ دریا بی بی نے اپنی ساڑی کے خشک حصے سے امجد کا سر رگڑا۔

''اس وقت سکھانے کا کیا فائدہ ماں؟ بارش پڑ رہی ہے۔''

دریا بی بی کو اپنے مرد گرد کا ہوش نہ رہا۔ اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ بارش ہو رہی تھی اور امجد کا سر پونچھنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

برگد کے پیڑ کے نیچے چند مینڈک پھدک رہے تھے۔ سردی سے کپکپانے کے باوجود امجد کو مزہ آ گیا۔ ایک مینڈک قلابازی لگا کر سڑک کے بیچ آن کر بارش میں بہتے کیڑا کھا رہا تھا۔

اسے زور سے ٹھوکر مار کر امجد بولا ''ماں دیکھو میں فٹ بال کھیل رہا ہوں۔''

مینڈک دور جا کر دھڑ سے گرا۔ چاروں شانے چت پڑا، مینڈکی کا جنا ہانپتا رہا۔

MashalBooks.org

دریابی بی اپنی ہنسی نہ روک پائی۔

''اموتم کبھی بڑے نہیں ہوگے۔''

امجد اپنے کارنامے پر سنجیدہ ہو گیا۔ سر ہلاتے ہوئے بولا۔''اب تو مجھے گرم گرم چاول کھلانا پڑیں گے۔ پورا تو بھیگ گیا میں، کیا اب بھی بھوک نہ لگے مجھے؟''

دریابی بی چپ ہوگئی۔اس کے چہرے کی مسکراہٹ بجھ گئی۔

آسمان پر اور بھی بادل چھا گئے۔ بنگال کے گاؤں پر کب تک مینہ برساتا رہے گا؟''

نعیمہ کہیں نہیں گئی تھی۔ وہ عاشق جان سے لڑ جھگڑ رہی تھی۔ وہ دونوں کبھی کبھی کھیل میں لڑا کرتیں۔

چاولوں کا ذرا سا لپٹا بچا ہوا تھا مگر امجد کو ضد تھی کہ وہ یہ نہیں کھائے گا۔

دریابی بی کو غصہ آ رہا تھا۔مگر وہ چپ رہی۔امجد نے کھانے کو ہاتھ تک نہ لگایا۔

دریابی بی نے بھیگے کپڑے بدلے اور انتظار میں بیٹھ گئی۔ جانوروں کے چھپر میں گائیں بھوسے کی جگالی کر رہی تھیں۔ نعیمہ عاشق جان کے کمرے میں کھیل رہی تھی۔ اس کی آواز دریابی بی تک آ رہی تھی۔

بارش ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

سوئے سوئے امجد کو دیکھ کر دریابی بی کے سینے میں سینکڑوں لہریں بل کھا کر رہ گئیں۔وہ خاموش بیٹھی رہی۔ جیسے بہت ترس کر یہ آرام ملا ہو۔ وہ اپنے اجیرن دنوں کی ایک ایک بات سے اپنی یادوں کے تار گوندھتی رہی۔

چاولوں کا ذرا سا لپٹا بچا تھا۔لیکن وہ کھانے کو بھول چکی تھی۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوگئیں۔ دیوار سے ٹکی دریابی بی اونگھ گئی۔

''بھابی، کہاں ہوتم؟''

دریابی بی جاگ اٹھی۔شرامی واقعی آ گئی تھی۔ اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے اور اس کے ہاتھ میں تازہ سبزی ترکاری کا گٹھا تھا۔

گٹھا برآمدے میں رکھ کر شرامی نے پوچھا''مجھے کیوں بلایا تھا، بھابی؟''

MashalBooks.org

شرامی کالی تھی۔ عمر نے اس کی کھال پر جھریاں ڈال دی تھیں۔ بھیگے موسم کی ٹھنڈ کی شدت سے اس کا جسم سکڑ گیا تھا۔ وہ بہت بدصورت لگتی تھی۔ مگر اس کے دل کی بھلائی اس کی آواز میں گونجتی تھی ''تمہیں پتہ ہی ہے کتنا کام کرنا پڑتا ہے مجھے۔ اس موسم میں لڑکے کے ساتھ دکھ جنجال ختم ہونے میں نہیں آتے۔''

شرامی نے واقعی ہانپنا شروع کر دیا۔

دریابی بی نے گنیش کو کبھی نہیں دیکھا تھا مگر شرامی کا دکھ وہ خوب سمجھتی تھی۔ اس کے لیے اسے کچھ سوچنے کی ضرورت نہ تھی۔

''سب نصیب کی بات ہے، دیدی۔ سوچو تو اللہ تعالیٰ تمہارے کھاؤ بیٹے پر ایسی بپتا ڈال دے۔''

شرامی نے اپنے ہاتھ گرم کرنے کے لیے سینے پر رکھ لئے۔ وہ اور زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر دریابی بی اپنی بات کہتے ہچکچا رہی تھی۔ وہ وقت کو ٹھیل رہی تھی۔

''اس گٹھے میں کیا ہے، دیدی؟''

''سبزی ترکاری، بھابی'' شیرامی نے جواب دیا۔ ''مجھے ذرا سا تیل دے دو۔ میں گھر جانے سے پہلے نہاؤں گی۔

دریابی بی کڑوے تیل کا برتن لے آئی۔

شیرامی گٹھے کی گرہ کھول رہی تھی۔ برآمدے میں کچھ سبزی ترکاری رکھ کر اس نے دریابی بی کی طرف دیکھا۔

''اور، بھابی؟''

''کیا ہے گٹھے میں؟''

''کچھ نہیں۔''

دریابی بی نے تجسس سے سبزی ترکاری کے گٹھے کو ٹٹولا۔ نیچے اس میں گھونگھے تھے۔ اس نے بات بڑھائی نہیں۔ دریابی بی جانتی تھی شیرامی کے حالات اچھے نہیں تھے۔ اگر اس نے بطخوں کے لیے کچھ گھونگھے اکٹھے کئے تھے، تو اس میں چھپانے کی ایسی کیا بات تھی؟

''بھابی، اب مجھے چلنا چاہیے۔''

MashalBooks.org

''ذرا تو ٹھہرو، ان بوڑھی ہڈیوں کو سردی کا کیا ڈر ہے؟'' دریا بی بی نے جھوٹ موٹ خفا ہوتے ہوئے کہا۔

شیرامی گڑگڑائی۔''میں پھر آؤں گی کسی وقت بات چیت کرنے۔ بارش میں لڑکے کو اکیلا گھر میں چھوڑ کر مجھے چین نہیں پڑتا۔ کہیں کچھ ہو جائے تو۔''

کچھ دیر دریا بی بی یونہی بت بنی بیٹھی رہی۔ پیڑھی پر آنکھیں نیچے کیے، بولے بنا اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ اس کے چہرے پر گہرے سائے کئی بار آئے اور گزر گئے۔

اچانک گہرا سانس لے کر اس نے کہا،''دیدی، میرا ہیرا گھر والا تین ہفتے پہلے گھر سے کہیں منہ کالا کر گیا۔ ہم اس وقت بالکل خالی ہاتھ ہیں۔ ایک پرانا برتن ہے میرے پاس۔ اگر کوئی اسے پانچ روپے میں گروی رکھ لے میں سود ہر مہینہ دیا کروں گی۔''

اظہر کے خلاف اس کے دل میں بے حساب غصہ تھا۔

''دیکھو تو ذرا، گھر سے بھاگ گیا وہ۔ میں ذرا کم عمر ہوتی تو بھاگ جاتی کسی کے ساتھ۔''

شیرامی نے اسے ٹوکا''ہے ہے۔ دونوں وقت ملتے ہیں کیسی بدشگونی کی بات منہ سے نکال رہی ہو۔ پلک جھپکتے میں گھر کا گھر وا ہو سکتا ہے۔''

دریا بی بی ایک دم چپ ہو گئی۔

''چلو، ٹھیک ہے۔ برتن دو مجھے۔'' شیرامی نے کہا، میں ادرھ سنت کی ماں کے پاس رکھوا دونگی اور تمہارے لیے پانچ روپے لے آؤں گی۔ وہ بڑھیا ہر مہینہ روپیہ سود لیا کرے گی۔''

''اسے ہی دے دو۔''

دریا بی بی نے دھیرے سے کہا۔ اس کی آنکھیں بھیگ چلی تھیں۔

''میرے ابا نے جہیز میں دیا تھا مجھے۔ پہلے میاں کے مرنے پر کچھ پیتل کے برتن میں ساتھ لے آئی تھی۔''

دریا بی بی کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کا چہرہ کھلے آسمان کی طرح خوبصورت تھا۔ اس کے تھکے چہرے پر کوندا سا لپکا۔

MashalBooks.org

شیرامی دکھی ہو کر بولی، ''دادا کو ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا۔ اچھے گھروں کی بیویاں تو باہر نہیں نکلتیں، گھر بار کو کون سنبھالے گا؟''

''مجھے بتا رہی ہو، دیدی۔''

دریا بی بی اپنے کمرے میں گئی اور دو چار منٹ بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں پیتل کا ایک پرانا پتیلا تھا۔

شیرامی نے پتیلے کو بار بار گھما پھرا کر دیکھا۔

''کوشش کرونگی کی وہ اس کے ایک دو روپے زیادہ دے دے۔ اتنی اچھی چیز ہے!''

بارش ذرا دیر کو رکی تھی۔ شیرامی کو پان دیتے ہوئے دریا بی بی نے کہا ''دیدی، اسے اپنے کپڑوں میں چھپا لو۔ کوئی پوچھے تو مت بتانا کہ یہ ہمارا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے واسطے، دیدی۔''

''اتنے برسوں بعد بھی، تم سمجھتی ہو میں ناگن ہوں؟'' گھر سے لکشمی کو کون باہر بھیجتا ہے جب تک کہ بالکل ہی مجبور نہ ہو گیا ہو؟''

شیرامی اٹھ کھڑی ہوئی۔ بارش پھر سے شروع ہوگئی تھی۔ دریا بی بی پتیلے کو چھوتی رہی بڑی ہچکچاہٹ سے اس نے برتن شیرامی کے ہاتھ میں تھمایا۔

''کسی کو مت بتانا، دیدی، میرے سر کی قسم کھاؤ۔''

شیرامی رخصت ہوئی۔

ذرا سے چاول تھے جو وہ امجد کے لیے بگھار سکتی تھی۔ اب رات بھر کے لیے دریا بی بی کو کوئی فکر نہ تھی۔

بادلوں کی گھن گرج کھیتوں کے آر پار ہوگئی۔ گھنی ہریالی میں پیڑ جھومتے رہے۔

دریا بی بی کے چہرے پر ساکت آسمان کے کئی عکس لہرا گئے۔

سختی کے ان دنوں میں چندر نے بہت سہارا دیا۔ یوں تو وہ پھوٹی کوڑی انہیں نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن کیا اس کی ہمدردی اور محنت کی کوئی قیمت لگائی جا سکتی تھی؟

دو اور ہفتے گزر گئے۔ اظہر کا کہیں نام نشان نہ تھا۔ اوش دھان کی ساری فصل

MashalBooks.org

پڑے پڑے گوبر ہوگئی ہوتی اگر چندر اسے اظہر کے گھر تک خود نہ پہنچواتا۔ فصل اچھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس سے ان کے دو چار مہینے گزر سکتے تھے۔ دریا بی بی کا دل بہت کڑھا لیکن اس نے ہمت کی۔ چندر کے مشورہ سے اس نے قرضہ واپس نہیں کیا۔ اگر دو چار مہینہ میں بھی اظہر واپس نہ آیا اور کہیں جوسرے سے پلٹا ہی نہیں؟ دریا بی بی کو لگتا کہ ناامیدی کا چکر اسے کچل رہا ہے۔

ایک دن امجد مکتب سے واپس آیا تو بولا، ''ماں مولوی صاحب نے فیس مانگی ہے۔''

دریا بی بی چڑ گئی۔ ''اچھا اچھا، مولوی صاحب کو روز روز مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کل سے مکتب مت جانا۔''

امجد کا چہرہ ست گیا۔

دریا بی بی کنکی چاول کے ڈھیرے سے کنکر چن رہی تھی۔ اس نے امجد کی طرف دیکھا اس کے چہرے سے چڑچڑاہت کا اثر مٹ گیا۔ بہت سنجیدہ ہوکر بولی، ''مولوی صاحب سے کہنا کہ ابا واپس آئیں گے تو دے دیں گے۔''

امجد پر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ماں نے مولوی صاحب کے بہلانے کو پہلے بھی یہی کہا تھا۔

دل کڑا کر کے امجد بولا، ''تم ہر روز یہی بات کہتی ہو۔''

دریا بی بی کنکر چنتی رہی۔ اس نے امجد کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

امجد چپ ٹکٹکی باندھے ماں کی نقل و حرکت دیکھتا رہا۔ اتنی لمبی خاموشی امجد کے سینے پر پتھر کا سا بوجھ تھی وہ بہت پریشان اور بے چین تھا۔

لگتا تھا دریا بی بی بیٹے کے وجود کو ہی بھول گئی تھی۔

''ماں'' ایک دم امجد نے پکارا جیسے اس کے سن اور ساکت ہونٹوں سے آواز نکل آئی ہو۔ اداس آنکھیں اٹھا کر، دریا بی بی نے بیٹے کو صرف دیکھا۔

''ماں''

''ہاں، تمہیں کل سے مکتب جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت لکھ پڑھ لیا تم

MashalBooks.org

نے۔''

''پھر میں کیا کروں؟ ماں''

دریا بی بی بڑے طنز سے بولی''اور کیا؟ کسان کے پوت، تم بھی اپنا خاندانی کام کرنا کیوں نہیں کروگے؟''

امجد نے سر جھکا لیا۔ کسان کی جان توڑ محنت کی کوئی عزت نہیں تھی۔''

اس کی مسکراہٹ ماند نہیں پڑی اور وہ بولا۔''کیا میں ہل چلا سکتا ہوں۔صرف آٹھ برس کا تو ہوں۔''

''تمہاری گردن چلا لے گی۔''

امجد ڈر گیا۔ ماں کو واقعی بہت غصہ تھا۔

اسی وقت ڈیوڑھی سے چندر کوتل کی آواز آئی۔

چاول کے بیوپاری اکثر نیامت پور جایا کرتے تھے۔لیکن اظہر کی کوئی خیر خبر نہ تھی۔ایک بڑے کاروباری قصبہ میں اظہر جیسا معمولی آدمی کسی گنتی میں شمار نہ تھا۔

امجد چندر سے باتیں کرتا رہا۔ ذرا دیر بعد ڈیوڑھی کے پیچھے سے دریا بی بی خود بولی۔

''ہمارے لئے کچھ کیجئے۔''

چندر ہکا بکا رہ گیا۔ دریا بی بی، ایک پردہ نشین عورت اس سے براہ راست بات کر رہی تھی۔گھبراہٹ میں چندر کے لہجہ کا بے فکر پن بھی نہ رہا۔''کیوں، کیا ہوا بھابی؟''

''ایک غریب آدمی کی اولاد کے لئے پڑھائی کی فیس دینے کا کیا فائدہ؟''

چندر کی بولتی بند ہوگئی۔ بڑی دیر وہ چپ ہی رہا۔

''یہ تو ٹھیک ہے۔مگر ابھی سال دو سال تو اسے ضرور پڑھنا چاہئے۔ بچہ ہی تو ہے ابھی۔''

''اگر ہم اسے زیادہ نہیں پڑھا سکتے۔تو بے کار میں پیسے خرچ کرنے کا فائدہ۔''

چندر نے پھر کچھ کوئی اعتراض نہ کیا۔

''میرے ساتھ رہنے دیجئے۔ اسے، مچھلی پکڑنا، کشتی کھینچنا سیکھ لے گا۔''

MashalBooks.org

دریابی بی راضی ہوگئی۔ بچے کو تیرنا تو آتا نہ تھا، کشتی کیسے چلا پائے گا؟
لیکن چندر پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔
ایک پان کھا کے، امجد کو گلے لگا کر چندر گاؤں کی طرف پلٹ گیا۔
اگلی صبح امجد واقعی حیران رہ گیا۔ ماں اسے کشتی کھینے کی چھوٹی بلی دے کر چندر کا کا کے پاس بھیج رہی تھی اس کے لیے ایک مانجھی کی زندگی کی ابتداء ہو رہی تھی۔
ماں کے ارادے کو بھانپ کر امجد نے کچھ بھی نہ کہا۔ تھوڑے سے چیوڑے کا چبینا ساتھ لے کر وہ دریا کی طرف چل پڑا۔
صرف دو برس پہلے حالات کے اس موڑ کا سان گمان بھی نہ تھا۔ تب اس نے اپنے بچے کے لئے کیا کیا خواب دیکھے تھے۔
خبردار، اب جو اور خواب دیکھے، دریابی بی۔

MashalBooks.org

نواں باب

اظہر اور دوسرے چند مستریوں نے مل کر قصبہ کے ایک نواحی گاؤں میں گھر کرایہ پر لیا تھا۔

آخری بس ریلوے اسٹیشن کے مسافروں کے لے جا چکی تھی۔ سڑک پر اس کے ٹائروں کے نشان باقی تھے۔

چوکھٹ پر ٹکا اظہر، ابھی تک اپنا ناریل گڑگڑا رہا تھا وہ کش لیتا تو چنگاریاں اڑتیں، اور ذرا سی دیر کو اندھیرے میں دروازے کی جھلک پڑ جاتی۔

کمرہ تنگ تھا۔ ایک طرف کی دیوار میں چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ کچی دیواروں پر پلستر تھا اور قلعی کی ہوئی تھی۔ وہ بھی کہیں کہیں سے اکھڑ گئی تھی۔ اونچے نیچے کچے فرش پر بڑی سی چٹائی بچھی تھی۔ جس پر اظہر کے ساتھی سو رہے تھے۔ سارے دن کی لگاتار بارش کے بعد، کمرے میں اظہر کا دم گھٹنے لگا تھا۔ ذرا دیر پہلے وہ بستر سے اٹھ آیا تھا۔ چوکھٹ اور حقہ دونوں بستر سے بہتر تھے۔

سڑک کنارے گڑھے میں ایک مینڈک ٹرایا۔ اس علاقے میں اتنے مچھر تھے کہ قمیض اتارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حقہ گڑگڑاتے اظہر کی آنکھیں تھکن سے مند گئیں۔ اس کے اردگرد مچھر بھن بھن کر رہے تھے ہر تھوڑی دیر بعد وہ انہیں بھگانے کو اپنا گمچا گھماتا۔

اظہر کا دماغ جیسے سن ہو گیا تھا۔ اس کے الجھے خیالات بھی اس اندھیرے میں رینگ نہیں سکتے تھے۔ اظہر خان کو کچھ یاد نہ تھا۔

اس نے نیامت پور میں صرف چند دن کام کیا۔ اچھا بھلا کام مل گیا تھا جو دو چار ہفتے چل سکتا تھا۔ مگر اسے یہ جگہ پسند نہ تھی۔ اسے گنوار شرابیوں کا ساتھ اچھا نہ لگتا تھا۔ زیادہ تر مزدور وہاں ایسے ہی بدمعاش تھے۔ انٹی میں چند دنوں کی مزدوری اڑسے، اظہر پھر نکل کھڑا

ہوا۔ اسے یقین تھا اسے کہیں اور کام مل جائے گا۔ سڑک کنارے جب اس نے اس عمارت کو بنتے دیکھا تو بڑی آس لے کر مالک سے ملا۔ یہاں ساتھی برے معلوم نہ ہوتے تھے۔ مزدور کم ہونے کے باوجود اس نے کام کرنا منظور کر لیا۔

صرف دو برس پہلے بننے والے ریلوے اسٹیشن سے دو چار میل پرے اس گاؤں کا نام جہان پور تھا۔ چند ہی دنوں میں اظہر کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اب بھی وہاں کاروبار کے کچھ نہ کچھ مواقع ہیں۔ اس نے تھوڑا بچانا شروع کر دیا۔

سارے دن کے کام کے بعد اظہر کا جی کچھ اچھا نہ تھا۔ کمرے میں بڑی گرمی اور حبس تھا۔ اسے پوری طرح اندازہ نہ تھا لیکن وہ بے چین تھا۔ وہ خالی الذہن یونہی حقہ گڑگڑاتا رہا اور جمائیاں لیتا رہا۔ تمباکو کب کی جل چکی تھی۔ لیکن گڑگڑانے کی آواز میں وقفہ نہ آنے پایا تھا۔ وہ زور زور سے کش لگاتا رہا، لیکن تمباکو میں پھر بھی جان نہ پڑی۔ مایوس ہو کے اس نے حقہ چوکھٹ کے کونے میں ٹکا دیا۔

وہ ایک چلم اور پی سکتا تھا۔ اس نے پھر جماہی لی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ کوئی اور بھی وہاں ہے۔ اندھیرے میں پہچان نہیں ہو پا رہی تھی۔

اظہر نے رسان سے پوچھا ''کون ہے؟''

''میں ہوں چاچا۔''

اندھیرے میں ایک لڑکے کی آواز سرسرائی۔

''خلیل، تم اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''نیند نہیں آ رہی، چاچا۔''

اظہر کے کانوں کو لگا جیسے وہ سسکیاں لے رہا ہو۔

اس نے نیند جھٹک کر اندھیرے میں ہاتھ بڑھا کر خلیل کو چھوا۔ جو گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔

اظہر کے ایک ساتھی کا نام عودو تھا۔ خلیل عودو کے بھائی کا بیٹا تھا۔ مشکل سے بارہ برس کا ہوگا۔ چچا کے ساتھ بڑھئی کا کام سیکھنے کی خاطر گھر سے دوری کا بجوگ کاٹ رہا تھا۔

اظہر خلیل کے پاس کو کھسک گیا۔ اسے ہلا کر نرمی سے بولا ''بیٹے کیا ہوا؟''

MashalBooks.org

خلیل نے کسی طرح اپنا سر نہ اٹھایا۔ جیسے گھٹنوں میں سر چھپا کر وہ دنیا کے الزاموں سے بچ جائے گا۔

اظہر نے پیار سے اسے پھر ہلایا۔''شاباش، سر اٹھاؤ، مجھے بتاؤ کیا ہوا؟''

دونوں بہت دھیمی آواز میں بات چیت کر رہے تھے۔ کہ دوسروں کی نیند خراب نہ ہو۔ کمرے میں سارے دن کے تھکے ہارے مزدور ہی تو تھے۔

خلیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے قمیض بھی نہیں پہنی تھی۔ اظہر کا ہاتھ، اپنی پیٹھ پر محسوس کر کے وہ پھر سسکیاں لینے لگا۔

جیسے کسی بچھو نے ڈنگ مار دیا ہو، اظہر نے اپنا ہاتھ ایک دم کھینچ لیا اور زور سے بولا''تمہاری کمر پر یہ ہڈھیاں کیسے پڑ گئیں؟''

خلیل نے اپنا ہاتھ اظہر کے منہ پر رکھ دیا''چیخو نہیں، چا چا۔ اگر وہ جاگ گئے تو میری شامت پھر آ جائے گی۔''

سہمے ہوئے خلیل نے سوئے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا۔ اظہر کی آواز ان کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی اظہر نے خلیل کو سینے سے لگا لیا اور اس کی پیٹھ سہلانے لگا۔

اسے امجد اور نعیمہ کی شکلیں یاد آ گئیں۔ موہیش ڈنگا۔ اور دریا بی بی؟ نہیں، جفاکش، خوش تدبیر اور توانا دریا بی بی اس کے ذہن میں نہیں ابھری۔ اور شاید اس کا خیال اس طرح آیا ہو جیسے ایک پل کی روشنی کی مٹتی لکیریں۔

''کس نے مارا تمہیں؟''اظہر نے بے تابی سے پوچھا۔

خلیل نے ادھر ادھر دیکھا اور اظہر کے، کان میں کھسر پھسر کی۔''عودو چچا نے۔ ایندھن کی لکڑی سے۔''

اس کے حلق میں جیسے کچھ پھنس گیا ہو۔ خلیل نے پھر سسکیاں لینا شروع کر دیں۔

''عودو اور اتنا ظالم؟''

شفقت سے اظہر نے اپنا ہاتھ خلیل کی پیٹھ پر رکھا اور پوچھا۔''تم نے ایسا کیا کیا تھا کہ اس نے تمہیں یوں بے دردی سے مارا؟''

''مجھ سے گاہر مستری کا اسپرٹ لیول ٹوٹ گیا۔ اینٹوں پر گر پڑا وہ۔''

MashalBooks.org

گاہر ایک راج تھا۔ ان میں سے ایک، جو کمرے میں سو رہے تھے۔

''بس ایک معمولی لیول ٹوٹ گیا اور اس نے اتنا مارا تمہیں؟''

خلیل پھر سسکنے لگا۔

گھٹی ہوئی آواز میں وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اسے بڑی مشکل سے سمجھا جا سکتا تھا۔

''میں عودو چاچا کے ساتھ گھر جانا چاہتا تھا۔''

''تو کیا عودو گھر چلا گیا؟''

''جی چاچا''

اظہر نے بچے کو تسلی دینا چاہی۔

''پھر کیا ہوا؟ ہم جو ہیں یہاں۔ ڈرنے کی کیا بات ہے۔''

خلیل ایک کونے میں سمٹ گیا۔ سر گھٹنوں میں نیوڑائے۔ اس ظالم دنیا کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا اس میں یارانہ تھا۔

وہ ٹھہر کر بولا ''میرا یہاں جی نہیں لگتا، چاچا۔''

''ابا زندہ ہیں تمہارے، بیٹا؟''

خلیل نے سر نہیں اٹھایا۔ اس کی تھکی آواز بین معلوم ہوتی تھی۔ ''نہیں''

''پریشانی کی کیا بات ہے۔ ہم ہیں یہاں۔ عودو بھی ایک دو دن میں آ جائے گا۔''

اظہر نے خلیل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ اس کے پاس کھسک آیا۔ اس کی تھکی آنکھیں سڑک پر جمی ہوئی تھی۔

پھر اظہر کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''مجھے گھر سے آئے دو مہینے ہو گئے۔ چچا مجھے اپنی ماں یاد آتی ہے۔ عودو چچا چار دفعہ گھر جا چکے ہیں۔''

''گھر سے دور رہنے کی ہمت کرو۔ اچھا مستری بننے کے لیے تمہیں ہنر تو سیکھنا پڑے گا۔ تمہارے دکھ تب ہی کٹیں گے۔ مجھے دیکھو۔ کھیتی باڑی کیا کرتا تھا۔ قصبے میں آ کر کام کرنے کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ یہاں کی زندگی کتے کی سی ہے۔''

خلیل کے لیے کہیں بھی نہ تسلی تھی نہ امید۔

''اگر میں چھ مہینہ اجرت کے بغیر صرف کھانے پر کام کروں تو مجھے کچھ جیب خرچ

تو ملے گا ہی۔ آج تک ماں کو ایک پیسہ نہیں بھیجا۔ اگر مجھے جیب خرچ ہی مل جایا کرتا تو میں اس میں سے ہی کچھ بچا لیتا۔''

اظہر خان دکھی ہو کر بچے کو دیکھتا رہ گیا۔ اتنی کچی عمر میں اس نے جان لیا تھا کہ اس دنیا کے کیا رنگ ڈھنگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ایک دن یہ سکھی ہوگا اور اس کی تقدیر اس پر مہربان ہوگی۔

اظہر نے دوبارہ کہا ''دو چار مہینے اور پھر تم اپنے جیب خرچ سے اپنی ماں کے لیے بچا لینا۔''

وہ کوئی کام نہیں کرتیں؟ اپنی روزی کے لیے دھان کوٹتی ہیں وہ۔''

اپنے آپ کو ایک معمولی مزدور عورت کا بیٹا بتا کر خلیل کو بہت لاج آئی۔ وہ بے دھیانی میں رو میں بہہ گیا تھا۔

اظہر خاموش بیٹھا رہا۔ کس کو پتہ ہے تین چار برس بعد امجد کہاں ہوگا؟

امجد کا چہرہ اس کے تصور میں گھوم گیا اور چندر کا بھی۔ جس نے اسے خواب دیکھنا سکھایا تھا۔ اس کے ذہن کے دھند کے بھنور میں کوئی مشکل ٹھہرتی نہ تھی۔ اس بڑھتے ہوئے قصبہ میں کاروبار کے ان گنت موقع تھے۔ کیا اللہ تعالیٰ اس پر ایک بار بھی فضل نہ کرے گا؟

ایک انجانے خوف سے اس کا دل تڑپ اٹھا۔ اس نے قرآن مجید کی ایک آیت پڑھ کر اپنے پر دم کی۔

اظہر نے دیکھا کہ خلیل جماہیاں لے رہا ہے۔ وہ اس کی طرف مڑا اور بولا ''سویرے ہم سب کو کام پر جانا ہے۔ چلو، تھوڑی دیر سو جاؤ۔''

''تم نہیں سوؤ گے چاچا۔''

بھولپن کا یہ لہجہ اظہر کے کانوں میں رس گھول گیا۔

''نہیں، بیٹا، میں ایک چلم اور پیونگا سونے سے پہلے۔''

خلیل اندر چلا گیا۔ اظہر نے چلم بھری۔

رات ڈھلے ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ گاؤں کے جنگل پر بادل چھا گئے اور ایک گھڑی میں آسمان کا چہرہ سنور گیا۔

MashalBooks.org

اظہر خان اپنے فیصلے پر جما رہا۔

اپنے ٹھکانے کے قریب، بس اسٹینڈ کے پاس ایک پھونس کی جھونپڑی اس نے کرائے پر لے لی۔ برآمدہ کوئی تین فٹ چوڑا تھا۔ ایک بڑھئی دوست کی مدد سے ایک کونے میں اس نے مچان بنا لیا۔ دوکان کے لیے اہتمام بہت تھا مگر سودا کم۔ اظہر نے صرف پچیس روپے بچائے تھے۔ جس میں سے تین تو بڑھئی لے گیا۔ باقی سے اس نے دوکان کا سامان خریدا۔ سوئی دھاگہ، بچیوں کے چھوٹے موٹے گہنے، اسکول کے بچوں کے لیے پنسلیں، مٹھائیاں۔

اظہر تو ایک کونے میں پان کا سامان بھی رکھنا چاہتا تھا لیکن کچھ پان والوں نے پہلے ہی سے اس کاروبار میں بھیڑ لگا رکھی تھی۔ پھر بھی اس نے جی نہیں چھوڑا۔ اگر قسمت چمک اٹھی تو وہ اور نت نئے سودے لا کر اپنی دوکان سجالے گا۔ اسٹیشن سے چار میل دور ایک چھوٹے دوکاندار نے تھوک کے بڑے بیوپاری کی طرح کاروبار شروع کیا۔

گاہر مستری ناراض تھا اس نے معاملہ کو معمولی نہ جانا۔ اظہر جا رہا تھا۔ اب ان سب کو کرایہ زیادہ دینا پڑے گا۔ اسے باز رکھنے کو اس نے بہت کچھ کڑوا کسیلا بھی کہا۔ اسے جلن بھی ہو رہی تھی۔ گاہر کو ان تکلیفوں کا اندازہ نہ تھا جو اظہر نے پچیس روپے بچانے کے لیے اٹھائی تھیں۔ اپنے بال بچوں کو آوارہ گردوں کی طرح بھلائے رکھا اور خود اپنی جان پر سو دکھ جھیلے تھے کتنے لوگوں میں ایسی ہمت ہوتی ہے؟

گاہر بولا ''سوتم نے دوکان کھولی ہے یہاں؟ دیکھتے ہیں اب ایک حویلی بھی بنا لو گے۔''

اظہر، غریب بولا تو کچھ نہیں مگر یہ لفظ اس کا کلیجہ چھید گئے۔

''کسی نہ کسی طرح روزی تو پیدا کرنا ہی ہے۔ میں نے سوچا دوکان کھول لوں۔''

گاہر تاڑ کی طرح لمبا، بے حد دبلا پتلا اور گورا تھا۔ اس کے دانت صاف تھے وہ پان نہیں کھاتا تھا۔

''نہیں، اس میں کوئی ہرج نہیں۔'' اس نے کہا ''لاؤ ایک بیڑی دو ہمیں۔''

''بیڑی تو ہے نہیں، سب بک گئیں۔''

MashalBooks.org

اظہر کو جھوٹ بولنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی۔

گاہر اٹھ کھڑا ہوا۔

''چلاؤ اپنی دوکان ایک دن حویلی بھی بنا لو شاید۔ پھر تمہارے پاس رہنے کو میں بھی آؤں گا۔ اس بات کی خاطر کہ کبھی ہم نے اکٹھے کام کیا تھا۔''

اظہر حیران رہ گیا۔ اپنے دل میں کہا۔''اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو مجھ جیسے بدبخت غریب سے بھی حسد کریں۔''

مٹھائیوں کے مرتبان پر چیونٹیاں چڑھ رہی تھیں۔ اظہر نے اپنا دھیان ادھر لگا دیا۔

ذرا دیر بعد خلیل آ گیا۔ وہ خوش لگتا تھا۔

''چاچا، تمہاری دوکان خوبصورت لگتی ہے۔ جب تمہیں کوئی ہاتھ بٹانے والا چاہئے ہو تو مجھے دھیان میں رکھنا۔''

اظہر پھیکی مسکراہٹ مسکرایا۔

''دعا کرو بیٹا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو زیادہ دیر نہیں۔''

خلیل نے اتنی ڈھیر ساری چیزیں اپنے گاؤں میں نہیں دیکھی تھیں۔ وہ حیران ہو کر چاروں طرف دیکھتا رہا۔

''اب اکیلا ہوں میں'' اظہر نے کہا۔''تالاب تک نہانے بھی جاؤں تو دوکان بند کرنا پڑتی ہے۔ کچھ دیر کو تم میری مدد کر دیا کرو۔''

''ضرور کروں گا، چاچا، بس میں گھر سے واپس آ جاؤں۔ عودو چچا نے وعدہ کیا ہے کہ اگلی دفعہ جب وہ جائیں گے تو مجھے بھی گھر لے جائیں گے۔''

''اچھا، اچھا''

خلیل برآمدے میں ایک طرف کو ہو بیٹھا۔

''قطار میں رکھے مرتبانوں کو وہ حسرت سے دیکھتا رہا۔ بے دھیانی میں اس نے مٹھائیوں کا ایک برتن اٹھا لیا۔

''اس میں کیا ہے چاچا؟''

''مٹھائیاں''

MashalBooks.org

''کیسا مزہ ہے ان کا؟''

''بہت میٹھی۔ دو پیسہ کی ایک آتی ہے۔''

خلیل نے جھٹ سے مرتبان مچان پر رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ جیسے اکڑ گئے ہوں۔ اظہر کچھ دیر اس کی شکل دیکھتا رہا وہ ایسا دوکاندار تھا جس نے نئی نئی دوکان کھولی تھی۔ ذرا ہچکچاہٹ کے بعد اس نے کہا، ''ایک لے کیوں نہیں لیتے، بیٹا؟''

''نہیں'' اس نے جھینپ کر جواب دیا۔

اظہر نے بات اب زیادہ ٹالی نہیں اور دو چار مٹھائیاں نکال کر خلیل کو دے دیں۔

خلیل شرمائے جا رہا تھا۔ ''نہیں، چا چا، مجھے میٹھا اچھا نہیں لگتا میرے پاس پیسے بھی، نہیں ہیں۔''

''لے لو، شاباش۔''

''ایسے تمہاری دوکان کیسے چلے گی؟''

اتنا سا بچہ اور دنیا کے طور طریقوں سے ایسا باخبر؟ اظہر خان بہت حیران ہوا۔

خلیل مسکرا مسکرا کے مٹھائیاں چباتا رہا۔

''تم ذرا دیر ٹھہرو۔ میں ذرا مغرب کی نماز پڑھ آؤں۔''

خلیل فوراً مالک بن بیٹھا۔ سنجیدہ شکل بنائے، گاہکوں سے بات چیت کرتا رہا۔

اسے مزہ آ رہا تھا۔ کاش وہ بھی ایسی ایک دوکان بنا سکے۔

اظہر کی واپسی پر خلیل گھر چلا گیا۔

دوکان کے ایک کونے میں چھوٹا سا لیمپ جل رہا تھا۔ سڑک کے کنارے کنارے خلیل گھر جاتا دکھائی دے رہا تھا جہاں درختوں کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔

اتنا سا بچہ!

کیا امجد بھی یونہی اداس اور رنجیدہ موہیش ڈنگا واپس جا رہا ہوگا؟

MashalBooks.org

دسواں باب

گاؤں میں سبزی ترکاری بیچنے کے بعد شیرامی دریا بی بی سے باتیں کر رہی تھی۔ گنیش کی طبیعت خراب تھی۔ دو چار دن پہلے برآمدے سے گر پڑا تھا وہ۔ اس کی لنجی بانہہ اب بالکل ہی بے کار ہوگئی تھی۔

دریا بی بی، بیوہ کی بپتا ہمدردی سے سن رہی تھی۔ ان دنوں اکثر اسے یہ خیال آتا رہتا کون جانے اس کا اپنا کیا بنے گا؟ امجد اور نعیمہ کو دیکھ کر دریابی بی کا چہرہ اتر جاتا۔ اظہر خان نے ان پچھلے چند مہینوں میں کوئی خیر خبر بھی نہ بھیجی تھی۔ اتنے میں شاکر کی ماں چلی آئی۔ دریابی بی نے اسے بیٹھنے کو پیڑھی دی۔ ''ہماری'' طرف کبھی آتی ہی نہیں۔ دریا بو۔''

ایک ہفتہ سے دریابی بی کا ان کی طرف جانا نہیں ہوا تھا وہ شرمندہ ہوگئی۔

''اتنا ڈھیر کام۔ تم خود دیکھو۔ وقت ہی نہیں ملتا۔''

شاکر کی ماں نے اپنا دکھڑا رویا۔ ''مجھے بھی چین کہاں۔ میں تو اس بہو کی خاطر سلگ سلگ کر راکھ ہوگئی۔''

شیرامی بھی بولی ''کیا بات ہے؟''

''اس کے سن اوپر ہو گئے ہیں۔ لیکن ابھی تک بچہ نہیں ہوا۔ میں نے تو لاکھ چاہا وید حکیم بلا لاؤں، مگر اس کے دسیوں بہانے۔''

دریا بی بی نے اپنا شک ظاہر کیا ''دس مہینے؟ تمہارے گننے میں غلطی ہوئی ہے ضرور۔''

شاکر کی ماں مصر رہی۔ ''دس سے بھی زیادہ ہو گئے۔ کم نہیں۔''

شیرامی بولی۔ ''کچھ کو گیارہ مہینے بھی لگ جاتے ہیں۔''

دریابی بی ساڑی کا کونا منہ پر رکھ کر ہنس پڑی۔

''گیارہ کیوں، اٹھارہ لگتے ہیں؟''

MashalBooks.org

شاکر کی ماں کے چہرہ کا رنگ گہرا ہو گیا۔ ''میرے حلق سے نوالہ نہیں اترتا اور تم ہنس رہی ہو۔ بیٹا آئے دن بد سے بدتر ہوتا جارہا ہے۔ خدا جانے کہاں کہاں لڑنے جاتا ہے۔ اس کا بھیجہ بھی ٹھنڈا ہو جاتا اگر بچے کی شکل دیکھ لیتا۔

''مردوں کے یہی طریقے ہیں۔'' دریابی بی بولی۔ ''میرے میاں کا کچھ پتہ نہیں۔ ایک دن ٹپک پڑے گا کہیں سے۔ کوئی کیا کر سکتا ہے؟''

شیرامی نے امید دلائی۔ ''گھبراؤ مت شاکر کی ماں بھگوان بھلا کرے گا۔''

''تیرے چہرے پر افشاں برسے، شیرامی۔ مارے فکر کے مجھے تو نیند نہیں آتی۔''

دریابی بی شیرامی کی لائی ترکاری کو ٹٹولتی رہی اور بولی۔

''میں جاؤں گی ہاشو سے ملنے۔''

''ضرور'' شاکر کی ماں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اس کے دل کا بھید جاننا مشکل ہے۔ بچہ بچہ بچہ! بس ایک ہی دھن ہے اسے۔ آج کل تو سوتی بھی میرے پاس ہے۔ شاید اسی لیے میرا بیٹا اور بھی برباد ہو گیا۔ میں اپنے آپ کو سمجھا لیتی ہوں۔ پہلوٹھی کی اولاد ہے۔ میرا جی نہیں چاہتا اسے کوئی تکلیف ہو۔ ڈر کے مارے نہاتی تک نہیں۔ کہیں بخار نہ ہو جائے۔''

دریابی بی نے ہاشو کے بڑے ہوئے پیٹ کے متعلق پوچھنا شروع کیا۔

''دس مہینہ کی حاملہ عورت کی طرح سارا وقت ہانپتی یا نپتی رہتی ہے۔ کہتی ہے درد ہوتا ہے۔ مجھے ہاتھ تک نہیں لگانے دیتی۔ ایک دفعہ دائی کو بلایا، اسے انگلی تک نہیں لگانے دی۔''

''بھلا ہی ہوگا۔ تم دیکھ لینا۔'' گنیش کی ماں نے تبصرہ کیا۔ ''ایک دن تم کہو گی کہ کسی اچھوت عورت نے کیا کہا تھا۔''

لیکن بڑھیا کو ان باتوں کا کچھ اعتبار نہ تھا۔ دریابی بی سے منت کی کہ جا کے ہاشو سے مل آئے۔

''آج تو مجھے بہت کام ہے کل دوپہر کو میں ضرور آؤں گی۔ اور پتہ چلاؤں گی کہ تمہاری بہو کو کیا تکلیف ہے۔''

MashalBooks.org

شیرامی نے شکوہ کیا۔ ''آج کل کے زمانے میں آدمی کی برائی کی تھاہ ہی نہیں۔''

دریابی بی اپنی سوچوں میں گم ترکاری دیکھتی رہی۔

''شاکر بھائی آئیں تو ان سے کہنا اپنے بھگوڑے بھیا کو ڈھونڈھیں کہیں۔ میں اپنے آپ کو یہی سمجھائے جاتی ہوں میں کچھ نہیں کروں گی، پریشان نہیں ہوں گی۔''

''ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں دنیا میں؟ بچوں کا بھی کچھ خیال نہیں۔'' اپنے پچکے گال پر ہاتھ ٹکا کر شیرامی دریابی بی کو تکتی رہی۔

دریابی بی کو کسی کا ترس کھانا اچھا نہ لگتا تھا۔ اسے غصہ آنے لگا۔

''دیکھو ہماری طرف آنا ضرور۔''

شاکر کی ماں چلی گئی۔ شیرامی نے سرگوشی سی کی۔ ''مجھے چھالیہ کا ایک سڑا گلا ٹکڑا دے دو۔ آج کل کھانے کے بعد منہ میں ڈالنے کو کچھ نہیں ہوتا۔ اور میرا جی متلاتا رہتا ہے۔''

دریابی بی چھالیہ ہی نہیں تیل کی بوتل بھی لے آئی۔

تیل لگاتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے پاس آنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ برہمنوں کے پکے پکے گھروں میں تو مجھے در در اور پھٹ پھٹ کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ بھگوان سے یہ لکھوا کر لائی ہوں۔ اس نے میرا بچہ بھی اپاہج کر دیا۔''

دریابی بی نے کہا ''ہر برادری میں ایسا ہی ہے۔ سنا نہیں تم نے۔ رحیم بخش نے میرے میاں کی کیسی بے عزتی کی تھی؟ غریب ہندو ہوں یا مسلمان ایک سی ہی برتتے ہیں سب انہیں۔ چاہے وہ اپنے ہوں یا پرائے۔

''اچھا بھابی، میرے سر کی قسم کھاؤ۔ میاں کی ابھی تک کوئی خیر خبر نہیں ملی تمہیں۔ اور بس تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے یونہی بیٹھی ہو۔''

''مجھے نہیں چاہیے کوئی خیر خبر۔'' دریابی بی نے تاؤ کھا کے جواب دیا۔

شیرامی چپ ہو گئی۔ چھالیہ کا ادھا پلو کے کونے میں باندھ کر وہ چلنے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اگر پاکل مچھلی پکڑو تو مجھے بھی دے جانا لڑکے کا پیٹ خراب ہے۔''

شیرامی نے رضامندی میں سر ہلایا۔

MashalBooks.org

''ہاں ایک بات اور وہ برتن کی بات کسی کو مت بتانا۔''

شیرامی ہنس پڑی۔''تم مجھے پاگل سمجھو ہو۔''

دریابی بی نے شرم سے سر جھکا لیا۔اس برتن نے اس کی عزت کو ٹھیس پہنچائی تھی۔

''نہیں،مگر پھر بھی بتا دینا اچھا ہوتا ہے۔''

شیرامی کے آنکھ اوجھل ہوتے ہی دریابی بی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔آنسو تھمنے میں ہی نہ آتے تھے۔آنگن میں نظر ڈالتے ہی دریابی بی نے جھٹ آنسو پونچھ ڈالے۔عاشق جان کہیں ملنے ملانے گئی ہوئی تھی۔ بات کرنے کو کوئی نہ تھا۔دریابی بی ترکاری چنتی رہی۔ ترکاری چننے میں وہ شاید سارا دن گزاری دیتی اگر امجد کی آواز کان نہ پڑتی۔

''ماں،دیکھو ابا نے یہ خط اور بیس روپے بھیجے ہیں۔''

امجد خوشی کے مارے ناچ رہا تھا۔اس کے ایک ہاتھ میں کتابیں تھیں اور دوسرے میں رقم اور رسید تھامے ہوئے تھا۔امجد نے چندر کے ساتھ صرف دس دن کام کیا تھا۔اور اب دریابی بی کے حکم سے پھر مکتب جانے لگا تھا۔

دریابی بی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''سچ مچ پیسے بھیجے ہیں انہوں نے؟کس نے دئے تمہیں؟

''ڈاکیے نے۔ابا نے میرے نام بھیجے ہیں۔ڈاکیے نے مجھ سے انگوٹھا لگوایا۔''

دریابی بی کھڑی ہوگئی۔بیٹے سے دونوں نوٹ لیے اور الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔

''اپنا پتہ لکھا ہے انہوں نے؟''

''ہاں،ماں یہ لکھا ہے۔''

امجد نے منی آرڈر کا کاغذ ماں کو دکھایا۔جیسے وہ ایسی ہی تو پڑھی لکھی تھی۔کاغذ کا ٹکڑا ہاتھ میں لے کر دریابی بی نے اس پر آنکھیں جمادیں۔پہلی دفعہ اسے لکھنے پڑھنے کی حقیقت کا اندازہ ہوا۔

نعیمہ دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔بولی''ماں،چٹھی۔پیسے۔''

دریابی بی نے نعیمہ کو گود میں اٹھا کر پیار کیا۔

امجد بڑے بوڑھوں کی طرح بولا۔''ان سارے مہینوں میں صرف بیس روپے۔اس

سے تو کہیں بہتر ہے آدمی گھر رہے اور دن کے دن کی مزدوری کر لے۔ ماں، تمہیں پتہ ہے وہ ہماری زمین چھین سکتے ہیں؟ وہ ہمارے پاس رہنے نہیں دیں گے اگر ابا نے آن کر کھیتی باڑی نہ کی۔''

امجد کی باتیں اس کی سوچ کی گونج تھیں۔ لیکن اسے اپنے بیٹے کی دنیا داری کی باتیں اچھی نہیں لگیں۔

''تمہیں بہت سیانا بننے کی ضرورت نہیں۔ میں کچھ کرلوں گی اس کا۔''

''اسکول میں دو مہینے کی فیس دینا ہے۔'' امجد نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔

نوٹوں کو ساڑی کے پلو میں باندھتے ہوئے اس نے امجد کو دو چار پیسے دیئے۔ ''جاؤ جا کے اپنے دونوں کے لیے بسکٹ لے آؤ۔''

نعیمہ ماں کی گود سے نیچے اتر گئی۔

عاشق جان گھر آئی۔ گاؤں میں کہیں فاتحہ کا کھانا تھا۔ ساڑھی کے پلو کے نیچے چھپی پوٹلی اس بات کی گواہی تھی کہ وہ خالی ہاتھ گھر واپس نہیں لوٹی تھی۔

''میں پکانے ریندھنے کے وقت سے پہلے ہی پلٹ آئی۔ بچے میرے ساتھ کھائیں گے۔ کافی سالن بھات ہے۔

''نہیں، میں پکانے جا رہی ہوں۔''

''بے کار میں بھات کا خرچہ کروگی؟ بیٹا''

بڑھیا کا پلو پکڑ کے نعیمہ چلائی۔

''دادی، ابا نے پیسے بھیجے ہیں۔''

بڑھیا کی آنکھوں میں خوشی کے مارے آنسو بھر آئے۔

''سچ مچ، دریا بو۔ ہمارے بیٹے کی خیر خبر آئی کوئی؟''

''ہاں، خالہ۔ پیسے بھی بھیجے ہیں۔''

امجد نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''اب تو ہمیں پتہ بھی معلوم ہے۔ کسی دن میں ان سے ملنے جاؤں گا۔'' خوشی کے مارے عاشق جان یہ بھول گئی کہ دریا بی بی کو تکرار اچھی نہیں لگتی۔ ''بچے کھالیں گے میرے ساتھ۔''

MashalBooks.org

''نہیں'' دریا بی بی نے کہا۔''امجد دوکان پر جاؤ۔ اور نعیمہ تم بھی جاؤ بھائی کے ساتھ۔''

دکھی اور اداس بڑھیا اپنی جھونپڑی کی طرف چلی۔ آج اس کے پاس پیسے ہیں تو خیرات کا کھانا گھٹیا لگتا ہے۔ وہ ناراض ہو کر سوچتی رہی۔ اس کو معلوم تھا دریا بی بی کتنی ضدی ہوسکتی ہے اس لیے وہ چپ رہی۔

دریا بی بی کڑے تیوروں سے عاشق جان کو جاتا دیکھتی رہی۔

چند مہینے پہلے جب نعیمہ نے ایک ٹکڑا کپڑا گنوا دیا تھا تو دریا بی بی نے بچی کو دھن کر رکھ دیا تھا۔

ایک شام نعیمہ پھر کپڑا گم کر آئی۔ دریا بی بی نے ایک حرف نہ کہا۔ ہر طرف سے تنگ حال ہونے پر ایسے صدمے اسے کچل کر رکھ دیتے تھے۔

شاکر کی ماں کے کہنے پر اگلے دن دریا بی بی ان کے گھر گئی۔ پچھلے کئی دنوں سے شاکر گھر پر ہی تھا۔ شاید روبنی چودھری نے اپنے اسامیوں کو ٹھنڈا کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ان کے گھر کے راستے میں دریا بی بی کی اس سے ملاقات ہوگئی۔

''آ گئیں تم، بھابی، اتنی جلدی۔''

دریا بی بی مسکرائی ''کام کے مارے اس سے پہلے نکلنا ہی نہ ہوا۔''

شاکر اپنے اکھڑپن اور بدتمیزیوں کے لیے بدنام تھا۔ لیکن دریا بی بی سے اس کا برتاؤ نرمی اور مٹھاس کا تھا۔ اس سے بات کرتے وقت ہمیشہ لحاظ کے مارے آنکھیں نیچے رکھتا۔ اس کے سامنے وہ گھبرا جاتا۔ یوں نیکی کو شاکر کی طبیعت سے دور کا سروکار نہ تھا۔

ساڑی کا پلو سر پر کھینچ کر دریا بی بی نے کہا''شاکر بھائی، لگتا ہے اب سر پھاڑنے کا کام نہیں تمہارے پاس، اس لیے مل گئے۔''

''تم بھی مجھے شرمندہ کرتی ہو۔ دریا بی بی۔ یہ صحیح ہے جب میں لاٹھی گھماتا ہوں تو سر کھل جاتے ہیں۔ پیٹ کی خاطر آدمی کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں گھر بیٹھ جاؤں تو کون کھلائے گا۔''

''تمہارا چچا زاد بھی گھر نہیں بیٹھا۔ وہ دنیا کھوجنے گیا ہے۔ دیکھو کیا مال دولت لے

کر گھر پلٹتا ہے۔''

شاکر نے خوشی اور حیرت سے پوچھا۔''کوئی خیر خبر ملی ان کی؟''

''ہاں، کسی جہان پور میں ہیں۔''

''سبحان اللہ۔ عجیب آدمی ہیں۔ اب کیسے لمبا غوطہ لگایا۔ ہے نا!''

''دال بھات سے کوٹھا بھرا ہے تو اور کون رنگ رلیاں منائے گا؟''

شاکر زور سے ہنسا۔

''تمہارے رئیس، چچا زاد کی حرکتوں پر ہر کوئی ہنستا ہے۔''دریا بی بی نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔

''تم ناراض ہو۔ تمہارے خیال میں مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ دال بھات کی فکر میں وہ اپنے لیے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ کیونکہ اگر دال بھات نہ ہو تو چہرے اینٹھ جاتے ہیں..... میں اسی لیے سر پھٹول کرتا پھرتا ہوں۔ چلو کوئی میرا بھی پھوڑ دے کس کو پرواہ ہے؟ تم میرے بھائی کو ناحق الزام دیتی ہو۔''

دریا بی بی نے مسکراتے ہوئے کہا۔''تم کہیں باہر جا رہے تھے جاؤ۔ میں تمہاری ماں سے مل آؤں۔ تمہیں اپنے بھائی کی حمایت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔''

وہ دریا بی بی کے سامنے جھکا جیسے کسی شاہزادی کو کورنش کر رہا ہو۔ مڑنے سے پہلے تھوڑی دور تک شاکر الٹے پاؤں چلتا گیا۔

دریا بی بی کی ہنسی گلی میں گونج اٹھی۔ ذرا آگے ہی شاکر کا آنگن تھا جہاں بانس کے مچان پر لوکی بیل چڑھی ہوئی تھی۔

شاکر کی ماں دریا بی بی کو دیکھ کر کھل اٹھی۔''تم، دریا بو، اور اگلی میں اس طرح ہنستی آؤ؟''

''شاکر بھائی مل گئے تھے۔ کہہ رہے تھے اگر میں سر نہ پھاڑوں تو مجھے کون کھلائے گا۔ کیا میں بے کار میں لٹھ پونگا کرتا پھرتا ہوں؟''

''اس کی بات مت ماننا۔ یہ سنتے سنتے میرے تو کان پک گئے۔ آؤ اندر آجاؤ۔''

MashalBooks.org

اپنی ساس کی آواز سن کر ہاشو باہر آئی او رلوکی کی بیل کے سائبان تلے کھڑی ہو گئی۔ بہت دبلی او رکمزور لگ رہی تھی۔اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں او راس طرح اداس تھیں جیسے روبہ صحت ہوتے کسی مریض کی۔ساس اسے دیکھتے ہی طیش میں آ گئی۔

''وہ کھڑی ہے بد بخت کی جنی۔کیا اللہ تعالیٰ کبھی بچے دے گا اسے؟''

ہاشو نے کوئی جواب نہ دیا۔اس کی تھکی آنکھیں زمین پر کچھ ڈھونڈھ رہی تھیں۔

''بے کار میں کیوں غصہ ہوتی ہو چاچی؟ کم عمر ہے وہ ، بچی ہے بالکل۔ اگر اس طرح ایک ہونے والی ماں کوستاؤ گی تو بیمار ہو جاؤ گی۔''

''تو کیا میں بیمار نہیں ہوں۔''

دریا بی بی نے جیسے ہی ہاشو کی طرف قدم بڑھایا وہ آنکھوں میں ڈر لیے پیچھے کو ہٹ گئی۔

''ہاشو۔''

''جی، بوبو''

''ٹھیک ہو تم؟''

''نہیں۔''ایک مختصر او راطاعت گزاری کا جواب۔

''پچھلے چند دنوں میں ہی تم کافی بدل گئیں۔دنوں کا حساب رکھا تم نے؟''

ہاشو نے جھوٹ موٹ کی شرم سے سر جھکا لیا۔

گیارہ مہینے بیت گئے۔ بہت درد ہے تمہیں؟''

''جی''

''چلو، دیکھیں تو ذرا۔''

''نہیں، شکریہ''

شاکر کی ماں کی طرف مڑ کر دریا بی بی نے پوچھا۔''اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تم نے؟ بچہ ہلتا جلتا بھی ہے؟ بڑی مشکل ہو جائے گی اگر کہیں مردہ بچے کو لیے پھر رہی ہے وہ۔''

''بیٹا، مجھے تو وہ ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔''

MashalBooks.org

ہاشو واپس جانے کو ہوئی، دریابی بی نے اسے پکارا۔ ''کہاں جا رہی ہو، ہاشو؟''

''پیاس لگ رہی ہے، بوبو۔''

''پانی پی کے آجاؤ جلدی سے۔'' اس کی ساس نے حکم چلایا۔ دریابی بی نے سمجھ داری سے سر کے اشارے سے ہاں میں ہاں ملائی۔

''میری عمر اب دکھ اٹھانے کی نہیں ہے۔ مجھے تو مصلے پر بیٹھ کر اللہ اللہ کرنا چاہئے۔ ان کے لیے اس کے فضل کرم کی دعا مانگوں۔ پر ایسا کہاں ہوگا۔''

''تم کیا کر سکتی ہو چاچی؟ ایسی بھولی بچی ہے وہ تو۔ اگر تم چھوڑ دوگی تو گھر بار کی دیکھ بھال کون کرے گا؟''

ہاشو اپنے کمرے سے باہر ہی نہیں آ رہی تھی۔ یہ دونوں انتظار میں بیٹھی ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ٹالتی ہیں۔

''میری جان، تم ذرا دیکھ ہی لو۔ اگر کہیں مردہ بچہ، اس کے پیٹ میں ہے تو بڑی آفت ہوگی۔''

''اپنی بہو کو بلاؤ۔ چاچی''

ساس کی آواز سن کر ہاشو باہر آئی اور مچان کے نیچے کھڑی ہوگئی۔

سر جھکائے وہ سسکیاں لیے جا رہی تھی۔

دریابی بی نے ہاشو کی سوکھی دبلی بانہہ پکڑ کر کہا۔ ''کیوں روتی ہو میں بھی عورت ہوں، تمہارا دکھ سمجھتی ہوں۔ کوئی عورت خوش نہ ہوگی اگر اس کا میاں لفنگا نکل جائے''

شاکر کی ماں کو دریابی بی کے دلاسے تسلی سے کچھ نہیں لینا دینا تھا۔

''بانجھ ہے یہ بیٹا، اتنے سال ہو گئے بیاہ کو۔ شاکر اپنے طور طریقے بدل لیتا اگر اس کے گھر بچہ ہو جاتا۔''

ہاشو کی پیلی کمزور انگلیاں دیکھ کر دریابی بی نے کہا ''میرے دو بچے ہیں۔ کیا روک لیا میرے میاں کو آوارہ گردی سے انہوں نے؟ اتنے بڑے آدمی کے لیے اتنی کم عمر لڑکی کیوں لائیں تم؟''

اب ساس کچھ نہ بولی۔

MashalBooks.org

''ہاشو، دیکھنے بھی دو اپنا پیٹ مجھے۔ اگر تمہارے نصیب میں یہی تھا اور کہیں جو بچہ مر گیا ہے اندر تو تمہیں تو بچالیں ہم۔''

ہاشو زور زور سے روتی ہوئی بولی۔ ''مر جانے دو مجھے بوبو۔ میں ہر کسی کے گلے میں اٹکتی ہوں۔ میرے حق میں یہی اچھا ہوگا کہ قبر میں اتر جاؤں۔''

دریا بی بی نے پیار سے اس کی ٹھوڑی چھوئی اور بولی۔ ''بری باتیں مت کرو۔ پیٹ دیکھنے دو مجھے۔''

''میں تمہارے پیر پڑتی ہوں بوبو پیر پڑتی ہوں میں۔''

ہاشو ایسا بلک کر روئی کہ اس کے گلے میں پھندا پڑ گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ اس طرح چھپا لیا جس طرح چڑیا شکرے کے پنجوں سے اپنے بوٹ بچاتی ہے۔

''تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ بس میں ذرا سا دیکھوں گی''

ہاشو پیچھے ہٹتی گئی۔

دریا بی بی نے تیزی سے کمر پر سے اس کی ساڑھی پکڑ کر کھینچ لی۔ کیا تھا یہ سب کچھ؟ کپڑوں کا ایک ڈھیر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر رہا تھا۔ ایک ذرا سا جھٹکا اور اور ڈھیروں چیتھڑے ہاشو کے پھولے پیٹ سے نیچے پھسل پڑے۔ نعیمہ کا کھویا ہوا کپڑا، لال گمچا، گاؤں کے بچوں کے چرائے ہوئے ڈھیروں کپڑے اس ڈھیر میں تھے۔ ہاشو بے ہوش ہو کر دھڑ سے مچان کے نیچے گر پڑی۔ اس کا پیٹ ٹھیک ٹھاک تھا۔ بالکل جیسا عام طور سے ہوتا ہے۔ کہیں سوجن کا ذرا سا نام نشان نہ تھا۔

شاکر کی ماں اور دریا بی بی چیتھڑوں کے ڈھیر کے سامنے ہکا بکا کھڑی تھیں۔

MashalBooks.org

گیارھواں باب

اظہر روپے پیسے کے معاملے میں محتاط آدمی تھا لیکن اس نے کاروبار کے داؤ پیچ نہیں سیکھے تھے۔ دوکان بنانے سے پہلے بس اسنے زبانی حساب کتاب ہی کو کافی سمجھ لیا تھا۔ اب ہر قدم پر اسے اپنی غلطی کا احساس تھا۔ ایسے وقتوں میں وہ لوگ جنہیں دنیا کی سمجھ نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ سے آس لگا لیتے ہیں۔

ریل پر آنے جانے والے بہت سے مسافر بڑی سڑک کے راستے اپنے اپنے گاؤں جایا کرتے۔ زیادہ تر تو قصبہ کے ہی رہنے والے تھے۔ اسی لیے سودا سلف وہیں سے خریدتے۔ چیزیں وہاں سستے داموں مل جاتیں اس لئے انہیں یہاں سے خریداری کی نہ پرواہ تھی نہ ضرورت۔ وہ جو دیہات میں رہتے تھے ان کی کوئی آمدنی نہ تھی۔ ایک ہی مہینہ میں اظہر نے اس تلخ حقیقت کو پالیا تھا۔ مستقبل کے اندھیرے سے فریب نظر تو اشارے کیا ہی کرتے ہیں۔ اظہر جیسے دین دار اس سراب کو ایمان کا حصہ ماننے کی غلطی کرتے ہیں۔ اظہر کے پاس تھوڑا بہت سرمایہ تھا۔ گھر بھی ایک ہی دفعہ پیسے بھیجے تھے۔ جب تک کچھ اصل موجود تھی وہ آنے والے وقت سے امید رکھنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

کبھی کبھار علاقہ کے ہاٹ بازار سے واپس آتے ہوئے عورتیں اظہر کی دوکان کے سامنے ٹھہر جاتیں۔ وہ خود کبھی شہر نہیں گئی تھیں اس لیے شہر کی چیزیں انہیں بہت بھاتی تھیں۔ لیکن کتنے پیسے خرچ کر سکتی تھیں وہ؟ پلاسٹک کا ایک سستا کنگھا، دو پیسہ کا موباف، سوئی دھاگہ یا پیر رنگنے کے لیے آلتا کی ڈبیہ۔ یہ عورتیں صرف ہاٹ لگنے کی دن ہی آتیں۔

اظہر کے خواب، اس کے ہوا محل سب اسی دوکان سے جڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنے عقیدے کے اس مرکزی اصول سے کبھی غافل نہیں ہوا کہ آدمی کا ایمان پکا ہو تو دن کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتے ہیں۔ کئی دفعہ وہ اپنے لیے کھانا تک نہ پکاتا۔ حلوائی سے دو پیسہ کا

MashalBooks.org

چیوڑاور بتاشے لے کر وقت کاٹ لیتا۔ اپنے لیے اس کی امیدیں بہت اونچی نہ تھیں۔ اس لیے اظہر خان کا اپنے خالق پر ایمان کبھی نہیں ڈولتا تھا۔

جمعہ کو سفید لنگی اور دو پلی ٹوپی پہنے وہ تین میل دور نماز پڑھنے کے لیے پیدل جاتا۔ اس کی دوکان بس ان ہی ایک دو گھنٹوں کو بند ہوتی۔ وگرنہ دوکان کی دیوار پر چھوٹا سا لیمپ اس وقت تک جلتا نظر آتا جب تک کہ اسٹیشن کے لیے آخری بس نہ چھوٹ جاتی۔ ایک دو مہینے گزر گئے۔ دوکان سے آمدنی تو ہوئی نہ تھی اظہر پھر بڑھیوں سے جا ملا۔ گاہر نے خوب ہنسی اڑائی۔ اظہر نے اس سے بول چال بند کر دی۔ اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایسا حاسد آدمی اس کا ساتھ کیسے تھا۔ اب دوکان شام کو دن بھر کے کام کے بعد کھلتی۔ ہاٹ کے دنوں میں وہ کام پر نہ جاتا اور بس ان ہی دنوں میں وہ دو چار پیسے کما لیتا۔

ایک دن گاہر بن بلائے ہی بات کرنے کو آ پہنچا۔ ''اظہر بھائی تم مجھ سے بولتے نہیں۔ تمہارے خیال میں میں بے کار میں خفا ہوتا ہوں۔ میرے نصیب تو پیدا ہونے سے پہلے ہی پھوٹ گئے تھے اس زندگی میں تو مجھے کچھ ملے گا نہیں۔''

اظہر نے آنکھ اٹھا کر اسے دیکھا۔

گاہر بولے گیا۔ ''اگر تم میں حوصلہ نہیں ہے، پیسہ کمانے کے داؤ پیچ نہیں آتے تو تمہارے خیال میں صرف دوکان کھولنے سے پیسہ کما لو گے؟''

گاہر کی ہمدردی میں کوئی بناوٹ نہ تھی۔

''تم نہیں بولو گے خان، تو مجھے بولنے دو۔ سنو۔ اپنے گاہکوں کو ٹھگنا پڑے گا تمہیں۔ اور ایسا کرنے کے لیے ڈھیروں طریقے ہیں۔ قسم کھاؤ۔ بار بار۔ کہو اسی قیمت پر دے رہا ہوں جس پر خریدی تھی۔ اگر نفع لوں تو سور کھاؤں۔ اور جب تم سات سو سور کھا چکو گے، تو شاید کچھ کما سکو۔ پھر تم حج کرنے جا سکتے ہو اور حاجی کہلا سکتے ہو۔ مکہ مدینہ چلے جانا اور بس سب پاپ دھل جائیں گے۔''

اب اظہر نے بھی منہ کھولا۔ ''صحیح ہے۔ آدمی تجارت نہیں کر سکتا اگر نفع نہ کمانا چاہتا ہو۔''

''تو پھر بس جھوٹ بولنا پڑے گا تمہیں۔ سچ بولو گے تو کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ شاید

بالکل بھی نہیں۔ اس سے بال بچے نہیں پال سکتے تم۔''

یہ الفاظ اس کے دل میں تیر کی طرح چبھ رہے تھے۔ اسے اپنا آپ چھوٹا لگ رہا تھا۔ اس کا ذہن ان بھول بھلیوں سے نکلنے کا راستہ بے چینی سے ڈھونڈ رہا تھا۔

''ایماندار آدمی کے لیے بال بچے پالنا بہت مشکل ہے۔'' اس نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

''صرف مشکل ہے؟''

گاہر نے بیڑی سلگائی۔

دو چار اور مستری بھی کام سے واپس آ گئے تھے۔ اظہر نے آج دوکان نہیں کھولی تھی۔ اسے ان کے ساتھ بیٹھنے میں مزہ آ رہا تھا۔

گاہر نے آواز دی۔ ''عودو آ گئے تم؟''

کمرے کے ایک کونے میں لیٹے عودو کے کان ان کی بات چیت کی طرف لگے تھے۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے جواب دیا۔

تمہیں بیلے گھاٹ کا گودام والا یاد ہے۔ جس کے لیے ہم کام کیا کرتے تھے۔ اس سور نے کیسی بے ایمانی ہم سے کی تھی!''

عودو تھکا ہوا تھا۔ وہ سونے کی فکر میں تھا۔ اب وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''پتہ ہے کتنا مشہور آدمی ہے وہ اب؟ کئی مسجدیں بنوادی ہیں اس نے۔ مگر ہماری مزدوری نہیں دی۔ اس کی طرف ہمارے کتنے پیسے نکلتے ہیں، گاہر؟''

''چودہ روپے چھ آنے۔''

گاہر نے بیڑی کی راکھ جھاڑی۔ ''جہنم میں جلے گا چودہ برس۔''

اظہر بولا ''یہ ممکن نہیں ہے۔ کراماً کاتبین ہماری نیکی بدی لکھتے رہتے ہیں۔ حشر کے دن وہ تولیں گے کہ کون سا پلڑا بھاری ہے۔ اگر کسی نے چودہ روپے مار لیے اور پھر ایک مسجد بنا دی تو پھر کوئی گناہ گار نہیں رہا۔ پلڑا تو اچھے کام کی طرف ہی جھکے گا۔''

گاہر نے طنز کیا۔ ''وعظ بند کرو، اظہر بھائی۔ چودہ روپیہ سے مسجد بنا سکتے ہو تم؟

MashalBooks.org

کتنے چودہ مار لیے اس نے دوسروں کی محنت کی کمائی سے؟''

اظہر مان گیا۔''تم ٹھیک کہتے ہو؟''

''دوکان نہ چلے گی تم سے اگر ایسے ہی سوچو گے۔ اس مسجد والے گودام کے آدمی کی طرح سوچو۔ غبن کرنا، دھوکہ دینا سیکھو، بہت ہی پھلو پھولو گے۔''

''نعوذ باللہ''

گاہر کھل کھلا کر ہنسا۔

''بہت اچھی دوکانداری کرو گے تم! جمعہ کے دن تمہاری دوکان بند دیکھتا ہوں اسی دن گاہک آتے ہیں۔ تو کیا دوکان بند رکھنے سے کاروبار چلے گا؟''

اظہر کو آسانی سے غصہ نہیں آتا تھا۔ لیکن آج وہ احتجاج کرنے پر مجبور ہو گیا۔

''کیا کہہ رہے ہو گاہر بھائی؟ میرے لیے پیٹ کیا میرے ایمان سے زیادہ ہے؟''

''اگر یوں ہی ایماندار بنے رہے تو بھیک مانگتے پھرو گے؟''

گاہر حقارت سے ہنسا۔ کچھ دیر بعد اس نے آواز دی''خلیل، بیٹے، چلم تو بھر دے ہمارے لیے۔''

کمرے کے ایک کونے میں کھانا پک رہا تھا۔ خلیل سالن کی ہانڈی کے نیچے آگ دہکا رہا تھا۔ چھوٹا ہونے کے مارے ہر کوئی اسے کام کے لیے دوڑاتا۔

''اچھا، چاچا۔''

گاہر خلیل کا چچا نہ تھا۔ لیکن عودو کا ساتھی ہونے کی وجہ سے یہ رشتہ جڑ گیا تھا۔

''حقہ پلاؤ ہمیں۔ اب اور نہیں ہرا جاتا۔''

خلیل تمباکو سے خوب چلم بھر کر حقہ لے آیا۔

گاہر نے حقہ اظہر کو دیا۔''خان زادے، تم شروع کرو''

''نہیں تم شروع کرو۔'' اظہر نے رسان سے جواب دیا۔

گاہر اب بہت ہی تمیزدار ہو رہا تھا۔ اظہر کے ادب میں اس نے انکار کر دیا۔

''آنکھیں بند کیے، لگاتار کئی کش لگا کر، اظہر نے دھواں چھوڑا۔ تو گاہر ہنستے ہوئے بولا۔''اپنی عقل کے سلفے کا دم بھی لگاؤ، خان کی اولاد۔ یہ دنیا بہت ظالم ہے۔''

MashalBooks.org

نڈھال ہوکر، آنکھیں بند کیے وہ حقہ کے کش لگاتا رہا۔

عودو، جس کا جی حقہ پینے کو چاہ رہا تھا اظہر کو دیکھے جا رہا تھا۔ خلیل اپنی جگہ پر واپس چلا گیا تھا۔ لکڑیوں کی آگ کی لو میں اس کا پسینے سے بھیگا چہرہ نظر آ رہا تھا۔

حقہ کی نے ہاتھ میں لیے گاہر نے پھر باتیں کرنا شروع کر دیں۔ اس کا بڑا تجربہ تھا۔ کاروبار کی دنیا میں اس کا بہت سے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا۔ وہ جس نتیجہ پر پہنچا تھا وہ ایک ہی تھا ایماندار آدمی کی اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔

اظہر کی جیب میں تسبیح رہتی تھی۔ لفظوں کی اس بوچھاڑ کے بیچ وہ ایک آدھ دانہ تسبیح کا بھی پڑھ لیتا۔ وہ اس بات پر حیران تھا کہ اس عمر میں گاہر کو کتنا تجربہ تھا۔

''عودو''

عودو کروٹ لیے چٹائی پر لیٹا تھا۔ گاہر اس طرح یہ جانچ رہا تھا کہ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے۔

''کیا ہے؟''

''عودو، یہ سنو، ان دونوں میں ہوڑہ میں تھا۔ ایک دن ایک آدمی میرے پاس آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس میرے لیے ایک کام ہے۔ کام ختم کرنے پر پیسے ملیں گے۔ ہم نے معاملہ پٹایا۔ کام کی اجرت پانچ روپیہ۔ جب میں نے پیسے مانگے تو اس نے کہا۔ ''وہ سامنے میرا گھر ہے۔ میرے پاس دس روپیہ کا نوٹ ہے۔ اس سے چھوٹا نہیں۔ تم مجھے پانچ روپیہ دو اور میں گھر پہنچتے ہی تمہیں دس کا نوٹ دے دوں گا۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔ میں نے اسے پانچ کا نوٹ دے دیا۔ دس منٹ چلنے کے بعد اس نے کہا وہ رہا میرا گھر یہاں ٹھہرو۔ میں پیسے لے کر آیا۔

سامنے ایک مسلمان گھر تھا۔ ٹاٹ کی بوری کا پردہ دروازے پر لٹکتا ہوا۔ میں انتظار کرتا رہا۔ کرتا رہا۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ وہ آدمی نہیں نکلا تو میں نے پکارنا شروع کیا۔ ایک عورت لیمپ لیے نکلی۔ ''کسے بلا رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔ گھر کے مالک کو۔ میں نے کہا۔ یہاں تو ایک مالکہ ہیں۔ مالک نہیں۔ اندر آنا چاہو گے؟ میں حیران رہ گیا۔ عین ہیرا منڈی کے بیچوں بیچ۔ گلی سے آگے سڑک تھی۔ جہاں میرا آقا غائب ہو گیا تھا۔''

شاید اتنی دلچسپ کہانی کے مزے میں، عودو اٹھ کر بیٹھ گیا اور مسکرا کر پوچھا۔

''پھر؟''

''پھر کچھ نہیں۔ میں الو کے پٹھوں کی طرح اسے تکتا رہ گیا۔

''مالکہ کے ساتھ انتظار نہیں کیا تم نے؟''

''خالی ہاتھ انتظار بھی نہیں کر سکتے۔ سنو ابھی آگے بھی ہے۔ سات برس بعد میں پوسٹا سے گزر رہا تھا کہ میں نے اس بڑے بیوپاری کو بیٹھے دیکھا۔ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ وہی آدمی تھا جس نے مجھے ٹھگا تھا۔ گاؤ تکیئے سے ٹکا خوشامدیوں کے جھرمٹ میں۔''

عودو نے اپنی انگلیاں چٹخائیں۔''سو اپنے پیسے مل گئے تمہیں واپس''

''پیسے واپس؟ میں بھاگ گیا وہاں سے۔ اپنے میلے کپڑوں اور برے حلئے کے ساتھ ٹھہر سکتا تھا میں وہاں؟''

حالانکہ اظہر تسبیح پھیر رہا تھا مگر اس کا سارا دھیان گاہر کی طرف تھا۔

''تم نے واقعی پہچان لیا تھا اس آدمی کو؟'' اس نے پوچھا۔

''یقیناً'' میری آنکھیں ان سود خور کابلیوں کی سی ہیں۔ زیادہ غلطیاں نہیں کرتا میں۔ خان کے پوت۔ وہ دھوکہ بازی سے امیر بن گیا۔ نیکی کی گنجائش ہے ابھی کہیں؟''

''کوئی طریقہ نہیں ہے بے ایمانی کئے بغیر جینے کا؟ کوئی بھی طریقہ نہیں''

اظہر کا سوال ایک دلدوز چیخ لگتا تھا۔ اس نے اتنے دکھ سے گاہر کی طرف دیکھا کہ گاہر نے اپنا منہ پھیر لیا۔ وہ خود بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''اگر مجھے پتہ ہوتا تو میں ان حالوں جیتا۔''

کمرے میں سب چپ ہو گئے۔ چولھے پر رکھی ہنڈیا میں سے سیٹی کی سی آواز نکلی۔ اظہر مشینی طریقے سے تسبیح پھیرے جا رہا تھا۔ اس کی انگلیاں تیزی سے چل رہی تھیں۔ گاہر تک بھی خاموش ہو گیا۔ اس کے پاس بھی کوئی جواب نہ تھا۔

خلیل چاول بسانے باہر چلا گیا تھا۔ انہوں نے ایک بڑی عجیب چیخ سنی۔ جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہو اظہر چلایا''گاہر، یہ باہر کیا تھا؟''

عودو، گاہر اور اظہر باہر کو لپکے۔

MashalBooks.org

خلیل رو رہا تھا۔ چاولوں کی پتیلی ایک طرف لڑھکی ہوئی تھی۔

''کیا ہوا؟'' سب کا ایک ہی سوال تھا۔

''میرا ہاتھ جل گیا۔ ارے میری ماں''۔

چونکہ خلیل سب سے چھوٹا تھا اس لیے اس کے دم سے یہ سب عیش کرتے تھے۔ گاہر زیادہ تر تن آسانی کرتا اور عودو تو بالکل نواب بن گیا تھا۔ آخر خلیل اس کا بھتیجا تھا۔

اظہر جلدی سے بولا۔ ''اسے اندر لے چلیں۔ روشنی میں دیکھیں۔'' بیٹا، کچھ احتیاط کیا کرو۔ عودو نے اسے ڈانٹنا شروع کر دیا۔ ''اتنا بڑا ڈھینگت۔ عقل تمیز ذرا سی نہیں۔ دوسروں کے بچوں کی خاطر میری جان مشکل میں پڑتی ہے۔

گاہر جسے خلیل پر عودو کے ظلم کا مزہ آتا تھا اس وقت آپے سے باہر ہو گیا۔

''عودو جو تمہارے منہ میں آ رہا ہے بک رہے ہو۔ تمہارے خیال میں ایک بچے کے لیے ڈیڑھ سیر چاول پسانا عام بات ہے؟ خود تو کبھی چھ مہینہ میں بھی دیگچی کو ہاتھ نہیں لگایا۔''

عودو بڑبڑا کر رہ گیا۔ گاہر منہ پھٹ اور زبان دراز تھا اسے جواب دینے کی ہمت اس میں نہ تھی۔ گاہر نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''ہم بچے کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ تم دیگچی لے کر آؤ اندر ورنہ کتا دعوت اڑائے گا۔''

عودو دیگچی تو اندر لے آیا مگر مارے غصے کے خلیل کی طرف دیکھا تک نہیں۔ تھوڑی دیر میں خلیل کی انگلیوں کے پوروں پر چھالے پڑ گئے۔ گاہر بہت پشیمان تھا۔

''جی چاہے تو چولھا سلگا لینا، لیکن اگر کبھی ان چیزوں کو پھر ہاتھ لگایا تو۔''

ایسے میٹھے لفظ اور گاہر کی زبان سے! خلیل کی جلی انگلیوں کی تکلیف قدرے کم ہو گئی۔ گاہر نشے میں تھا کیا؟

اظہر بولا۔ ''میں آلو کچل کر لگاتا ہوں، درد کم ہو جائے گا اس سے۔''

اظہر ایک آلو کچلنے لگا اور اتنی دیر میں گاہر چھالوں کو پنکھا جھلنے لگا۔ سالن ابھی پکا نہ تھا۔ عودو وہیں کہیں برتن بھانڈوں میں لگا رہا۔ اسے کسی اور بات سے غرض نہ تھی۔

اظہر نے خلیل کی انگلیوں پر آلو لیپ کر کے ایک دھجی لپٹ دی۔ دھیرے دھیرے

MashalBooks.org

درد کم ہونے لگا۔

ایک بار پھر خلیل نے اظہر کی طرف شکر مندی سے دیکھا۔

جیسے وہ خود سے کہہ رہا ہو''چا چا، جب تم اپنی دوکان بڑھالو گے تو مجھے بھی لگا لو گے؟''

اظہر نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ کچھ بولا نہیں۔

اس کو انوکھا معاہدہ جان کر خلیل خوش ہو گیا۔

''مجھے یہ کام اچھا نہیں لگتا۔''

عودو نے خلیل پر نظر ڈالی اور پھر کھانا پکانے میں لگ گیا۔ اس کی آنکھوں میں کیا تھا اس کا پتہ نہ لگتا تھا۔

گاہر پنکھا جھلے جا رہا تھا۔ خلیل کے منہ سے ذرا ذرا دیر بعد آہ نکل جاتی تھی۔ جلن تو کم ہو گئی تھی لیکن درد کی تپکن اس کی کلائی تک تھی۔

''اظہر چاچا، اللہ تمہاری دوکان بڑی کر دے۔''

''سونا برسے تم پر، بیٹے۔''

گاہر نے کچھ نہیں کہا۔ پنکھا نیچے رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ہاتھ منہ دھونا چاہ رہا تھا۔ اس کی جگہ اظہر نے پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔

خلیل کو عودو سے ایسا ڈر لگتا تھا جیسے عزرائیل سے۔ چچا بھتیجا ایک دوسرے سے شاذ ہی بات کرتے۔

جھجکتے ہوئے خلیل بولا''عودو چاچا، اللہ تعالیٰ کے واسطے ماں کو مت بتانا۔ وہ بہت روئے گی۔''

پہلے تو عودو کچھ نہ بولا۔ ذرا دیر بعد کہنے لگا''ایک دو دن میں گھر لے جاؤں گا میں تمہیں۔ بیٹھے بیٹھے روٹیاں توڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

ایک پل کو تو خلیل خوش ہو کر کھل اٹھا۔ مگر چچا کی آخری بات ایسے تھی جیسے اس کے سارے جسم پر کسی نے سیاہی پوت دی ہو۔

''نہیں چچا، میں گھر نہیں جاؤں گا۔ جب تک کام نہ سیکھ لوں۔''

MashalBooks.org

''ٹھیک ہے، ایسے ہی سہی۔ بھلا ہو جائے گا اس میں تمہارا۔''

عودو نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور ہنڈیا سے چین اتارا۔ ہنڈیا کھدر بدر ابل رہی تھی۔ خلیل اپنی تھکی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

گاہر واپس آیا اور پنکھا اٹھالیا۔ شام کی باتوں سے اسے ناگواری ہوئی تھی۔ اس نے کسی سے نہ مذاق کیا اور نہ ہی مسکرایا۔

کھانا پک چکا تو گاہر نے خلیل کی رکابی میں دال، سالن، بھات میں ملا دیا۔ اظہر خاموشی سے نوالے بنا کر اسے کھلاتا رہا۔ اس وقت تک خلیل کی انگلیوں کے چھالے لال انگارہ ہو چکے تھے۔

جمعہ کا دن تھا۔ اظہر ساتھ کے گاؤں میں نماز پڑھنے گیا تھا۔ دوکان بند کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس حادثے کے بعد خلیل کام پر تو جا نہ سکتا تھا وہ اظہر کی غیر حاضری میں دوکان کی دیکھ بھال کیا کرتا۔ اس کے چچا کو اس کا بے کار بیٹھ کر کھانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس نے اظہر سے کہا کہ وہ اسے دو آنے اجرت دے دیا کرے۔ اس نے معذرت بھی کی کہ تنگی اور مفلسی کے مارے وہ ایسی بدلحاظی کی بات کر رہا ہے۔ مزدوری لے کر خلیل دوپہر کا کھانا کھانے چلا گیا کہ وہ عصر کی نماز سے پہلے پہلے دوکان پر واپس آجائے گا۔ اظہر چپ بیٹھا رہا۔ آج گاہک بھی کچھ زیادہ نہ تھے۔ جو کچھ بکری ہونا تھی وہ صبح ہی ہو گئی تھی۔ آج ہوا بھی تیز تھی۔ سڑک پر اتنی دھول اڑتی کہ چیزوں کو صاف رکھنا مشکل تھا۔ اظہر نے سب چیزوں کو جھاڑا پونچھا اور پھر آرام سے بیٹھ گیا۔

دوکان کے پچھواڑے سرس کے پیڑوں کی چھدری شاخوں میں ہوا ہو کے بھر رہی تھی۔ بادل کالے سیاہ تھے۔ لگتا تھا طوفان آئے گا۔ پرندوں کا ایک غول بادلوں کی آوارہ گردی میں شریک تھا لیکن اظہر کو اس کی کچھ فکر نہ تھی۔

جب کبھی وہ یوں ہی بیٹھتا تو سارے جہان کے خیال اندیشے اس کے ذہن میں امنڈ آتے اور اسے چین نہ ملتا۔

اچانک ہوا رک گئی۔ کہیں سے ایک کوئل کوک بھر کے سڑک پار بانسوں کے جھنڈ میں جا چھپی۔ کچھ دیر بعد کے سڑک پر سے کسی کے سیٹی بجانے کی آواز آئی۔ اس سے پہلے کہ

MashalBooks.org

وہ چندر کو سر سے پیر تک دیکھ سکتا، چندر سیٹی بجانا ختم کر کے ایک دم سے دوکان کے سامنے پڑی بانس کی بنچ پر ٹک گیا۔

''تم، چندر؟''

چندر کی آنکھیں ناچنے لگیں۔ وہ پھر سیٹی بجانے لگا۔

''اب پلٹے تم متھرا کو

بندرا بن بسرایا۔

شیام، تمہیں اب جانی میں

نین اجیارا، نہیں گنوایا

اظہر کا جی ڈھیروں باتیں پوچھنے کو بے چین تھا، مگر چندر کا گانا ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔

''چندر، اب تھوڑی دیر کو بند کرو یہ؟'' اظہر سختی سے بولا۔

''پہلے مجھے بیڑی دو'' چندر ٹانگیں ہلانے لگا۔

''میں تمہیں دوں گا سب کچھ بیڑی، پان، تمباکو، بچے کیسے ہیں گھر میں؟''

چندر نے اپنی مونچھیں سہلائیں، سر جھکائے وہ بلی کی طرح مسکرایا۔

اظہر سے صبر نہ ہو رہا تھا۔ ''سب خیریت سے ہیں؟''

عصر کی نماز کا وقت ہو چلا تھا۔ خلیل خاموشی سے آ کر دوکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اجنبی کو دیکھ کر اسے اچنبھا ہوا۔

چندر نے خلیل کو دیکھا۔

''کس کا بیٹا ہے، اظہر بھائی؟ سو تم یہاں واقعی رس بس گئے پھر؟ کیا کسی بچوں والی سے بیاہ کر لیا؟''

خلیل مارے شرم کے گڑا جا رہا تھا۔ پشیمان اظہر بولا ''بند کرو یہ بکواس، چندر، خلیل کبھی کبھار دوکان پر میرا ہاتھ بٹاتا ہے۔ میرے ایک ساتھی کا بھتیجا ہے یہ۔''

''اچھا۔ گھر پر سب خیریت سے ہیں۔ پہلے بیڑی پلاؤ مجھے۔ پھر ساری باتیں بتاتا ہوں میں۔''

MashalBooks.org

اظہر نے کہا ''چندر، تھوڑی مٹھائی لاؤں میں پہلے تمہارے لیے، پھر تم بیڑی پینا۔''

''نہیں، اس کی کیا ضرورت ہے۔''

اس پر اظہر نے اسے بیڑی اور ماچس دے دی۔

بیڑی پیتے ہوئے، چین سے بیٹھ کر چندر کہنے لگا ''گھر میں سب خیریت سے ہیں۔ وقت تو بھگوان کی مرضی سے چلتا ہے اور کسی کے لیے رکتا نہیں۔ ہاں کبھی دو پیروں پر چلتا ہے۔ کبھی ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل، اور کبھی کبھی اسے دھکا لگانا پڑتا ہے۔''

اوچھا پن اظہر کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن آج خیال کی ایک زقند نے اسے سب کچھ بڑی بے رحمی سے سمجھا دیا۔ بڑی عقلمندی سے اپنا دکھ چھپانے کو اس نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں۔ ''اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہو۔'' وہ بولا۔ ''ذرا پیٹھ ٹیک لو پھر کچھ میٹھا کھا لینا۔ یہاں کوئی اور کام بھی ہے۔ تمہیں؟''

''کام؟'' چندر نے تیوری چڑھا کر کہا ''ڈھیروں کام، دوکان سمیٹنا ہے تمہاری۔ اور پھر سیدھے موہیش ڈنگا کو چل کھڑے ہونا ہے۔''

اظہر نے شک بھرے لہجے میں کہا ''بہت بری چیز ہو تم، چندر''

''چلو یوں ہی سہی۔ لیکن جلدو کرو اب۔''

اظہر کو یہ سب کچھ بدحواس کیے دے رہا تھا۔

''اتنی جلدی کاہے کی ہے؟ میں دوکان چلانے کو کچھ اور آزمانا چاہتا ہوں۔'' چندر اب واقعی سنجیدہ ہو گیا۔

''بہت ہو چکا۔ وہ بہت غصہ سے بولا ''لکھ پتی بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلو اور خود چل کے دیکھو کیا گزری ہے تمہارے گھر بار پر ان مہینوں میں۔ رحیم بخش نے تمہاری زمین ہتھیالی۔ کب تک وہ کھیتی باڑی نہیں کرے گا اس پر۔ اگر تمہارے بال بچے محفوظ ہیں تو صرف دریا بی بی کے دم سے۔ کوئی اور ہوتا تو اب تک تھڑی تھڑی ہو چکی ہوتی۔''

اظہر نے شرم سے سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''ہم دوسروں کے سامنے بکھان نہیں کرنا چاہتے نا۔ چلو یہ چار چیزیں تمہاری چادر میں باندھیں اور نکلیں یہاں سے۔''

MashalBooks.org

خلیل اس عجیب اجنبی کی حرکتوں کو ایک معصوم گونگے بچے کی طرح دیکھ رہا تھا۔

''بہت پردیس دیکھ لیا تم نے۔ چلو بس اب موہیش ڈنگا چلیں۔ چاہے پتے کھانا پڑیں تم کو۔ بیوی بچے تو آنکھ کے سامنے ہوں گے۔''

جیسے پیڑ کی جڑیں سانپ کو موہ لیتی ہیں اظہر یوں سر جھکائے بیٹھا رہا۔

چندر اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اظہر نے ایک دو عذر بھی پیش کئے مگر اس کی کچھ نہ چلی۔ گھنٹہ بھر میں ساری چیزیں اظہر کی چادر میں بندھ چکی تھیں۔ چندر نے لکڑی کے تختے خود سڑک کے ایک پان والے کے ہاتھ نقصان کے بغیر بیچ دئے۔ وہ اظہر خان کی طرح نہ تھا۔

خلیل کو چندر بالکل ہی اجڈ معلوم ہو رہا تھا۔ جتنا لمبا اتنا ہی چوڑا، بڑی بڑی مونچھیں، جن کا جن۔ کہاں سے جہان پور میں آن ٹپکا۔ اور پل بھر میں ساری دنیا اجاڑ دی۔ اس کے آنسو پونچھنے کو اظہر نے اسے تھوڑا سا چیوڑا اور مٹھائیاں دیں۔

مستری ابھی کام سے نہ لوٹے تھے۔ یہ بات نہیں کہ اظہر کا جی ان سے ملنے کو چاہ رہا تھا۔ وہ اپنے اوزار لینے گیا تھا۔ خلیل کا اترا چہرہ دیکھ کر اسے دکھ ہوا۔

''ہمارے گاؤں آنا۔ جب بھی آسکو۔'' اس نے کہا۔ ''موہیش ڈنگا۔ جرنیلی سڑک پر۔''

''اچھا۔ چاچا''

خلیل دور تک انہیں چھوڑنے آیا۔ قصائیوں کے غول میں وہ ایک ہمدرد دل بھی گنوا رہا تھا۔ چندر سامان اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے تھا۔

فکر مت کرو خان، چلتے چلتے اس نے کہا ''یہ سب چیزیں اگلی چودھویں کو پیر کے میلے میں بک جائیں گی۔''

اظہر ایک چھوٹی پوٹلی اٹھائے ساتھ ساتھ آرہا تھا۔ کچھ نہ بولا۔

دن ڈھل رہا تھا۔ پیڑوں کے سائے لمبے ہو گئے تھے۔ سڑک پر روشنی ماند پڑ گئی تھی۔

گھروں کو پیچھے چھوڑتے ہی چندر نے گانا شروع کر دیا۔

متھرا چھوڑ کے.....

MashalBooks.org

چندریم راج کی نیا میں پار چلا
کھیتوں میں بھولی بالیاں
اپنے آنسوؤں میں ڈوب ڈوب جاتی ہیں۔

اظہر کو زور سے ہنسی آ گئی۔ اس نے کہا۔ ''چندر اپنی ناچ منڈلی پھر جوڑ لو۔ تم اب بھی گیت لکھ سکتے ہو۔''

چندر نے سر ہلایا۔ اور اس کے ساتھ سامان کی گٹھڑی بھی ہلی۔

''اگر لوگ سکھی ہوتے تو کیا چندر بوجھ ڈھوتا۔''

گٹھڑی اس کے دائیں کندے پر جھول رہی تھی۔ اس نے اسے سیدھے کندھے پر کھسکایا اور اسے ہلایا۔

''اویواویواویو
شام موہے کیسے دیکھ دینے
جیسے بھوسہ کی لو پر ہوا کی چال''

سانپ کی سی یہ لہراتی سڑک دور جا کر نیامت پور سے جا ملتی تھی۔ موہیش ڈنگا وہاں سے بھی دس میل آگے تھا۔ بارہویں کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ آس پاس کی جنگلوں میں اداسی گمک رہی تھی۔

چندر سیٹی بجانے لگا۔

''اویواویواویو۔''

MashalBooks.org

بارھواں باب

اگھن کے مہینہ کی ایک صبح کو تڑکے کا وقت تھا۔ دریا بی بی کبھی کی جاگ رہی تھی۔ دھان ابالنے کی خاطر اس نے نیند کو قربان کر دیا تھا۔

کچھ کچھ ٹھنڈ تھی۔ کہرے میں ڈوبے پیڑوں پر ستاروں کی مدھم چمک باقی تھی۔ سینے پر اپنی معمولی ساڑی کا پلو ڈالے، دریا بی بی ادھ پکے دھان آنگن میں ایک طرف رکھتی جارہی تھی۔ ناند میں سے پتیلے میں دھان ڈالتے وقت سردی سی لگتی تھی۔ مگر چولھے کے پاس ذرا دیر کو گرمی مل جاتی۔

دریا بی بی کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ وہ جمائیاں لے رہی تھی۔ اظہر اور نعیمہ ابھی تک سو رہے تھے۔ اور رعاشق جان کی کوٹھڑی میں امجد بھی۔ بانس کی ٹٹی کے پیچھے ایک پٹھا مرغ ذرا ذرا دیر بعد بانگ دیتا۔ اسکی آواز چیخ کی طرح تیز تھی۔

چولھا جلاتے جلاتے دریا بی بی تھک چکی تھی۔ اسے یہ سوچ کر دکھ ہوتا کہ چار مہینہ بعد اسے ایک اور بچے کی ماں ہونے کا اعزاز ملنے والا ہے۔ بڑھے ہوئے پیٹ کے باوجود اسے آرام کرنے کا وقت نہ ملتا۔ غریبوں کے گھروں میں کیوں چلے آتے ہیں یہ؟ نعیمہ کی آنکھیں ٹھیک ہونے میں نہیں آرہی تھیں۔ وہ اندھی ہوگئی تو کیا ہوگا؟ شاید بے چاری لڑکی سے کوئی بیاہ بھی نہ کرے۔ خیراتی ہسپتال پانچ میل دور تھا۔ ننھی سی جان اتنا پیدل کیسے چلے؟ امجد اس سال مکتب سے فارغ ہو جائے گا۔ آگے کیسے پڑھے گا وہ؟ چندر کوتل نے اظہر کی زمین اپنے نام منتقل کروالی تھی تاکہ کھیتی باڑی سے ان کی روزی کا سلسلہ کچھ نہ کچھ چلتا رہے ورنہ وہ بھی ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

ایکا ایکی دریا بی بی کے پیٹ میں درد اٹھا۔ چولھے کی لو میں، اس کا پتھر کی طرح ساکن پیلا چہرہ تکلیف سے سنولا گیا۔ کمر سے ساڑی ڈھیلی کر کے اس نے چولھے کی آنچ سے

پیٹ سینکا۔مگر درد بڑھ گیا۔ اسے دو پتیلے دھان اور ابالنا تھے۔ اس کے منہ سے سسکی تک نہ نکلی۔ آنگن میں ادھ پکے دھان کے ڈھیر سے گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ گرم دھان سے اپنا پیٹ چمٹا کر دریا بی بی اس پر الٹی جا لیٹی۔ اسے ڈر لگ رہا تھا کہ وہ کسی بھی پل بے ہوش ہو جائے گی۔ تھوڑی دیر پہلے وہ سردی سے کپکپا رہی تھی۔ اب اس کے روئیں روئیں سے پسینہ پھوٹ بہا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

دریا بی بی نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس سناٹے میں صحن سے آگے پیڑ روشنی کو اپنے اندر سموئے لے رہے تھے۔ کیلے کے نیلگوں پیڑوں پر صبح کا ستارہ روز سے زیادہ تیز روشن تھا۔ آسمان کا رنگ پھر بھی سرمئی تھا۔

دریا بی بی دھان کے ڈھیر سے لپٹی لیٹی تھی۔ درد کی شدت سے اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ نہتی حوا کی مورت اپنے دانت بھینچے دم سادھے لیٹی تھی۔

ادھ پکے گرم دھان کی سینکائی سے درد ذرا ہلکا ہوا تو دریا بی بی پھر چولھے کے پاس چلی گئی۔ اس نے دانہ انگلیوں میں دبا کر دیکھا۔ بس اب پتیلا اتار لینا چاہیے۔ وہ پھر سے جٹ گئی۔

آخر دریا بی بی کو کام کا ایسا کیا جنون تھا؟ کیا گھر بار کا بوجھ اٹھانے کو صرف وہی تھی۔ کیا میاں نہیں تھا اس کا؟ اظہر ابھی جیتا تھا۔

پتیلا اتار کر اس نے چولھا پھر دہکایا اور اپنی سوچوں میں گم ہو گئی۔

مارے نیند کے اس کی آنکھیں بند ہوئے جا رہی تھیں۔ خدمت کے اس اجگر کے شکنجے کو ڈھیلا کرنے کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ وہ چولھے میں لکڑیاں لگاتی رہی۔ اکڑوں بیٹھے بیٹھے اس کی کمر دکھ گئی تھی۔ وہ دالان سے ایک پیڑھی اٹھا لائی۔

افق سے روشنی کی لہر ابھی ابھی پھوٹی تھی۔ رات کے پکھیرو جنگل کے سناٹے میں بسرام کرنے چلے گئے۔ صبح کے من موہنے راگ نے چڑیوں، پیڑوں، بیلوں اور کھیتی باڑی کرنے والوں کو جگا دیا تھا۔ دور کے گاؤں سے موذن کی اللہ اکبر کی آواز موہیش ڈنگا کے پانی اور پیڑوں پر اپنا نقش چھوڑ گئی۔

سوائے ان جوان بیویوں کے جنہیں غسل کی حاجت تھی خانوں کے گھروں میں

MashalBooks.org

ابھی کوئی نہیں اٹھا تھا۔ دریا بی بی کام کی خاطر آرام قربان کر دیتی تھی اور اسے برا نہ لگتا تھا۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ اس کی آنکھوں کے کونوں میں آنسو ٹکے ہوئے تھے۔

ایک گرم آنسو گال سے پھسلا تو اسے ہوش آیا۔ آنکھیں پونچھتے ہوئے اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اچانک کسی آدمی کے سائے نے اسے چونکا دیا۔

چور تو صبح کو نہیں آتے۔ دریا بی بی آسانی سے ڈرنے والی نہ تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جیسے ہی وہ آگے بڑھی سایہ غائب ہو گیا۔ دریا بی بی نے دروازہ کھولا اور چاروں طرف دیکھا۔ کسی آدمی یا جانور کا نام نشان نہ تھا۔

کچھ چکرائی ہوئی وہ چولھے کے پاس چلی گئی۔

دوسری بار اپنی آنکھوں پر شبہ کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ وہ سایہ ایک بار پھر دروازے پر لہرایا۔ وہ جیسے ہی آگے بڑھی پھر غائب ہو گیا۔

الجھ کر دریا بی بی نے سوچا کہیں کوئی جن بھوت تو نہیں۔ وہ تھوڑی سہم سی گئی۔ تیسری دفعہ جب اس نے دروازہ کھولا تو دس بارہ برس کے ایک لڑکے کو کٹھل کے پیڑ کے نیچے کھڑے دیکھا۔ دھوپ کا رخ ابھی ادھر نہ ہوا تھا اس لڑکے کی شکل اندھیرے میں تھی۔

''اے لڑکے'' دریا بی بی نے آواز دی۔ لڑکا جھجکتے ہوئے ملگجی روشنی میں چند قدم آگے بڑھا۔

''ٹھہرو۔'' ایک مضبوط عورت کی آواز آئی۔

لڑکا وہیں ٹھہر گیا۔ ایک دم ہی اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور سسکیاں لینے لگا۔ اسے کھینچ کر گلے لگاتے ہوئے دریا بی بی نے پوچھا ''کس کے بچے ہو تم؟ باپ نے مارا ہے کیا؟ گھر سے بھاگ آئے ہو؟''

لڑکے نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سسکیاں لیتے لیتے ٹھہر گیا۔ ایک آدھ سسکی صبح کی ہوا میں ہلکی سی جنبش پیدا کر دیتی۔

''کس کے بچے ہو تم؟'' دریا بی بی نے ان جانی شفقت سے اسے اپنے گرم سینے سے لگا لیا۔

مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔

MashalBooks.org

''کیسے بچے ہو تم؟ بولو گے نہیں؟''

اندھیرا ابھی یہاں ٹہل رہا تھا۔ آرام طلب ہوا پتوں سے کھسر پھسر کرتی پھر رہی تھی۔

لڑکے نے پھر سسکیاں لینا شروع کر دیں۔

دریا بی بی بولی ''میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ چلو اندر چلیں۔''

دریا بی بی کے بازو کی لپیٹ میں لڑکا یوں چلا جیسے اس پر جادو کر دیا گیا ہو۔

''کیا نام ہے تمہارا؟ میرے بچے۔''

لڑکے نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں سے دریا بی بی کی طرف دیکھا۔ تو اس کی نظر لڑکے کی بھوں کے پیدائشی کالے داغ پر گئی۔ بھول کا اندھیرا ایک پل میں چھٹ گیا۔

''مناظر، میرا امنی؟''

آنسوؤں میں بھیگی آواز میں ادھوری بات کہہ کر دریا بی بی بچے کو گود میں بھینچ کر بیٹھ گئی۔ ماں کی گود میں سر رکھ کر مناظر زور زور سے رونے لگا۔

''ذرا ٹھہرو، بیٹے۔''

دھان زیادہ پک گئے تھے۔ لگنے کی بو آ رہی تھی۔ مناظر کو چھوڑ کر دریا بی بی نے جلدی سے پتیلا چولھے سے اتارا۔

ادھ پکے دھان فوراً الٹا دئے گئے۔ مناظر ٹھہر ٹھہر کے سسکیاں بھرتا رہا۔ اس انجانے ماحول کو جاننے کی خواہش اسے اپنی لپیٹ میں نہ لے سکی۔ وہ صرف اپنی ماں کو دیکھتا رہا۔

کام ختم کر کے دریا بی بی نے لڑکے کا معصوم چہرہ اوپر اٹھایا اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں دیکھا۔

''تمہیں اپنی ایک لونڈی جیسی ماں آخر کار یاد آ گئی؟''

رندھے ہوئے گلے سے یہ بات کہہ کر دریا بی بی نے کتنی بار لڑکے کے ہونٹوں، آنکھوں اور ماتھے پر پیار کیا۔

''ٹھیک رہے تم بیٹے؟''

MashalBooks.org

منی نے شرما کے کہا ''ہاں، ہاں''

دریا بی بی نے اسے گود میں بٹھا لیا اور اس سے ایک ایک بات پوچھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اظہر باہر کے مکان میں فجر کی نماز پڑھ کر آیا۔ وہ ایک انجان لڑکے کو دریا بی بی کی گود میں دیکھ کر ٹھٹکا۔

''کس کا بچہ ہے یہ؟''

ساڑی کا پلو جلدی سے سر پر ڈال کر دریا بی بی دھیرے سے بولی ''میرا بیٹا آ گیا۔''

''کیسا خوبصورت لڑکا ہے۔'' اظہر نے کہا۔ اتنی خوبصورت آنکھیں۔

دریا بی بی شرما گئی۔

''منی بیٹے، ابا کو سلام کرو۔''

چابی سے چلنے والی گڑیا کی طرح اظہر کے پاؤں چھو کر وہ ماں کی طرف مڑا۔

اظہر نے کہا ''میں نہیں جانے دوں گا تمہیں.....''

اس نے بچے کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''آج سے تم میرے باپ ہو اور میں تمہارا بیٹا۔''

اظہر اپنے مذاق پر خود ہنسا۔ اس کے مزاج سے ہٹ کر بالکل نرالی بات۔

''اپنا نام بتاؤ مجھے۔''

مناظر نے شرما کر سر جھکا لیا۔ دریا بی بی نے جواب دیا۔ ''مناظر حسین خان۔ میں منی کہتی تھی اسے۔''

''اچھا اچھا۔ میرے منی بابا جی۔''

اظہر زور زور سے آوازیں دینے لگا۔ امو، نعیمہ، امو.....

پلک جھپکتے میں بچے بستر چھوڑ کر بھاگے آئے۔

''امو، نعیمہ آؤ آن کر بڑے بھائی سے ملو۔''

وہ ایک دوسرے کو معصوم حیرت سے دیکھتے رہے۔

دریا بی بی اظہر کے جوش سے خوش تھی۔ مناظر تو اس کی گود میں بیٹھا تھا۔ امجد اور نعیمہ مودب کھڑے رہے۔

MashalBooks.org

''آؤ، آؤ پاس آؤ۔ یہ بڑا بھائی ہے تمہارا۔''

مناظر کچھ نہ بولا۔ اس نے امجد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس میں نعیمہ کو بھی محبت سے دیکھا۔ اس کی چپڑ بھری آنکھیں دیکھ کر وہ ذرا کھچا رہا۔

دریابی بی اپنی ساری تھکن اور کوفت بھول گئی۔

''بچوں کو ذرا ایک دوسرے سے مانوس کروا دوں۔ وہ بولی۔''کل میں نے کچھ کیلے پیلے ہوتے دیکھے تھے۔ آج شاید تیار ہوں۔ بچوں کو اچھا ناشتہ مل جائے گا۔''

دریابی بی تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔ مناظر اس راستے کو دیکھتا رہا جس پر وہ گئی تھی۔

اظہر نے کہا۔''تم لوگ کھیلو۔ میں ذرا حقہ بھر لاؤں۔ امجد، آج مکتب جانے کی ضرورت نہیں۔'' امجد مارے خوشی کے سارے آنگن میں ناچتا پھرا۔

MashalBooks.org

تیرھواں باب

دریا بی بی میں تو جیسے بجلی بھر گئی۔ اظہر کو تعجب تھا۔ گھر بار کو چلانے کے لیے میاں بیوی کے درمیان ایک معاہدہ تو تھا۔ مگر ابھی تک اس میں کوئی جان نہ تھی۔ اب دونوں میاں بیوی کے درمیان ایک اپنائیت آ رہی تھی۔ اظہر سے اتنی محبت برتی گئی تھی۔ ایسا پیار کا برتاؤ کیا گیا تھا جو اس کے خیال و خواب میں بھی نہ تھا۔

کچھ ہی دنوں میں مناظر نے غیریت کی سب دیواریں توڑ ڈالیں۔ اظہر، امجد سے زیادہ مناظر کا خیال کرتا۔ مناظر کو کام کاج کے لیے نہ دوڑایا جاتا۔ اظہر نے گاؤں سے میل بھر دور اس کا داخلہ ایک جونیئر اسکول میں کروا دیا۔ دو مہینہ میں جب امجد مکتب سے فارغ ہو جائے گا تو دونوں بھائی اکٹھے اسکول جایا کریں گے۔ پھر بھی دو مہینہ تو تھے۔ دریا بی بی کو مناظر کے اکیلے اسکول جانے کی فکر تھی۔ جس دن وہ شام پڑے تک گھر نہ پہنچا اور دریا کنارے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے میں دیر کر دی اس دن رات کا کھانا کھاتے کھاتے آدھی رات ہو گئی تھی۔

مناظر کو عاشق جان ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ عاشق جان کی بری عادتوں کی شکایت ماں سے بڑھا چڑھا کر لگاتا۔ گھر میں دو ہی تو کوٹھڑیاں تھیں۔ مناظر عاشق جان کی کوٹھڑی، میں سونے سے جھجکتا تھا۔ بڑھیا کے سر میں جوئیں بھری ہوئی تھیں۔ دریا بی بی کو مناظر کو اپنے کمرے میں سلانا پڑا۔ مگر وہاں لڑکے کو چین نہ تھا۔ دریا بی بی کو احساس تھا کہ وہ بے فکری سے سو نہیں پاتا تھا۔ دریا بی بی نے سوچا اس کے لیے ایک چھپر ڈال دیا جائے۔ گھر کی چھت ذرا آگے کو بڑھا کر اظہر نے ایک بانس کی چٹائی کی دیواریں لگا کر ایک کوٹھڑی اور بنا دی۔ چندر نے صرف ہاتھ پیر سے ہی مدد نہیں کی بلکہ دس گٹھے بھوسہ بھی دیا۔ مناظر اور امجد کی کتابیں وہاں رکھی رہتیں اور دونوں اپنا اپنا کام بھی وہیں کیا کرتے۔ اس چھپر کے ساتھ ایک ویرانہ تھا

جہاں گھنے پیڑ تھے۔ چاندنی راتوں میں امجد اور مناظر جی بھر کے باتیں کیا کرتے حتیٰ کہ انہیں نیند آ لیتی۔ عاشق جان کو اس بات کا گلہ تھا کہ امجد اس کے پاس سے چلا گیا تھا۔ کبھی کسی رات کو وہ ان کے کمرے میں چلی جاتی۔ اگر لڑکے باتیں کر رہے ہوتے تو ایک دم چپ ہو جاتے۔ بڑھیا کو مناظر ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ ''دریا بو، بوڑھے طوطے پڑھا لوگی؟'' اس نے کہا ''بٹھا کے کھلاتی ہی رہو گی اسے؟'' دریا بی بی نے اس کے ایسے لتے لیے کہ بڑھیا نے پھر کبھی اپنی بات تو نہ دہرائی۔ لیکن اپنے دل ہی دل میں کھولتی رہی۔ امجد سے جھوٹی سچی جڑ کے اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کرتی۔ امجد خود عاشق جان سے کتراتا۔ ''تمہارا بیٹا بڑا ہو گیا اب، دریا بو۔ اب کیوں سوئے گا میرے کوٹھڑی میں؟'' وہ غصے سے کہتی۔

مناظر ابھی تک اس گھرانے کی ایک خاص بات سے واقف نہ ہوا تھا۔ دریا بی بی نہیں چاہتی تھی کہ اسے ان کی غربت کا پتہ چلے۔ میاں بیوی روپیوں پیسوں کی بات کھسر پھسر کر کے کیا کرتے۔ گھر میں بھات نہ ہوتا۔ تو دریا بی بی پہلے کی طرح آواز نہ اٹھاتی۔ کہیں مناظر نہ سن لے۔ اور کہیں سن لے تو چھوڑ کر نہ چلا جائے۔ یتیم ہونے کے باوجود مناظر نے ایسی غربت میں زندگی نہ بتائی تھی۔ اظہر خان کی لنگی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ جانے اس کی نماز بھی قبول ہوتی تھی کہ نہیں۔ سجدے میں جھکتا تو گھٹنے کھل جاتے۔ اپنے لیے لنگی خریدنے کے بجائے اظہر نے مناظر کے لیے نیکر اور قمیض خرید لی۔

مناظر کی ہاشو سے بڑی دوستی تھی۔ ہاشو کو دریا بی بی کا یہ بیٹا دل سے پسند تھا۔ چھٹی کے دن مناظر سارا وقت شاکر کے گھر گزارتا۔ امجد اور مناظر اسے کہانیاں پڑھ پڑھ کر سناتے۔ ہاشو کو پھر سے زندگی مزہ دینے لگی۔ مناظر شاکر کے بھی قریب تھا۔ پہلے امجد شاکر سے کتراتا تھا۔ اب کچھ دنوں سے اس کا بھی مناظر کے ساتھ لگ کر، شاکر چاچا سے دوستانہ ہو گیا تھا۔ شاکر نے مناظر کو لاٹھی چلانا سکھا دی۔ یہ بات دریا بی بی کو ذرا نہ بھائی۔ اس کا خیال تھا اس کا خوش شکل بیٹا بھی کہیں بدمعاش نہ نکل جائے۔

موہیش ڈنگا جنگلوں اور کھیتوں نے امجد سے اب اور طرح باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ اسے گھر کے کاموں کے لیے دوڑانا اچھا نہ لگتا تھا۔ مناظر کے ساتھ سارا سارا دن گھومتے پھرنے میں اسے زیادہ مزہ آتا۔ گھر میں ایک جی کے بڑھ جانے سے اظہر اور بھی

MashalBooks.org

جان توڑ محنت کرتا۔ اسے امجد کی پہلے سے زیادہ ضرورت تھی لیکن امجد آس پاس بھی نظر نہ آتا کہ کہیں وہ آواز دے کر بلا ہی نہ لے۔

چندر کے ساتھ مل کر اظہر نے شکر قندیاں اگائی تھیں۔ دریا میں چھوٹے سے جزیرے کا کٹاؤ جوان پودوں سے لہلہا رہا تھا۔ امجد اور مناظر دونوں پودے اکھیڑ اکھیڑ کر میٹھی جڑوں کو چوسنے کا مزہ لیا کرتے۔

چندر کوتل نے ایک دن دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔

''تو سارے گنٹھے کھا گئے؟ ایں!''

چندر تاڑی کے نشے، میں دھت بیلے کی جھاڑیوں کے پیچھے لیٹا ہوا تھا۔ بچوں کی آوازوں سے وہ جاگا تو اس غارت گری پر اس کی نظر پڑی۔ آنکھیں پوری طرح کھول کر اور مونچھیں سکیڑ کر سخت لہجے میں بولا۔

''گنٹھے کھا رہے ہو ایں؟ چوکیدار! چوکیدار!''

وہ اتنی زور سے چلایا کہ کوئی سمجھے ڈاکوؤں نے گاؤں پر حملہ کر دیا۔

امجد ڈر گیا۔ مناظر نے اس آدمی کو پہلے دیکھا تو تھا مگر اس عالم میں نہیں ''نہیں، چندر کا کا، نہیں۔ ہم تو بس یہ دیکھ رہے تھے کہ شکر قندیاں اگ رہی ہیں کہ نہیں۔''

''شکر قندیاں اگ رہی ہیں؟ آہا؟ آنے دو چوکیدار کو۔ اور جو کہیں بھاگنے کی کوشش کی تو!''

امجد آگے بڑھ کر گڑگڑایا ''یہ میرا بڑا بھائی ہے۔''

''تم بھی چور ہو۔ ٹھہرو، چوکیدار دونوں کو پکڑے گا۔''

مناظر ڈر کے مارے دبک گیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

چندر نے ادھر ادھر دیکھا اور جماہی لی۔

''چوکیدار نہیں آ رہا۔ تو میں پکڑتا ہوں تم دونوں کو۔ دونوں کے دونوں چور۔ چلو میرے ساتھ۔'' امجد کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ اس کے پیر من من بھر کے ہو گئے۔

''چھوڑوں گا نہیں میں تم کو۔''

چندر نے اپنی مونچھیں تھپ تھپائیں۔

MashalBooks.org

''سمجھ گیا میں، چلو گے نہیں تم لوگ۔''

چندر اکڑوں بیٹھ گیا اور بولا ''چلو چورو، میرے کندھے پر چڑھ جاؤ۔''

مناظر کیا کرتا؟ اچھے بچوں کی طرح دونوں چندر کوتل کے کندھوں پر چڑھ گئے۔ گرنے کے ڈر سے دونوں کوتل کے لمبے بالوں سے لٹکے ہوئے تھے۔

''آہا، پٹھان کے پوت، گھڑسوار۔''

چندر نے چلنا شروع کیا تو سواروں کی تو جان نکل گئی۔ امجد کے آنسو بہہ رہے تھے اور مناظر خاموش تھا۔ سواروں کو اس سواری کا کوئی مزہ نہ آرہا تھا۔ اتنے تو دھکے لگ رہے تھے۔

یکا یک چندر کھل کھلا کر ہنس پڑا

''ابے چلو، تمہاری کا کی کے بندی خانے میں چلیں۔ جانے وہ گھر بھی ہے یا نہیں؟''

اس کے سر کے آر پار، دونوں لڑکوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ہنسی کی لکیریں ان کے چہرے پر کھنچ گئیں۔

جونہی چندر کوتل نے گانا شروع کیا دونوں کی آنکھیں کی پھٹی رہ گئیں۔

میری جان ہی لینا ہے تمہیں
ارے چور، اپنے ہی ہاتھوں سے
تو پھر کونپلیں کیوں چھوڑ گئے۔
اس بپتا بھرے بن میں.....

بھگتی کے سر سے دور تک پھیلے کھیتوں کا دل گونج اٹھا۔

مناظر بولا ''چندر کا کا ہمیں نیچے اتار دو۔''

''نہیں اس سے کام نہیں چلے گا۔ تمہیں اپنی کا کی کے تھانے چلنا پڑے گا۔ وہاں بہت شکر قندیاں ہیں۔ رات بھر کھانا پڑیں گی تمہیں۔''

سورج ڈھل رہا تھا۔ پمپاس کی گھاس میں ہوا سرسرا رہی تھی۔ چندر اپنے گیت میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیگانی کو بیلیا کے دکھ سے اس کا دل بھی تڑپ رہا تھا۔ اس کی یہ تڑپ اس کی آواز

میں گونج رہی تھی۔

ایلوکشی چندرامنی کے سر سے جوئیں بین رہی تھی۔

چندرامنی بولی ''دادا، نیچے اتارو انہیں۔ پرائے بچے ہیں کہیں گر پڑیں تو.....''

چندر بولا ''گریں گے تو سیانے ہو جائیں گے۔''

چندر کے کندھے پر ٹکا مناظر کھی کھی کرنے لگا۔

''دیکھو ان چوروں کو۔ تھانے پہنچے ہیں تو دانت نکال رہے ہیں۔ لو جی چلو اب کاکی کے تھانے میں۔ وہ کھلائے گی تمہیں شکر قندیاں۔''

اب امجد بھی ہنسنے لگا۔

چندر امنی بولی۔''ان دونوں کو اٹھائے چبوترے پر مت چلے آؤ۔ گردن ٹوٹ جائے گی۔''

''ایسے ہی۔''

متذبذب ہنسی ہنستے ہوئے چندر ایک جست میں چبوترے پر چڑھ گیا۔

چندر کے کندھے سے اترتے ہوئے مناظر بہت جھینپ رہا تھا۔ وہ پہلے یہاں کبھی نہیں آیا تھا۔

آنکھیں نیچی کیے چندر نے پھر گانا شروع کیا۔

بناوٹی غصے سے ایلوکشی بولی ''نندی، تمہارے سر میں تو ڈھیروں جوئیں ہیں۔ بھیا کے بھیجے میں اور بہنا کے سر پر۔''

چندر گاتے گاتے رک گیا۔

''میرے بھیجے میں ہیں، تو نکال کیوں نہیں دیتیں۔''

ایلوکشی ہنس دی۔''اتنے لمبے بالوں کے نیچے تمہارا بھیجہ کہاں ڈھونڈوں؟''

آنگن میں ایک موسل پڑا ہوا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کر کے جھوٹ موٹ کے غصہ سے چندر بولا ''سر پھوڑ دو اس سے بھیجہ نکال لو میرا۔''

چندرامنی سچ مچ خفا ہو گئی۔

''جو منہ میں آئے بک دیتے ہو۔ بدشگونی ہوتی ہے ایسی باتوں سے۔

MashalBooks.org

''پھر شروع ہو گئی۔'' چندر نے کہا۔ ''شکر قندیاں ہیں اگر تو ان بچوں کو کچھ دے دو۔''

وہ پاس کے قصبے سے شکر قندیاں خرید کر لایا تھا۔ ایلوکشی نے بانس کے پیالوں میں چیوڑا اور ابلی شکر قندیاں امجد اور مناظر کو دیں۔

چندر کی آنکھیں ناچنے لگیں۔

''پیٹ بھر کے کھا لو شکر قندیاں۔ خبردار جو ان پودوں کے آس پاس بھی گئے تم۔ اگر دوبارہ تم دونوں کو وہاں پکڑا تو کانجی ہاؤس میں بند کروا دوں گا۔''

گوپال نے شکایت کی۔ ''کانجی ہاؤس میں لوگوں کو تو بند نہیں کرتے۔ کرتے ہیں کیا؟''

''کرتے ہیں، کرتے کیوں نہیں'' امجد کی طرف مڑ کر بولا۔ ''میں تمہارے باپ کو بھی کانجی ہاؤس لے جاؤں گا۔ گھر سے بھاگ جو گیا تھا۔''

امجد نے چیوڑا چباتے چباتے منہ منایا۔ مناظر صرف مسکرایا۔

رنگ، آوازیں، چڑیوں کی بولیاں شام پڑنے کا اشارہ کر رہی تھیں۔ مناظر کو یہ احساس نہ تھا کہ ایک گھر کے آنگن سے دور پار کے گاؤں کا منظر کیسا لگتا ہے۔ کھجوروں کے خاموش درختوں کی تصویر پگڈنڈی کی سفید لکیر، اکا دکا مسافر، ایک تھکا ماندہ بچھڑا، بادل، پرنے ان سب نے مل کر مناظر کے معصوم ذہن کو عجب طرح سے متاثر کیا۔

چندر دوسروں کے ساتھ کھیل میں لگ گیا۔ صرف مناظر بے چین تھا۔ امجد نے اسے چونکا دیا۔ ''منی بھائی! اندھیرا ہو رہا ہے۔ چلو گھر چلیں۔''

''ٹھہر جاؤ، چاندنی رات ہے۔ شاید چندر کاکا ہی ہمیں گھر لے جائیں۔''

چندر دبدھے میں تھا۔ ''مجھے تو بہت کام کرنا ہے۔ ابھی تو مویشی بھی تھان پر لانا ہیں۔ دریا میں جال ڈالنا ہے۔ لہر کے اٹھنے سے پہلے زیادہ وقت نہیں ہے۔

امجد بولا۔ ''بوڑھے دریا میں مچھلی مل جاتی ہے؟''

''نہیں، بیٹے ایسی کوئی نہیں۔ بس ہنڈیا جوگی۔''

دونوں بچے خوش دلی سے گاؤں کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ مناظر تو گونگا ہی ہو

گیا تھا۔اس نے کھیتوں کے پھیلاؤ کو پہلے نہ جانا تھا۔

اچانک اس نے منہ کھولا۔''چندر کا کا کچھ پگلے ہیں۔ہے نا؟''

''ابا بھی یہی کہتے ہیں۔''

بچپن کے فیصلوں میں کچھ ایسا یقین ہوتا ہے جو بڑوں کو مات کر دیتا ہے۔اسی احساس کی سرخوشی میں دونوں بھائیوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔

امجد بولا۔''منی بھائی،تمہیں گانا نہیں آتا؟''

''آتا ہے۔مگر شرم آتی ہے۔''

''کچھ گاؤنا،منی بھائی۔''

جب چچا کے پاس رہتا تھا،مناظر کو تب بھی کسی سے ڈر نہ لگتا تھا۔جب سب سو جاتے تو وہ چپکے سے گاؤں کی کسی منڈلی میں جاملتا۔اور صبح کو خوب ڈانٹ کھاتا۔

مناظر رام پرشاد کی طرز میں بھگتی کا گیت گانے لگا۔گیت کے معنی تو اس کی سمجھ میں نہیں آتے تھے لیکن اس کی میٹھی آواز پیار کی ماری لڑکیوں کا دل چیر سکتی تھی۔امجد کو معلوم ہی نہ تھا کہ مناظر کی آواز ایسی سریلی اور میٹھی ہے۔

اس کے دل میں منی کی عزت اور بڑھ گئی۔

مناظر نے گانا ختم کیا تو امجد نے کہا''منی بھائی،تم چندر کا کا سے سیکھ کیوں نہیں لیتے؟''

''وہ گاتے ہیں کیا؟''

''گاتے ہیں۔گاؤں کی منڈلی کے سرپنچ تھے وہ۔تم نے انہیں گاتے نہیں سنا۔سنا نہیں؟''

''نہیں میں نے نہیں سنا''

''ابا کو گانا اچھا نہیں لگتا۔کہتے ہیں جو گانا سیکھتا ہے وہ بگڑ جاتا ہے۔''

''دفع کرو،میں تو گانا سیکھوں گا۔''

دوسرے دن دونوں ہاشو کے کمرے میں گپیں لگانے لگے۔

مناظر کے خیال میں گاؤں میں ایک باؤلا آدمی تھا جس کا نام تھا چندر کوتل۔اب

MashalBooks.org

وہ کہانی تفصیل سے بتا رہا تھا۔

جب شاکر کی ماں کمرے میں آئی تو وہ رک گئے۔ مناظر کو دیکھ کر وہ بولی۔ ''اچھا لڑکا ہے۔ اپنی ماں کے پاس ہی رہنا بیٹا۔ پرائے کبھی اپنے نہیں ہوتے۔''

مناظر اس کے لیے تیار نہ تھا۔ مگر شاکر کی ماں کہے گئی۔ ''جانتی ہو، ہاشو؟ اسے خون کا جوش کہتے ہیں۔ سونے کا چمچ منہ میں دے کر جس چچا نے پالا اس سے ایک سلیٹ کا ٹوٹنا برداشت نہ ہوا۔ کیا کرتا ہے تمہارا چچا، بیٹے؟''

مناظر چپ رہا۔

''رہو، ماں کے پاس ہی۔ اگر چھ سات برس ماں سے دور رہے تو وہ بیگانی تو نہیں ہو جاتی۔''

مناظر کو بہت کوفت ہو رہی تھی۔ دل ہی دل میں وہ اسے چڑیل کہہ رہا تھا۔ اس کے دل میں ٹھنڈک پڑ جاتی اگر وہ اسے ایندھن چننے والی بھتنی کہہ کر پکار سکتا۔

اپنی بات کا جواب نہ پا کر شاکر کی ماں بڑبڑاتی باہر چلی گئی۔

ان کی گپ بازی پھر شروع ہو گئی۔

شاکر کے کمرے میں زیادہ سامان نہ تھا۔ ایک کونے میں بڑا سا پلنگ تھا۔ دیوار کی طرف پیٹھ کئے ہاشو اس پر ایک طرف بیٹھی تھی۔ مناظر کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ امجد سر کے نیچے تکیہ رکھ کے آڑا ترچھا لیٹا سن رہا تھا۔

مناظر علی بابا چالیس چوروں کی کہانی پڑھ رہا تھا جب شاکر کمرے میں آیا۔

''کہانیاں پڑھ رہے ہو، بھئی؟''

''جی۔''

ہاشو نے ساری کا پلو سر پر کھینچ لیا۔ اس کی چوکنی آنکھیں اس آدمی پر لگی تھیں جو کمرے میں آیا تھا۔

مناظر نے پوچھا ''چاچا، کہاں جا رہے ہو؟''

''لڑائی کی خبر ہے۔ میں اپنی لاٹھی لینے آیا تھا۔''

سب کی آنکھیں کونے میں کھڑی تیل میں بھیگی لاٹھی کی طرف اٹھ گئیں۔

MashalBooks.org

ہاشو تن کر کھڑی ہو گئی اور بولی ''کہیں نہیں جاؤ گے تم؟''

''نہیں، میں پیشگی لے چکا ہوں۔'' شاکر کی آواز سنجیدہ تھی۔

مناظر نے ہاشو کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''چاچا نہیں، آج شام تو آپ ہمیں سکھلائیں گے۔ مت جاؤ''

لاٹھی ہاتھ میں لئے، شاکر ذرا دیر کھڑا رہا۔ اس نے ہاشو کا سنجیدہ اور خاموش چہرہ دیکھ لیا۔ شاید زندگی میں پہلی بار، اس لڑکے کی منت نے اسے باز رکھا۔

''اچھا، اچھا، تم پڑھو۔''

شاکر باہر چلا گیا۔

انہوں نے پھر کہانی نہیں پڑھی۔ ہاشو باتیں کرنے لگی۔ وہ مناظر کو کس طرح اپنے لاڈ میں ڈبو رہی تھی۔

''پیارا بچہ'' وہ بولی بستر پر لیٹے مناظر سے لپٹ گئی اور اسے بار بار پیار کرتی رہی۔ اس کی مامتا کو روپ مل گیا تھا۔

مناظر کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں پر اس کے لال نوجوان ہونٹوں پر ایک جوان عورت کے ہونٹ ایک عجیب بدمزہ ذائقہ چھوڑ گئے۔

گھر جاتے ہوئے اس نے امجد سے پوچھا۔ ''یہ ہاشو چاچی پیار کرتی ہے کہ کاٹتی ہے؟''

''کیوں؟'' امجد نے معصومیت سے پوچھا۔

''یہ میرے چہرے پر دانتوں کے نشان دیکھو۔''

MashalBooks.org

چودھواں باب

مناظر کو یہ گاؤں بہت بھایا تھا۔ اکا دکا بکھرے ہوئے گھر، چھوٹے چھوٹے جنگل،ان میں کہیں کہیں پگڈنڈیاں۔ یہ سب اس کا دل موہ لیتے تھے۔ اس کے اپنے گھر میں آنکھ مچولی کھیلنے کی جگہیں نہ تھیں۔ وہ اس فرق پر ریجھ گیا تھا۔

وہ دونوں گاؤں میں ادھر ادھر آوارہ گردی کیا کرتے۔ امجد جس کا ہیاؤ کھل گیا تھا، پہلے کی طرح اب گھر کے کام کاج نہ کرتا۔ کسی کسی وقت دریا بی بی اس سے بہت خفا ہوتی۔ مگر مناظر کے معاملے میں بہت محتاط رہتی۔ کہیں وہ اسے پھر نہ کھو بیٹھے۔ کہیں کوئی بے پراوہی نہ ہو جائے۔ مناظر فطرتاً بیباک اور نڈر تھا۔ اب کوئی روک ٹوک نہ تھی تو وہ اور بھی بے پرواہ ہو گیا تھا۔

قبرستان کے گھنے جنگل میں مغرب کی طرف کھجور کے پیڑوں کا جھنڈ تھا۔ ہری کھجوروں کے پکنے میں ابھی دو چار مہینے تھے۔ مگر لڑکوں کو اتنا صبر کہاں۔ امجد کے ساتھ مل کر مناظر کچی کھجوروں کا ایک پورا گچھا لے آیا۔ ایسا کرنے کو بہت جرات چاہئے تھی۔ سرکنڈوں کی جھاڑیوں میں زہریلے سانپوں کا ہونا عام بات تھی۔ اس سے ہٹ کر جنگلی پودوں کے چھونے سے ایسی جلن اور کھجلی مچتی تھی، کہ کھجوریں پک جانے پر بھی لوگ پاس پھٹکنے کی ہمت نہ کرتے۔

مناظر گائیڈ بنا۔ جنگلی بیلوں کو ایک طرف کھینچ کر راستہ بناتا رہا جنگلی پودوں کے چھونے سے جلن کی تکلیف بھی اسی نے اٹھائی۔ امجد کے بدن میں بڑی روز کی کھجلی مچی۔ جھاڑیوں سے نکلتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ بڑے بھائی کی طرح مناظر نے اسے تسلی دی۔ گھر پہنچنے پر دریا بی بی تو خوف اور غصہ کے مارے ہوش کھو بیٹھی۔ ''تم دونوں مجھے پاگل کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ ہزار بار بتا چکی ہوں کہ اس قبرستان کے پاس بھی نہ پھٹکنا۔ مگر

MashalBooks.org

میرے بیٹے سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔''

دونوں بھائیوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ دریا بی بی نے ایک بھیگے گچھے سے دونوں کے بدن پونچھے۔

''منی بھائی کہہ رہے تھے نہ کچی کھجوریں بہت مزے کی ہوتی ہیں.....''امجد نے ماں کو بتایا۔

مناظر نے فوراً ٹوکا۔''مزے کی کب کہا تھا میں نے؟ میں نے تو کڑوی کہا تھا۔''

دریا بی بی نے مناظر کو غصے سے دیکھا اور امجد کا بدن پونچھنے میں لگی رہی۔

مناظر چپ رہا۔ دریا بی بی نے اس کا خیال کر کے اس سے بولی۔''یہاں آؤ منی، آؤ اب تمہارا بدن پونچھ دوں۔''

مناظر کچھ خفا لگتا تھا۔''اس کی ضرورت نہیں۔ میرے بدن میں جلن نہیں ہو رہی۔''

دریا بی بی اس بات کو خاطر میں نہ لائی۔

''یہ دیکھو، یہ کالی بدھیاں پڑی ہیں تمہارے بدن پر۔ خبردار جو تم ان گھنی جھاڑیوں میں اب کبھی گئے۔ بڑے بڑے سانپ ہوتے ہیں وہاں۔''

''کس طرح کے سانپ، ماں؟ امجد نے پوچھا۔

''بہت زہریلے۔ ناگ۔''

مناظر ہنسا۔

''سانپ، دھت تیرے کی، ہمیں تو کسی کی دم بھی نظر نہ آئی۔''

امجد کی ہنسی اس کی ہنسی میں مل گئی۔

''ان کی دم جھڑ جاتی ہے جب وہ پھن مارتے ہیں۔ ہے نا ماں؟''

''ہاں''

مناظر کو اس کا یقین نہ آیا۔

''ہونہہ، دم جھڑ جاتی ہے اگر پھن مارتے ہیں؟ میرے چاچا کے پاس ایک چھوٹا کتا ہے۔ اتنے لوگوں کو اس نے کاٹا ہے۔ اب تک تو اس کی دم ہونا ہی نہیں چاہئے تھی۔''

MashalBooks.org

ابھی تک دریابی بی بہت سنجیدہ رہی تھی۔ اب اس سے نہ رہا گیا اور کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

''ارے میری بھولی مینا، کتوں کی دم کا جھڑنا کون کہتا ہے؟''

اپنے کو کھجاتے ہوئے مناظر نے کہا''وہ امو کہہ رہا تھا.....''

''ابھی کھجلی ہو رہی ہے؟'' دریابی بی نے پوچھا۔

''نہیں، ماں''

''اب بھی مجھے کچھ نہ بتاؤ گے؟''

ماں کی کمر کے گرد بانہیں لپیٹ کر، مناظر نے امجد کی طرف اشارہ کیا۔''یہ لے گیا تھا مجھے۔'' دریابی بی نے اسے جھوٹ موٹ کے غصہ سے دیکھا۔

''میں قسم کھاتا ہوں اب تمہارے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گا۔منی بھائی'' امجد نے روٹھ کر کہا۔

اگلے دن امجد نے اپنی قسم توڑ دی۔ اسکول کے بعد دونوں گاؤں کی سڑکوں پر اہلے گہلے پھرتے رہے۔ دوسرے بچے اسکول فٹ بال کھیلتے، لیکن مناظر کو ان کا ساتھ اچھا نہ لگتا تھا۔ اپنے ساتھی بچوں کے سامنے اسے اپنا آپ چھوٹا لگتا۔ ان کا لباس اس سے مختلف ہوتا۔ ان پر ایک چمک دمک ہوتی۔ مناظر کو امجد کا ساتھ بھلا لگتا۔

اسکول کے بعد دونوں کھیتوں کی طرف سٹک گئے۔ چندر کوتل گھر نہ تھا۔ وہ فصل لے کر ہاٹ گیا تھا۔ سو وہاں ٹھہرنے میں کچھ مزہ کو دئے۔ ان سے قلم اچھا بن سکتا تھا۔

شام پڑنے سے پہلے ہی، آنکھ مچولی کھیلنے میں مناظر امجد کو کھو بیٹھا۔ کھیل کی دھن میں وہ راستہ بھول گئے۔

مناظر کو رستہ ڈھونڈھنے میں مشکل نہ ہوئی۔ ایک موڑ مڑتے ہی مانوس راستہ سامنے تھا۔ مناظر خوش ہو گیا۔ فیتے کی طرح پتلی پگڈنڈی، طرح طرح کے درختوں سے دونوں طرف سے لدی ہوئی، مڑتی، بل کھاتی، گاؤں کے دوسرے سرے تک چلی گئی تھی۔ بالکل سامنے، کائی سے اٹے تالاب کے ساتھ اسے ایک مضبوط جنگلا نظر آیا۔ اچانک ہی پانی میں ہلچل سی ہوئی۔ مناظر نے جھک کر تجسس سے شفق سے کاسنی ہوتے تالاب کو دیکھا۔ شفق

سے رنگین سیڑھیوں پر پیتل کا گھڑا رکھا تھا۔گاؤں کی ایک گھر والی نہا رہی تھی۔اس کا اجلا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ مناظر نے تیزی سے قدم بڑھائے۔ کائی سے اٹے ایک اور تالاب کے کنارے چھوٹے بگلے رات کا بسیرا ڈھونڈھنے کو بانسوں کے جھنڈ میں چیں چیں کر رہے تھے۔ مناظر ان کے چینگی پوٹوں کی تیں تیں سن کر خوش ہو گیا۔ تالاب کے ایک کنارے پر چھالیہ کے دو چار پرانے درخت تھے اس کے ساتھ گایوں کا باڑا تھا جہاں ایک گائے بیٹھی ہوئی تھی۔ کھجوروں کی ایک باڑ کے پرے گھر والے اپنے کام کاج میں لگے رہے تھے۔

درختوں میں سے گہرا دھواں اٹھ رہا تھا۔ جنگلے پر کیلے کا ایک سوکھا پتا ہوا سے ہل رہا تھا۔ مناظر اس کے سائے کے پاس سے گزر گیا۔ سڑک پر سے کہیں سے کھس کھس کی سی آواز آئی۔ وہ ڈر گیا او رحیرت کے مارے ٹھہر گیا۔ کوئی سانپ تھا؟ آواز پھر آئی۔ مناظر نے بھاگنے کو پیر اٹھایا ہی تھا کہ اس نے ایک لڑکی کی ڈانٹ کی آواز سنی۔

''اے، لڑکے''

مناظر نے سوچا کوئی بڑی بوڑھی اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ وہ رک گیا اور اس نے جنگلے کو غور سے دیکھا۔

''اے، لڑکے'' بڑی بوڑھی عورت نہیں، بچپن کی ایک شکل۔ کیلوں کے پتوں سا جھانکتی، اپنے ہونٹ ہلا رہی تھی۔ کٹھل کے پرانے پیڑ کی جڑ پر بیٹھ کر اس نے صرف منہ ہی باہر نکالا تھا۔ مناظر کے پاس کوئی فوری جواب نہ تھا۔ لڑکی نے ہی اس کی مدد کر دی۔

''گاؤں کے کس طرف رہتے ہو تم؟''

مناظر جھجکتے ہوئے بولا۔ ''ادھر'' وہ انگلی سے اشارہ کرنا نہ بھولا تھا۔

''ادھر'' لڑکی کھی کھی کر کے ہنسی۔ ''اس کا نام نہیں کوئی؟'' ''تمہارا کوئی نام ہے؟'' بدتمیز لڑکی۔ مناظر کو غصہ آ گیا۔

''میرا تو کوئی نام نہیں لیکن تیرا ہے کیا؟'' اس نے جان بوجھ کر تو تڑاق کا لہجہ اختیار کیا۔

''میرا بھی نام ہے اور تمہارا بھی۔''

''ہاں میرا تو ہے۔'' اس نے کہا۔ زبان باہر نکال کر اس نے چڑایا۔

MashalBooks.org

''کیسا ڈھیٹ لڑکا ہے۔کس کے بیٹے ہوتم؟''

وہ اس طرح اٹھ کر باہر آئی جیسے پیڑ کی جڑوں میں سے اگی ہو۔ مناظر نے دیکھا۔نو برس کی ایک گول مٹول بچی۔اس کے بال اس کی پیٹھ پر لہرا رہے تھے۔گول چہرہ۔ گورا اور شاداب۔گوریا کی سی بھنوؤں تلے بے چین بڑی بڑی آنکھیں۔

''کس کے بیٹے ہو؟ ہوں''اس نے منہ چڑایا۔

مناظر کو واقعی اب بے حد غصہ تھا۔اسے مارنے کو کچھ نہیں مل رہا تھا۔ ورنہ غصہ کے مارے اس کا جی چاہا کہ دھڑ سے کھینچ کر مارے۔

''ٹانگ پکڑ کر تمہاری، چت کر دوں گا تمہیں''

اپنی ٹانگیں سکیڑتے ہوئے، لڑکی نے منہ چڑایا''پیر چھو کر سلام کرنا چاہتے ہو مجھے؟''

مناظر نے ایک ہاتھ کی مٹھی دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر رگڑی۔

''گراتا ہوں میں تمہیں''

''ٹھہر تو جا، بدتمیز''

لڑکی جنگلے کے پیچھے غائب ہوگئی۔مناظر کو اس کے پیروں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ وہ خود بے حد ڈرا ہوا تھا۔ وہ سڑک پر بگٹٹ دوڑ پڑا۔

لڑکی کے چلانے کی آواز اس کے کانوں میں آتی رہی''اے لڑکے سنو تو، کچھ نہیں کہوں گی میں.....''

مناظر نے اس کی التجا کا جواب نہ دیا۔ وہ خوفزدہ تھا۔ ذرا دور نکل کر ایک پیڑ کے گھنے سائے تلے کھڑے ہو کر، اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ایک موہوم سا ہیولی بکھرے بال۔وہ چھوٹی بچی جس سے اتفاقاً ملاقات ہوگئی تھی۔ وہیں کھڑی تھی۔ وہی تھی اس میں کوئی مغالطہ نہ تھا۔

کچھ اداس سا مناظر گھر کو پلٹا۔

MashalBooks.org

پندرھواں باب

اگلے دن دوپہر کا کھانا کھا کر مناظر گاؤں کے اس راستے کو چلا جہاں پچھلی شام اس نے ایک نئی دنیا کی دھندلی سی جھلک دیکھی تھی۔ بے دھیانی میں اس نے بھری دوپہر کی دھوپ میں ادھر ادھر دیکھا تو اسے ہر چیز نئی لگی۔ وہ گم کردہ راستے کی کھوج میں نکل کھڑا ہوا۔

تاڑی کے پتوں کے جنگلے کے بیچ کٹھل کے پرانے پیڑ کے ٹھنٹھ کو پہچاننے میں دیر نہ لگی۔ اس نے ادھر ادھر حیران ہو کر دیکھا۔ یہ تو کیڑوں مکوڑوں کی اپنی چھوٹی سی دنیا تھی۔ چیونٹیوں کا ایک غول کھانا دانہ منہ میں پکڑے لکڑی کے ایک پل پر رینگ کر چڑھ رہا تھا۔ ننھی ننھی لال چیونٹیوں کی رینگتی قطار ایسے لگ رہی تھی جیسے کسی کٹی پتنگ کی ڈور کپکپا رہی ہو۔ ان کی آڑی ترچھی قطار تاڑی کے ایک پتے کے نیچے غائب ہو گئی۔

مناظر نے نظر گھما کر دیکھا۔ چھالیہ کے کچھ پیڑوں سے آگے ایک کسان کا آنگن تھا۔ چھوٹی سی ایک چڑیا املی کے پیڑ تلے چونچ کھٹ کھٹ مار کر کوئی کیڑا مکوڑا ڈھونڈھ رہی تھی۔

''ارے، یہ کس کا بے وقوف لڑکا ہے؟'' ایک لڑکی نے پکار کر کہا۔

گھبرا کے مناظر پلٹنے کو ہی تھا کہ ایک ملائم ہاتھ نے اسے روک لیا۔ یہ تو وہی لڑکی تھی جسے کل شام اس نے دیکھا تھا۔ مناظر اسکے لیے تیار نہ تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ گھر کی طرف ایسے کھینچے لیے گئی جیسے وہ ایک کیڑا ہو اور مکڑی کے جال میں پھنس گیا ہو۔

عذر اعتراض کا موقع ہی نہ تھا۔ جادو کی طرح سب کچھ آناً فاناً ہو گیا۔ پرائے آنگن میں وہ مجرموں کی طرح کھڑا تھا۔

''ماں، باہر نکل کے ایک بیگانے کو دیکھو۔''

لڑکی کھل کھل ہنسے جا رہی تھی۔

MashalBooks.org

''کیا ہوا امیا'' سامنے والی جھونپڑی کے برآمدے سے ایک عورت نے جواب دیا۔ وہ دیواروں کی لپائی کر رہی تھی۔

امیا جی کھول کر ہنسی۔ ''ماں آج چوری کرنے کو یہ جلدی چلا آیا۔''

عورت کام لگی تھی۔ اس کی طرف مڑ کر وہ کام کرتے کرتے رک گئی۔

''امیا، کس کا پیارا سا بچہ ہے یہ؟''

لڑکی کی ہنسی رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔

''یہ چھالیہ کے پیڑوں کے پاس کھڑا تھا۔ میں جا کے اسے یہاں لے آئی۔''

لال مٹی میں بھیگا ایک چیتھڑا پکڑے عورت برآمدے سے نیچے اتر آئی۔

''کہاں رہتے ہو بیٹا؟'' امنیا کی ماں امیرن نے پوچھا۔

مناظر جیسا ہوشیار بچہ بھی یوں گڑ بڑا سکتا ہے۔ ماننے کی بات نہ تھی۔ لفظ اس کے گلے میں پھنس کر رہ گئے۔

''میں، میں خانوں کے یہاں رہتا ہوں۔''

امیرن نے ایک برتن سے پانی لے کر ہاتھ دھوئے۔

''کس کے بیٹے ہو تم؟''

مناظر بہت ہی سٹپٹایا۔ وہ جو کچھ بھی تھا، اظہر اس کا باپ تو نہ تھا۔

''دریا بی بی میری ماں ہیں۔''

امیرن دریا بی بی سے عمر میں زیادہ تھی۔ بڑھتی عمر کے نشان چہرے سے ظاہر تھے۔ کچھ بیمار سی بھی تھی۔

''دریا کا بیٹا، دریا کا بیٹا'' یہ کہہ کر امیرن اس کی طرف بڑھی۔ امیا ابھی تک ہنسے چلی جا رہی تھی۔

امیرن، غصہ سے بن کر اس کی طرف مڑی۔ ''اری او کم بخت، جانتی ہے کسے کھینچ لائی تو؟ جا جا کے معافی مانگ۔''

امیا کو کیا خبر تھی کہ آپس میں رشتہ داری بھی ہے۔

''ہم نے تمہارے آنے کا سنا تھا بیٹا۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ دن کام کاج میں لگ

MashalBooks.org

جاتا ہے۔ ناکوں ناک کام ۔ بہت دنوں سے خانوں کے یہاں جانا نہیں ہوا۔''

امبیا بڑی دلچسپی سے ماں اور اجنبی کو دیکھ رہی تھی۔ اب اس نے پیر کے انگوٹھے سے زمین کریدنا شروع کر دی۔

امیرن نے آواز دے کر کہا ''جاؤ، بید کا اسٹول لے کر آؤ.....آؤ بیٹا آؤ''

امبیا نے چپکے سے ماں کا کہا مانا۔ مناظر بید کے اسٹول پر کٹھ پتلی کی طرح بیٹھ گیا۔ اس کے پاس بیٹھی امیرن خاندان کی باتوں کی کہانیاں بنتی رہی۔ مناظر کے تکلف کو برطرف کر کے بانس کے ایک پیالے میں چیوڑا دیا۔

''چاچی غریب ہے تمہاری۔ میرے پاس تمہارے دینے کو کیا ہے میاں؟ تمہارے چچا کو گزرے دو سال ہو گئے۔ میں اس کم بخت کے ساتھ بپتا اٹھا رہی ہوں ۔میرا کہا سنتی نہیں۔ سارا دن پیڑوں کے نیچے گھومتی رہتی ہے۔''

ماں بیٹی کی آنکھیں چار ہوئیں۔ امبیا سنجیدہ ہو گئی۔

''تم کب آئے؟''

''اب تو بہت دن ہو گئے۔'' مناظر نے چیوڑا چباتے ہوئے کہا۔

''مجھے چین نہیں۔ صبح سے شام تک اتنا کرنے کو ہوتا ہے۔ گائے ہے، مرغیاں، بکریاں اور ایک یہ پگلی۔ دم لینے کو وقت نہیں ملتا۔ خانوں کی شکل تو میں نے مہینوں سے نہیں دیکھی۔''

مناظر کو لگا اس کی نئی چچی باتیں بہت کرتی ہے مگر بے تکی نہیں کرتی۔ سر ہلا کر امیرن نے خود اپنی تائید کی۔ ''بہت خوش شکل بچہ ہے بہت سندر۔ اور خود دریا بو بو کیسی ہیں ایسے ہی تو بیٹا شہزادوں کا جیسا نہیں لگتا۔''

مناظر شرما گیا۔

''بیٹا۔ ہم تو بس یونہی جیتے ہیں۔ ہماری تقدیر میں کام کے سوا کچھ نہیں۔ تمہارے چچا اچھے آدمی تھے۔ تمہارے اب والے ابا کی طرح، کوئی دس تھپڑ بھی مار جائے تو ان کی زبان نہ کھلتی۔ انجام ہم بھگت رہے ہیں۔ ایک ایکڑ زمین تھی ہماری۔ دوسرے چٹ کر گئے ساری۔''

پھر کھسر پھسر کر کے آنگن کے پار کی جھونپڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔

MashalBooks.org

''امیا کا دوسرا چچا۔ صحیح معنوں میں شیطان۔ دو بیگھے زمین ہتھیالی ہماری۔ فصل میں سے بھی کچھ نہیں دیتا۔ اب جا کے اپنے نام لگوالی۔ اچھا رکھ لے وہ اسے۔ اللہ تعالیٰ تو انصاف کرے گا۔ سو طرح کی چیزیں خرید کر لاتا ہے۔ مگر اس یتیم بچی کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتا۔''

مناظر مودب ہو کر سنتا رہا۔ امیا بھی اسی کی طرح یتیم تھی۔ وہ پھر بھی جانے کو بے چین تھا۔

''پچھلے سال برسات میں ایک مٹھی بھات گھر میں نہ تھا۔ میں اس سے ادھار مانگنے گئی تو منع کر دیا۔ ایک دانہ نہ دیا۔ ہم دونوں ماں بیٹیاں فاقوں سے مرتے مرتے بچیں۔ زمین ہماری اس نے لے لی۔ اور ہمارے پیٹ میں ایک دانہ تک نہ گیا۔''

امیرن کی آنکھوں کے کونے بھیگ گئے۔ اس نے ساڑی کے کنارے سے انہیں پونچھ لیا۔

مناظر نے کہا ''اچھا چاچی، خدا حافظ!'' اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی بپتا اب کوئی اور سنے۔ وہ بہت ہی رنجیدہ تھا۔

MashalBooks.org

سولھواں باب

ایک دن امجد یہ خبر لایا کہ شیرامی کا بیٹا مر گیا۔ اپاہج بیٹے کے بعد شاید اسے کچھ سکون مل جائے۔ دریا بی بی کو دونوں ماں بیٹوں کی بہت سی باتیں یاد آ گئیں۔ بدنصیب شیرامی۔ دریا بی بی نے کہا ''کیا تم اس کے گھر جا کے اس سے کہہ سکتے ہو کہ وہ آ کر مجھ سے ملے؟''

اگلے دن مناظر اور امجد اچھوتوں کی بستی میں گئے۔ شیرامی بیمار پڑی تھی۔ دور پار کی رشتہ دار ایک بیوہ اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔

امجد روز اس کی خبر لاتا۔ ایک سہ پہر کو بولا۔ ''ماں، شیرامی چچی زیادہ دن نہیں جیئے گی۔''

چہرے پر دکھ اور تکلیف لئے وہ بیٹے کو دیکھتی رہی۔

''ماں، اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ اسے پہچاننا مشکل ہے۔''

اس اچھوت عورت سے پرانی دوستی کی باتیں دریا بی بی کو یاد آ گئیں۔ گروی کیا ہوا برتن ابھی چھڑایا نہ جا سکا تھا۔ گھر کا خرچ ہر مہینے بڑھتا جاتا تھا۔ پیسہ آتا کہاں سے؟ چندر کوتل کو ایک نئے کاروبار کی سوجھ رہی تھی۔ جیسے سرمایہ بغیر کاروبار ہو ہی تو جاتا ہے۔ کچھ مہینوں سے وہ باتوں کے سوا اور کچھ نہ کر پائے۔ دریا بی بی کو برتن چھڑانے کے لیے نقد چاہئے تھا۔ ایک پرانی چیز یونہی تو نہیں دی جاتی۔ دریا بی بی نے کہا ''اچھی نہیں ہو گی اب وہ؟''

''نہیں ماں۔ امجد نے سر ہلا کر کہا۔ مناظر اس کے ساتھ گیا تھا۔ اس نے بھی تائید میں سر ہلایا۔

بھاڑ میں جائے برتن۔ کیا میں شیرامی کو دیکھ بھی نہیں سکتی؟ اس خیال نے دریا بی بی کو پریشان کیا۔ اچھوتوں کی بستی زیادہ دور نہ تھی۔ دو چار منٹ کا راستہ تھا۔ وہ اندھیرا پڑے

Mashalbooks.org

شیرامی کو دیکھنے جا سکتی تھی۔ اس طرح پردے پر بھی آنچ نہ آتی۔ مگر کیا اظہر مان جائے گا؟ ایسے معاملوں میں دریا بی بی کو اظہر سے ڈر لگتا تھا۔ کسانوں کے گھروں میں پردے کی کوئی ایسی سختی نہ تھی۔ دریا بی بی آسانی سے اپنے پڑوسیوں کے گھر آ جا سکتی تھی۔ لیکن اگر کسی دوسرے محلے او رخاص طور پر اچھوتوں کی بستی میں جانے کی بھنک مسلمان علاقے کو ہو گئی تو عزت خاک میں مل جائے گی۔ ان مٹ یادوں میں جیسے جیسے شیرامی کے سادے پن کا دھیان آتا گیا ایسے ایسے دریا بی بی کی بے چینی بڑھتی گئی۔ امجد کو ملیریا ہو گیا ایک دفعہ۔ کوئی امید نہ رہی اس کی۔ شیرامی اسے دیکھنے روز آتی۔ ایک دن اس نے کچھ مٹھائی دریا بی بی کی ہتھیلی پر رکھ دی۔

''کس لئے، شرمی دی''

''اس میں سے ایک لڑکے کو کھلا دینا۔''

''کس بات کی ہے یہ؟''

شیرامی نے جھوٹ نہ بولا۔ شیو کے مندر میں امجد کے لیے چڑھاوا چڑھا کر آئی تھی۔ مٹھائی اسی چڑھاوے کی تھی۔

ایک مسلمان کے لیے تو ناجائز بات تھی۔ دریا بی بی کی اپنی کمزوریاں تھیں۔ مگر گور کنارے لگے بیمار بچے کے سرہانے بیٹھ کر وہ کسی کا دل نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ کہیں آہ نہ لگ جائے۔ شیرامی کے سامنے ہی اس نے امجد کو مٹھائی کھلا دی۔ وہ اللہ تعالیٰ جو سب کچھ دیکھتا اور جانتا ہے کیا لوگوں کے دلوں کا حال نہیں جانتا؟

تنگی کے دنوں میں ذلت بے نام ونشان گزر جاتی ہے اگر شیرامی جیسا ساتھی ملے۔ شیرامی دریا بی بی کی زندگی میں اتفاقاً ہی آ گئی تھی۔

''امجد میں اسے دیکھنے جاؤں گی۔''

ایک بزرگ کی طرح امجد نے پوچھا ''تو کیا اچھوتوں کی بستی میں جاؤں گی تم!''

''کیا برائی ہے اس میں؟ وہ انسان نہیں ہیں کیا؟''

مناظر نے کہا ''اپنی اس حالت میں تم زیادہ دور تک نہیں چل سکتیں۔''

دریا بی بی نے اپنے سراپے پر نظر ڈالی اور لجا گئی۔ اس کا پھولا پیٹ اس کے بیٹے

MashalBooks.org

نے بھی دیکھ لیا تھا۔ یہ ایک اور مسئلہ تھا۔ کہیں اظہر کو پتہ چل گیا کہ وہ امید سے ہونے کے باوجود چوروں کی طرح رات کو اچھوتوں کی بستی میں گئی ہے تو وہ اسے مارڈالے گا۔ ایسے معاملوں میں اس کا میاں ناگ سے زیادہ خطرناک تھا۔ اور پھر بھی ایسا مسکین تھا وہ۔ دریا بی بی سوچتی رہی کہ اگر مذہبی رسموں کے معاملے میں اس سے کوئی چوک ہو جاتی ہے تو وہ غصہ سے دیوانہ کیوں ہو جاتا ہے۔''

سو طے یہ پایا کہ اظہر کے سونے کے بعد امجد، مناظر اور دریا بی بی شیرامی کو دیکھنے جائیں گے۔ بیمار دوست کو خالی ہاتھ دیکھنے جانا تو بڑی ہیٹی کی بات تھی۔ کم از کم دو آنے تو ہوں۔ عاشق جان سے پیسے ٹھگنے کی ذمہ داری امجد نے لے لی۔

بات اپنے آپ ہی بن گئی۔ اظہر سارا دن کی محنت سے تھک کر سو گیا تو تینوں گاؤں کے رستے پر ہو لئے۔ دریا بی بی نے سرگوشی میں پوچھا ''امجد، تمہیں راستہ آتا ہے؟'' پکا روز آتا جاتا نہیں رہا میں۔''

پتلی پگڈنڈی کے دونوں طرف گھنے پیڑ پودے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ دریا بی بی کو سرور آنے لگا۔ جیسے کوئی چڑیا پنجرے سے نکل کر آسمان کی اڑان بھرے۔ اسے سوائے اپنے گھر یا آس پاس کے پڑوس کے گھروں کے باہر کی دنیا دیکھنے کا موقع ہی نہ ملتا۔

آدھی رات ہو گئی تھی۔ ایک کسان کے گھر میں چراغ جل رہا تھا۔ شاید گھر والے تاش کھیل رہے ہوں۔ دریا بی بی اعتماد سے آگے بڑھے گئی۔ پتلی پگڈنڈی کی سفیدی رات کے اندھیرے میں بھی چمک رہی تھی۔

شیرامی کے چھپر میں گھستے ہی اسے جھرجھری سی آ گئی۔ وہ برتنوں دیگچوں سے بھرا ہوا تھا۔ شیرامی ایک گندی چٹائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس سے بھی گندے تکئے پر اس کا سر رکھا ہوا تھا۔ گھاس پھوس کی ان جھونپڑیوں کو طوفان کی آفت سے بچانے کی خاطر غریب کسان ان میں کھڑکیاں نہیں رکھتے۔ اندر کی بد بو سے دریا بی بی کا دم گھٹ گیا۔ لیکن محبت کے احساس نے ناگواری کو مٹا دیا۔ شیرامی نے آنکھیں کھولیں۔ اور گھور کر دیکھا۔

دریا بی بی نے پکارا ''سکھی''

شیرامی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے بیٹھنے کو اشارہ کیا۔ شیرامی کی کوئی رشتہ دار

عورت سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔

''اب کیسی ہو؟'' دریابی بی نے پوچھا۔

''اچھی نہیں'' رشتہ دار نے دکھ سے جواب دیا۔

شیرامی کے گلے میں بلغم اٹکا ہوا تھا او رخرخر کی آواز آرہی تھی۔ اس نے جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک کمزور نسوانی آواز آئی۔ ''ٹھیک ہوں۔ شکریہ''

شیرامی کا دم پھولنے لگا۔ رشتہ دار نے شکایتاً کہا ''ہم غریب ہیں کاش صحت ہی ٹھیک ہو آدمی کی۔ دکھیا پہلے ہی ہے اب بیماری کی بھی بپتا آن پڑی۔ کیا بھگوان کی چھوٹی آنکھ بھی نہیں؟''

شیرامی اپنی تھکی کمزور آنکھوں سے دریابی بی کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے گلا صاف کرنے کے لیے کئی مرتبہ کھنکھارا۔

''میں اچھی ہو جاؤں، تو تم سے ملنے آؤں گی۔'' وہ بولی۔

دریابی بی نے بیمار کا گندا جھریوں بھرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''تمہارا برتن'' شیرامی نے چپکے سے کہا ''جیا''

بولنا اس کے لیے مشکل تھا۔ اس نے دیگچوں برتنوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے ہونٹ ہلے۔ ''میں نے اسے چھڑا لیا تھا۔ تم مجھے رقم دے دینا۔

شیرامی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ جیا نے پیتل کا برتن دریابی بی کے سامنے لاکر رکھ دیا۔

اس کے چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن وہ چپ رہی۔ خرخر کی آواز بڑھ گئی۔ دریابی بی بت بنی بیٹھی رہی۔

چوکیدار نے رات کے پہر کی آواز لگائی۔ لڑکے ہونقوں کی طرح بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ دریابی بی نے زیادہ دیر نہ لگائی۔ جیا کی مٹھی میں دو آنے رکھتے ہوئے اس نے رخصت چاہی۔ عورت انہیں باہر تک بدا کرنے آئی۔

''قسمت کی بات ہے۔ گاؤں کے دوسرے حصے سے اسے کوئی دیکھنے تو آیا۔

یہاں تو کوئی خاطر میں نہیں لاتا۔ اس سے تو رات بھی نہ کٹے گی۔کتنی کھانسی ہے آپ نے دیکھا نا۔'' جیا تیزی سے واپس مڑ گئی۔

پیتل کی دیگچی مناظر کی بغل میں تھی۔ بادل چھا گئے تھے۔ ان کے اندھیرے میں چاندنی گم ہو گئی تھی۔ بانسوں کے گھنے جھنڈوں میں ہوا چیخ ہی تھی۔ ایک دم سے شیرامی کی جھونپڑی کی طرف سے ایک چیخ اٹھی۔

''امو،ٹھہرو۔''

دریابی بی نے کان کھڑے کئے۔تو جیا کی دل ہلا دینے والی چیخ کان پڑی۔

امجد بولا'' کہاں جارہی ہو،ماں؟ایک ہندو گھر ایک ہندو عورت مرگئی۔تم وہاں جا کر کیا کروگی؟''

اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ دریابی بی نے اپنے ہاتھوں سے سینے کو دبالیا اور بیٹھ گئی۔

صبح کو شیرامی کو موت کی خبر پھیل گئی۔ دریابی بی کو اس اچھوت باگڑی عورت سے ایک طرح کا انس ہو گیا تھا۔ دن بھر کام کی چکی میں پسنے کے باوجود اسے چین نہ پڑا۔ مناظر کی ضد پر اس شام وہ سب امیرن سے ملنے گئے۔

امیرن بطخوں مرغیوں کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اتنے دنوں بعد دریابی بی کا آنا اسے اچھا لگا۔ امیا مناظر کو دیکھ کر شرارت سے مسکرائی۔

دونوں دیہاتی عورتیں اپنے اپنے دکھڑے رونے لگیں، امجد اور مناظر امیا کو ساتھ لئے بڑی سڑک کی طرف چلے گئے۔

وہ دونوں بھائیوں کو کنچے کھیلتے دیکھنے لگی۔

کنچے سے سوراخ کا نشانہ لگا کر مناظر نے پوچھا'' مکتب جاتی ہو،امیا؟''

''ہاں، کیوں نہیں۔اتنی بڑی تو ہوں کیا نہیں ہوں؟ میں لکھنا پڑھنا نہ سیکھوں؟''

''اچھا میری دادی'' مناظر کہتے کہتے رک گیا۔''چلو چل کے دیکھیں تم کیا پڑھتی ہو؟''

امیا اسے ہاتھ پکڑ کر گھر تک کھینچتی چلی آئی۔ وہ مکتب کی کتاب کے بجائے نظموں کی ایک کتاب اٹھالائی۔ بچوں کی یہ کتاب رنگین تصویروں او رنظموں سے بھری ہوئی تھی۔

MashalBooks.org

مناظر نے اس جیسی کتاب پہلے نہ دیکھی تھی۔ اسے بہت مزہ آیا۔

''اسے پڑھ سکتی ہو؟''

''امیا نے اپنے ہونٹ سکیڑے۔ ''کیوں نہیں؟''

وہ اپنی باریک آواز میں ایک نظم پڑھنے لگی۔

''ٹھیک ہے'' مناظر بولا۔ ''یہ کتاب کہاں سے لی تم نے؟''

رحیم بخش کی بیٹی بھی امیا کے ساتھ مکتب میں پڑھتی تھی۔ اس کے کسی رشتہ دار نے اسے یہ کتاب تحفے میں بھیجی تھی۔

''بڑی ہوشیار بڑھیا ہو۔ عقل مند بڑھیا۔''

''کون ہوتے ہو تم مجھے بڑھیا کہنے والے'' امیا نے منہ بنایا۔ ''صرف سات برس کی ہوں۔''

امجد ہنسا۔ مناظر کے سامنے وہ بجھ سا گیا تھا۔ اس اجنبی سے کچھ حسد کی جلن بھی تھی۔ نظمیں پڑھنے کی اس مصروفیت میں وہ ایک اجنبی کی طرح شامل تھا۔

امیرن پکاری ''ایک کتاب کے لیے کیا لے دے مچا رکھی ہے؟ کب تک مکتب بھیجوں گی میں تمہیں؟''

دریا بی بی نے شکایت کی۔ ''خواہ مخواہ بچی کو کیوں ڈانٹ رہی ہو۔ اچھی بچی ہے وہ'' ''ہوشیار ہے، پڑھنے میں تیز ہے۔''

''ہوشیار۔ کچھ برسوں میں یہ بی بی میرے کلیجے پر پتھر بن جائے گی۔''

اب مناظر ایک نظم پڑھ رہا تھا۔ جب وہ ختم کر چکا تو امیا بڑے اصرار سے بولی۔

''منی بھائی، ایک اور سناؤ۔ تم بہت اچھی طرح پڑھتے ہو۔''

مناظر نے ایک اور نظم پڑھی۔ مائیں اپنی اپنی بپتا کہتی رہیں۔ امیرن کے رشتہ دار اچھا سلوک نہیں کرتے تھے۔ وہ تو جی جان سے چاہتے تھے کہ وہ اس گھر سے نکلے تو ان چند پیڑوں اور تالاب پر بھی ان کا قبضہ ہو جائے۔

دریا بی بی نے اپنے رشتہ داروں کی کہانی سنائی۔

اس نے اب غور کیا۔ امیرن نے زمین کے ذرا سے ٹکڑے کو کس گھڑپن سے رکھا

تھا۔

آنگن، تالاب تک کا راستہ، دالان، سب نک سک سے درست صاف ستھرا۔ترکاری کی کیاری پر، پودوں پر، مچان پر، سب جگہ لکشمی براجتی تھی۔

دریا بی بی بھاری دل سے گھر کو پلٹی۔ ابھی تک وہ ٹھیک ٹھاک ہی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کے عین سامنے شیرامی ترکاریوں کا گٹھا سر پر اٹھائے،شام کی اداسی میں چلی جارہی ہو۔

MashalBooks.org

سترھواں باب

شکر قندیوں میں انہیں نقصان ہوا۔ پھر بھی چندر مسکرا کر بولا ''ہماری تقدیر پہ پتھر پڑے ہیں۔''

اظہر نے کچھ بھی نہ کہا۔ گھر میں کھانے والے بڑھ رہے تھے۔ مارے فکر کے اسے راتوں کو نیند نہ آتی۔ اس کی سمجھ کے کل پرزے ویسے بھی کچھ زیادہ چلتے نہ تھے۔

چندر کوتل ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا تھا۔ وہ آمدنی کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتا تھا۔ اظہر کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ چندر نے اپنی کوٹھڑی کے ساتھ ایک چھپرا اور ڈال لیا تھا۔ وہاں اس نے ایک پرانا دھرانا ہارمونیم، پرانا وائلن نقلی بال اور ناچنے والی عورتوں کے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ چندر ایک نوجوان سے باتیں کر رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہے چندر؟''

''پہلے یہاں آن کر چٹائی پر بیٹھو۔ بتاتا ہوں میں تمہیں۔ میں گاؤں کی ایک سوانگ منڈلی بنا رہا ہوں۔''

چٹائی پر بیٹھ کر اظہر حقہ پیتا رہا۔

''اب بڑھاپے میں یہ کیا کرو گے؟''

چندر پیٹ پر ہاتھ پھیر پھیر کے ہنستا رہا۔

''بڑھاپا؟ یہاں بڑھاپے کو کون جانتا ہے؟''

''ریہرسل کرتے رہتے ہو۔ ہے نا؟'' اظہر بولا۔

''پورے زوروں پر۔ ہم کرشن اور گوپیوں کے کپڑے چرانے والا سوانگ کر رہے ہیں۔''

''تم ہو سوانگ اچھا بھرا کرتے تھے۔ پیسہ کہاں سے ہاتھ لگا؟''

MashalBooks.org

چندر نے جوان آدمی کی پیٹھ پر دھپ ماری۔ اور بولا۔ ''یہ رہا ہمارا جندر بہت دنوں سے رہا ہے شہر میں۔ اس نے ہمیں شہر کے طور طریقے تو سکھا دیئے مگر وہاں کا مال نہیں دیا۔''

راجندر اسی گاؤں کے کسان کا بیٹا تھا۔ وہ آدھی آستین کی قمیض اور دھوتی پہنے تھا۔ اپنے بال بڑے فیشن سے اترا کر بنایا کرتا۔ راجندر نے کھسیا کر کہا ''چندرا، چھوڑو، میرے خیال میں اس سے ہمیں کوئی کمائی تو ہوگی نہیں۔ لیکن وقت اچھا گزر جائے گا۔''

''اب یہ راجندر مل گیا ہے ہمیں، اب دیکھنا ہمارے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ اس کی آواز بھی اچھی ہے اور ساز بھی خوب بجاتا ہے۔ اس جیسا وائلن تو کوئی بجاتا ہی نہیں۔ دوسری جاترا ٹولیاں سب اڑا اڑا دھم ہو جائیں گی۔''

اظہر خان کو اس ماحول میں پریشانی ہو رہی تھی۔ بانس کی کھونٹیوں پر کچھ ساڑیاں لٹک رہی تھیں۔ ''یہ کیا ناچنے والوں کے سوانگ کے لیے ہے؟''

''جی'' چندر نے کہا ''راجندر شہر سے لایا ہے انہیں۔''

راجندر اس علاقے میں خاصا بدنام تھا۔ سات برس پہلے ماہی گیروں کی بستی سے ایک عورت کو بھگا لے گیا تھا۔ گاؤں سے نکلنے کے بعد اس کے متعلق سینکڑوں کہانیاں گشت کرتی رہیں۔ کسی کا کہنا تھا کہ جس کو بھگا کے لے گیا تھا وہ عورت اب پیشہ کرتی ہے اور راجندر اس کی کمائی کھاتا ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ کوئی تھیٹر والی راجندر کے عشق میں گرفتار ہے اور اس کے پیچھے خود فقیر ہو گئی ہے۔ کوئی کہتا ہے ابھے داس کا بیٹا راجندر داس اب ایک ساکھ والا آدمی ہے۔ اس کے صدقے حاتم بخش کے بیٹے شہر میں مور نچاتے پھر رہے ہیں۔ افواہوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔

راجندر تو پہچانا نہ جاتا تھا۔ گورا تو وہ تھا ہی شہر کے رنگ نے اس کو اور چمکا دیا تھا۔ اس کے لب و لہجہ پر دیہاتی ہونے کا گمان نہ ہوتا تھا، اس کی بات چیت سے تو ایسا لگتا تھا جیسے ایک عمر اسکول میں پڑھ چکا ہو۔

چندر اس آدمی کے ساتھ کاروبار کرنا چاہتا ہے؟ چندر تو پیتا بھی خوب ہے، تو بس برباد ہونے میں کسر ہی کیا ہے۔ مگر اظہر کو اپنے اندیشے زبان سے نکالنے کی ہمت نہ تھی۔

چندر کے جوش و خروش کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ وہ اپنی مونچھیں بار بار مروڑتا رہا۔

MashalBooks.org

''تم دیکھوگے۔ اظہر بھائی۔ اگر فصل اچھی ہوگئی تو تم دیکھنا کتنا کام ملے گا ہمیں۔''

''فصلیں تو اللہ تعالیٰ کے فضل پر ہیں۔'' اظہر کمزور سی آواز میں بولا۔

راجندر نے ہارمونیم اپنی طرف گھسیٹا اور کچھ سر نکالے۔ چندر چٹائی پر تھاپ دیتا رہا۔ اظہر بغیر کچھ کہے چپ بیٹھا رہا۔

''اظہر بھائی'' چندر مسکراتا رہا۔

اظہر کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا۔ ایک نئی دنیا آباد ہونے کو تھی۔ اور چندر کا چہرہ ان سرابوں میں شرابور تھا۔ اس نے آلسی سے اظہر کو پکارا اس کی آواز میں طنز کی ہلکی سی کاٹ تھی۔ مگر اظہر کو اس کا احساس نہ ہوا۔

''تمہیں بتانے کو اور کچھ بھی ہے۔ اظہر بھائی'' چندر نے راجندر کی طرف دیکھا اور اس سے رکنے کو کہا۔

''خان صاحب، آؤ اور ہماری منڈلی میں مل جاؤ۔''

اظہر نے چندر کو بڑی اداسی سے دیکھا۔ چندر کے دالان میں بیٹھے ہوئے اسے بڑا اچنبھا ہوا تھا۔ جھونپڑی سے خوشحالی ٹپکتی تھی۔ چندر نے ایک ٹوٹے بانس کے اسارے کی جگہ چھپر میں لکڑی کا اسارا لگا لیا تھا۔ شاید شکر قندی کی فصل میں بھی چندر نے بھانجی ماردی ہو۔ صاف اجلی سفید ساڑی پہنے چندرامنی تندرست لگ رہی تھی۔ اس نے ضرور پان کھایا ہوگا۔ رچے ہوئے ہونٹ اس پر سجتے تھے۔ کوئی گمان نہیں کرسکتا تھا کہ وہ دو بچوں کی ماں ہے۔ اظہر کو اچھا نہ لگا کہ چندر کے متعلق بری باتیں سوچے۔ چندر بے ایمان نہ تھا۔ شاید راجندر ہی اس منڈلی میں پہئے لگا رہا ہو۔ اس کے متعلق یہ ساری کہانیاں شاید جھوٹی ہی ہوں۔

اظہر کے لیے چندر کے تپاک میں کوئی کمی نہ تھی۔

''سچ، اظہر بھائی، بڑھاپے میں کولھے مٹکانے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ یہ راجندر لونڈا میرے پیچھے پڑ گیا تو میں نے بھی سوچا چلو دیکھ لیتے ہیں۔ تقدیر میں ہمارے لیے کیا لکھا ہے۔''

MashalBooks.org

چندر اس سے پہلے ناچنے والوں کی منڈلی میں کام کرتا تھا۔ اور دس بیس میل تک دور کے بڑے قصبوں میں بلایا جاتا۔ اسی بنجارے پن میں اسے ایلوکشی کا ساتھ مل گیا۔ ایلوکشی اس کی بیاہتا بیوی نہ تھی۔ اظہر میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ وہ راجندر کی حرکتوں کی شکایت چندر سے کر سکے۔

اظہر بڑی بے جان آواز میں بولا۔ ''تم کر کے دیکھو یہ بھی۔ میرے ساتھ کھیتی باڑی کا کام اور کر لو۔''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ میں اپنی ذات کا پیشہ تو کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ یہ تو بس ایک فالتو کام ہے۔ کون جانے ہمیں کوئی کام ملے گا بھی کہ نہیں۔''

''میں تو زندگی سے عاجز آ گیا۔'' اظہر نے دل شکستہ ہو کر کہا۔

''میرا بھی یہی حال ہے۔''

چندرامنی تو تتلی کی طرح پھدکتی پھر رہی تھی۔ صحت کی چمک سے اس کا روپ اور نکھر گیا تھا۔ دونوں بچے آنگن میں ناچتے کودتے پھر رہے تھے۔ بے فکری اور خوشحالی کی یہ ترنگ کیا کبھی اس کے گھر بار میں بھی آئے گی؟''

اظہر نے حقہ کے کش ختم کیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''میری بات سوچنا، چندر۔''

''ضرور، ضرور۔''

چندر کی آواز سے خوشی پھوٹی پڑتی تھی۔ اظہر ایک پل کے لیے جل سا گیا۔ کھیتوں کے ہرے بھرے رستے سے گزرتے ہوئے اس کا دل دکھ سے بوجھل تھا۔ ہارمونیم کی آواز ہوا کے ساتھ تیرتی ہوئی آئی۔ چندر اور راجندر دوگانا گا رہے تھے۔

MashalBooks.org

اٹھارواں باب

دریا بی بی کبھی اتنے دن نہ لیٹی تھی۔ وہ اچھے کس بل کی عورت تھی اور جاپے کے چھٹے دن گھر کے کام کاج سے لگ جاتی تھی۔ ان دنوں میں عاشق جان اس کا ہاتھ بٹایا کرتی۔ اب اسے ٹھیک سے دکھائی نہ دیتا تھا اس لئے بیچاری بڑھیا کچھ نہ کر پاتی تھی۔ اظہر نے امیرن سے مدد مانگی۔ وہ بیوہ خود بہت مصروف رہتی تھی۔ مگر اس نے فوراً ہامی بھر لی اور جلد ہی گھر کو نک سک سے درست کر دیا۔ دو چار دن گائیں نہیں کھولی گئیں۔ انہیں تھان پر ہی بھوسہ چارہ مل جاتا۔ ابیا مرغیوں اور بطخوں کی دیکھ بھال کرنے پر لگا دی گئی۔

دریا بی بی بے حد احسان مند تھی۔ عاشق جان کی کوٹھڑی اس کا زچہ خانہ تھی۔ دن کی روشنی یہاں آتی نہ تھی۔ کونوں میں لمبے لمبے جالے لٹک رہے تھے۔ اور ایک عجیب سی بدبو سے دم گھٹا جاتا تھا۔ دریا بی بی نوزائیدہ بچی کے ساتھ وہاں لیٹی رہتی۔ ذرا صاف ستھرے گدے پر بچی کنول سی لگتی۔ اس کے نین نقش ماں کے سے تھے۔

اسے تھوڑا بخار تھا۔ گاؤں کے وید جی کو بلایا گیا مگر اس کے کاڑھوں سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اب ڈسٹرکٹ بورڈ کی ڈسپنسری سے دوا آتی تھی۔ ڈسپنسری تین میل دور تھی۔ امجد اور مناظر کا مارے گرمی کے حلق سوکھ جاتا تھا۔ اظہر حاتم بخش کی زمینوں پر کام کر رہا تھا اور قرضہ لینے کی فکر میں تھا۔ گھر کا گھر وا ہو گیا تھا۔ بچوں کو وقت پر کھانا نہ ملتا۔ نعیمہ کی آنکھیں چپیڑ سے اتنی بھر جاتیں کہ وہ دوپہر تک انہیں نہ کھول پاتی۔ عاشق جان کے پاس بیٹھی وہ ریں ریں کئے جاتی۔ لیٹے لیٹے دریا بی بی اسکو ڈپٹتی تو ذرا دیر کو چپ ہوتی اور پھر شروع ہو جاتی۔

امیرن کو کوئی الزام کیسے دیتا۔ اس کے سگھڑ پن میں کوئی کمی نہ تھی۔ پرائے گھر کام کرنے میں دیر تو ہونا ہی تھی۔

مناظر کو چپ لگ گئی تھی۔ ماں کے پاس بیٹھنا اسے اچھا نہ لگتا تھا۔ اس کی کسی

بات کا بھی جواب دیتا تو اس کا لہجہ بے جان ہوتا، جیسے اس سے کچھ بھی نہ سہا جا رہا ہو۔ نئی بچی کو دیکھ کر اسے شرم آتی۔ اسے اس کا احساس نہ تھا کہ اس کو اس طرح شرم کیوں آتی ہے۔ اپنا زیادہ وقت امیا اور امجد کے ساتھ پیڑوں کے نیچے بیٹھ کر گنوا دیتا۔ جب کہ انہیں چاہیے تھا کہ وہ گھر میں ماں کے لیے کچھ کام کاج کرتے۔

باہر کی دنیا دریا بی بی صرف اتنی دیکھتی جتنی کھڑکی میں سے نظر آتی۔ اس کے بے چین اور پھر تیلے دماغ کو اس اندھیری کوٹھڑی میں کل نہ پڑتی۔ وہ لیٹے لیٹے نظر رکھتی۔ منی نے کھانا کھا لیا؟ امو کہاں تھا؟ نعیمہ کی آنکھوں کا کیا حال ہے؟ اور اس طرح کے سینکڑوں سوال اسے بے کل کیے رکھتے۔

ڈسٹرکٹ بورڈ کی ڈسپنسری کے ڈاکٹر نے مکمل آرام کی ہدایت کی تھی۔ کتنی ہدایتوں کو مانے وہ؟ وہ غسلخانے تک جاتی تو امیرن پانی پانی ہو جاتی۔ اس نے تو گوموت صاف کرنے سے عذر نہ کیا تھا۔

''ٹھیک ہو جاؤ پھر تم بدلہ چکا لینا۔''

''چکاؤنگی'' دریا بی بی نے منہ بنایا۔ ننھی بچی نے ہاتھ پیر چلا چلا کر رونا شروع کر دیا۔ اس نے بچی کو سمیٹ کر سینے سے لگا لیا۔ بات جاری رکھتے ہوئے بولی ''احسان چکا سکوں گی؟'' اس زندگی میں تو نہیں۔ مناظر کو بڑا ہو لینے دو۔''

دریا بی بی چپ ہو گئی۔ اس کا سر دکھ رہا تھا۔

''لاؤ، سر دبا دوں تمہارا'' امیرن بولی۔

''نہیں، تم کھانے دانے سے نبٹ لو۔''

''ہاں، یہ تو کروں گی۔ پھر ذرا دیر کو گھر جاؤں گی۔ امیا سے ناند بھرنے کا کہہ آئی تھی۔ جانے اس نے کنویں سے پانی کھینچا کہ نہیں۔ گائیں مارے پیاس کے نہ مر جائیں۔''

''تمہارا احسان کوئی نہیں چکا سکتا۔ اس جنم میں تو ہرگز نہیں۔ جو کچھ تم نے کیا ہے۔ بولو۔''

''فکر مت کرو، اللہ تعالیٰ مدد کرے گا تمہاری۔''

اللہ، اللہ، دریا بی بی نے جل کر کہا ''اگر اللہ تعالیٰ ہی سب کچھ کرتا ہے تو اسے ہماری

بدنصیبی سے کیا ملتا ہے۔ میرا تو ایمان ڈول گیا، بوبو۔''

''ایسی باتیں نہیں کرتے۔''

''اللہ تعالیٰ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر تم بیمار ہو تو ٹھیک ہونے کو دوا کھاؤ۔ لوگوں کو خود ہی علاج کے طریقے ڈھونڈنا پڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات ان کے دماغ میں نہیں ڈالی۔ پھر اللہ تعالیٰ کا ذکر کیوں کرو؟ ہمیں اپنے دکھ اپنی بیماری سے خود ہی لڑنا ہے۔ اگر کوئی اللہ تعالیٰ ہے تو ہونے دو۔ اور اگر نہیں ہے تو کس کو پرواہ ہے؟''

امیرن بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔

''کیا بک رہی ہو تم، بخار سر کو چڑھ گیا کیا؟ میری سمجھ میں تو تمہاری بات آتی نہیں۔''

دریابی بی نے تکلیف کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی دنیا پر تو کالا سایہ چھا گیا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر امیرن کو شکر گزری سے دیکھا۔

''خفا مت ہو، بوبو مجھے معلوم ہے تم نماز پڑھتی ہو، میں نے چھوڑ دی۔ میرا دل نہیں لگتا اب۔ اس چیز کو کرنے کا کیا فائدہ ہے جس میں دل نہ لگے۔''

دریابی بی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے امیرن بولی ''بس اب چپ ہو جاؤ۔ اس وقت تمہارا دماغ ٹھکانے نہیں۔''

''ہونہہ''

دریابی بی کی ٹانگوں میں جان لیوا ٹیس اٹھی۔ اس نے انہیں پھیلانے کی کوشش کی۔

''تم اب سو جاؤ۔ میں کام نمٹا کے آتی ہوں۔''

''لڑکوں کو بلاؤ گی۔ بوبو۔''

امیرن باورچی خانے کی طرف چلی۔

لڑکے کہیں دکھائی نہ پڑے۔ ہاشو کبھی کبھار اپنے فارغ وقت میں حال احوال پوچھنے اور بیمار کی خبر گیری کرنے آجاتی۔ اسے زیادہ دیر گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہ تھی۔ اس کی ساس اس بھولی بیمار سی لڑکی پر ہر وقت کڑی نظر رکھتی جن اور بھوت جس کا ستیاناس کئے دے رہے تھے۔ جب تک بچہ نہ ہو اس کا بیٹا گھر میں قدم رکھنے کو تیار نہ تھا۔ ہاشو کے

ساتھ وہ بدمزاجی تو کرتی تھی مگر شاکر کی ماں اس کے ساتھ نرمی بھی بہت برتتی تھی۔ ہاشو نے تو کہا تھا کہ وہ لڑکوں کو دو چار دن اپنے پاس رکھے گی دریا بی بی نہیں مانی۔ ان کے حالات بھی کچھ اچھے نہ تھے۔ وہ سوچتی تھی کہ کہیں رشتہ داری کا تکلف آپس کے تعلقات کو خراب نہ کردے۔ مناظر کو جب پیڑوں تلے بیٹھ کر بہت اکیلا پن لگا تو وہ ہاشو سے ملنے چلا گیا۔ اوراپنی ماں کے کہے پر سختی سے عمل کرتے ہوئے وہاں کھانے سے انکار کیا۔

اس دن شام کو بھی انکار کی وہی بات دہرائی جا رہی تھی۔ ہاشو کے ہاتھ میں کچھ سندیش تھے۔ بستر پر امجد ابیا اور مناظر بیٹھے تھے۔

ہاشو بولی ''لو کھا بھی لو۔ اچھے بچوں کی طرح۔ آہا کیسے مزے کے ہیں''

''نہیں ماں ڈانٹیں گی۔''

''وہ یہاں تو نہیں آ رہیں پکڑنے کو؟''

''یہ بتا دیں گے انہیں۔''

''یہ بھی کھائیں گے۔''

مناظر کے دل سے ڈر نکل گیا تو اس نے ایک سندیش لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ اس کے ساتھ ہی چٹخارے کی چٹ چٹ شروع ہوگئی۔ ہاشو ہنسی سولوٹ پوٹ ہوگئی۔

شاکر کی ماں کمرے میں آئی اور وہ بھی ہنس پڑی۔

''ہاشو بؤ' وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولی ''جاؤ باورچی خانے میں۔ بدنصیب کی جنی۔ تیرے کرم کہاں کہ تیرا گھر ہو۔ بچے ہوں۔''

ہاشو تو جیسے پتھرا گئی۔ امجد اور باقی دونوں نے سندیش توڑ کر منہ میں رکھا ہی تھا کہ منہ چلانا بھول گئے۔

بڑھیا بڑبڑاتی رہی۔ ''یہ قسمت کی ماریاں۔ یہ تو بچے کی خواہش بھی نہیں پوری کر سکتیں۔ کون جانے شاکر لاٹھی لے کر کہاں گیا۔ اللہ تعالیٰ جانے اس کے نصیب میں کیا لکھا ہے۔''

بڑھیا باہر چلی گئی۔ بڑھیا کیا تھی آفت تھی! ہنسی پھر کھلکھلانے لگی۔

مناظر نے کہانیوں کی ایک کتاب پڑھنا شروع کی اور سب ہنسنے لگے۔ ہاشو جسے

MashalBooks.org

مناظر کے پڑھنے کا انداز بہت اچھا لگتا تھا اس کے بالکل پاس بیٹھی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ مناظر نے کہانی ختم کر کے باہر نظر ڈالی۔ سورج پچھّم کی طرف سرک رہا تھا۔ اب چلنا چاہئے۔ اسے بھوک لگی تھی۔

اس نے امبیا سے کہا ''چلو چلیں۔ گھر نہیں جاؤ گی کیا؟''

''چلو منی بھائی۔'' امبیا بولی۔

ہاشو جھلا کر امبیا سے بولی ''امبیا تو جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ، مگر اسے کیوں کھینچ رہی ہو؟''

''میں ان کے ساتھ جاؤں گی۔'' امبیا کھسیانی ہو کر بولی۔

''ہاں، میں بھی چلوں گا۔'' مناظر اٹھ کھڑا ہوا۔

جب تنک مزاجی سے کام نہ چلا تو ہاشو بڑی التجا سے بولی ''مناظر میں دریا بی بی کو دیکھنے چلوں گی۔''

''چلو، پھر چلیں۔''

مناظر کو کوئی ایسی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس کے مزاج میں ایک سلیقہ قریبہ تھا۔

''میں تمہیں پیدل نہیں چلنے دوں گی'' ہاشو بولی۔ ''آؤ تمہیں گود میں اٹھالوں''

مناظر نے احتجاج کیا۔ ''کیوں کیا میں لنگڑا ہوں۔ یا میرے پیروں میں مہندی لگی ہے۔''

ہاشو نے ایک نہ سنی اور مناظر کو کولھے پر لا دلیا۔

''اتنا بڑا لڑکا اور گود میں۔'' امجد نے طعنہ دیا۔

''تم کیوں بگڑ رہے ہو؟ اگر دس یا گیارہ برس کا لڑکا بڑا ہے تو تم کون ہوتے ہو؟''

ہاشو کے کولھے پر ٹکے مناظر کا دل پریشان تھا۔ واقعی لوگ تو ہنسیں گے اس پر۔''

ہاشو نے چلنے کو جیسے ہی قدم بڑھایا تو بولی ''جان، اپنی بانہیں میری گردن کے گرد ڈال لو، ورنہ پھسل کر گر پڑو گے۔''

گھر میں مناظر کے لیے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہاشو دریا بی بی کا سر جھلس رہی تھی۔ مناظر نے ایک دو منٹ ماں سے بات چیت کی اور جانے کو اٹھ کھڑا ہوا۔ امیرن سب کو کھانا

MashalBooks.org

کھلا رہی تھی۔ اظہر کے حصہ کا باورچی خانہ میں ڈھکا رکھا تھا۔ کھیتی باڑی کے علاوہ، وہ چندر کوتل کے ساتھ مل کے کیا کر رہا تھا؟ کہاں کر رہا تھا؟ کسی کو خبر نہ تھی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد مناظر نے ماں کے کمرے میں جھانکا اور پھر گاؤں کی طرف غائب ہو گیا۔ امیا اپنے گھر چلی گئی تھی۔ وہاں کھیلنے کا زیادہ مزہ آئے گا۔ ہاشو نے اسے پکارا مگر اسے جواب نہ ملا۔

''جب سے میں پلنگ پر پڑی ہوں جانے اسے کیا ہو گیا ہے؟'' دریا بی بی نے بہت دکھی ہو کر کہا۔

''ان دنوں وہ میرے پاس رہ لیتا'' ہاشو بولی ''لیکن آپ نے میری بات نہ مانی۔''

''نہیں ہاشو ایسے کام نہیں چلے گا۔ بڑی آفت اٹھا کے تو وہ میرے پاس آیا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے وہ میری آنکھوں کے سامنے رہے۔''

''اتنا تو رہتا ہے وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے۔''

ذرا دیر بعد ہاشو چلی گئی۔

اس دن شام ڈھلے تک دونوں لڑکوں میں سے کوئی بھی گھر نہ پلٹا۔ ان دنوں اگر عاشق جان کو کوئی ٹھکانا مل جاتا تھا تو وہ یہاں نہیں سوتی تھی۔ ہاتھ وہ ویسے ہی کیا بٹا سکتی تھی۔ اور نعیمہ غریب دالان میں بیٹھی رہتی۔ شام پڑتے ہی اسے صاف دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہسپتال کے ڈاکٹر نے اس کی آنکھوں کا معائنہ کیا تھا۔ اور ایک لمبی فہرست ان چیزوں کی بنا کر دی تھی جو اسے کھانا چاہئیں۔ مگر گھر میں پرہیز کا کھانا خریدنے کو پیسہ کہاں تھا۔

امیرن ذرا دیر کو گھر گئی تھی کہ بطخوں اور مرغیوں کو ڈربے میں بند کر آئے۔ دریا بی بی نے نحیف آواز میں پکارا ''ایک گلاس پانی دے دو۔'' بڑی دیر تک جب کوئی جواب نہ ملا تو وہ سارا زور لگا کر چلائی ''کیا سب مر گئے؟''

نعیمہ نے جواب تو دیا وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اسی گھڑی اظہر گھر پہنچا۔ ہل ابھی تک اس کے کندھے پر تھا۔ دریا بی بی کا چلانا سن کر وہ ہل رکھنے باڑے میں نہیں گیا۔

''کیا ہوا، دریا بو''

''تھوڑا سا پانی۔''

MashalBooks.org

ہل زمین پر رکھ کر اظہر نے گھڑے سے پانی انڈیلا۔

پانی پی کر گلاس ابھی اس نے میاں کو پکڑایا ہی تھا کہ امجد ہاتھ میں بانس کی چھڑی لئے آنگن کے پار آتا دکھائی پڑا۔ مناظر پیچھے پیچھے تھا۔

گلاس زمین پر رکھ کر اظہر تیر کی طرح لپکا۔ ''کہاں تھے تم، حرامزادے؟'' اس نے کہا۔ امجد کا کان پکڑ کر ایک تھپڑ رسید کیا اور دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔ پھر یہ ہی سزا مناظر کو بھی ملی۔ اظہر نے دونوں لڑکوں کو بانس کی چھڑی سے مار مار کر ادھیڑ ڈالا۔

''بھک منگے حرامیوں کی اولاد، کھانے اور آوارہ گردی کے سوا کوئی کام نہیں۔ سور کے بچو، مرے نہیں تم ابھی تک۔''

نعیمہ زور زور سے رو رہی تھی۔ وہ دیکھ تو نہیں سکتی تھی کہ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ مگر اسے واقعہ کی نوعیت کا شدید احساس تھا اور اسی مارے وہ اور رو رہی تھی۔

اب اظہر خان اس کی طرف لپکا اور اسے بھی مارا۔

مسکین اظہر خان بھی ایسا حیوان ہو سکتا ہے؟ یہ بات ہر کسی کی سمجھ سے باہر تھی۔

دریا بی بی بستر سے اٹھ کر باہر نکل آئی۔ اور چلانا شروع کر دیا۔ ''ذرا ٹھہرو تو سہی، لعنت تمہاری مردانگی پر۔ تمہاری یہ مجال کہ میرے بچوں پر ہاتھ اٹھاؤ۔''

وہ آنگن کی طرف تیزی سے بڑھی۔ وہ دالان سے وہاں تک کیسے پہنچی۔ یہ بات تو صرف وہ پل ہی بر بتا سکتا تھا۔

اظہر خان نے مار کٹائی بند کی۔ اور ہل کندھے پر رکھ کر ڈیوڑھی کی طرف واپس ہو گیا۔

خاک چاٹتے، امجد اور مناظر زمین پر پڑے تھے۔ ان کے بدن کے زخموں سے خون رس رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ان تک پہنچ پاتی دریا بی بی بے ہوش ہو کر تڑ سے گر پڑی۔

ذرا دیر بعد گیس اٹھائے شاکر ہاشو اور اس کی ساس بھی آ پہنچے۔

MashalBooks.org

انیسواں باب

امیرن کی تیمار داری رنگ لائی اور دریا بی بی ٹھیک ہوگئی۔ پرہیز، علاج اور کھانے دانے کے بغیر ٹھیک ہو جانا صرف دریا بی بی کی قوت ارادی کا کارنامہ تھا۔ ان تین ہفتوں میں اسے نئے دوست اور ساتھی امیرن اور امبیا کی شکل میں مل گئے۔ بیماری میں بستر سے لگے لگے، شیرامی کی بے بسی کی موت کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا اور وہ اس بات سے ڈر جاتی کہ کہیں اس کا انجام بھی ایسا ہی نہ ہو۔ امیرن نے صرف تیمارداری ہی نہیں بلکہ دل جوئی سے اس کے دل و دماغ کی بہتری میں بھی بڑی مدد کی تھی۔ دریا بی بی اپنی شیر خوار بچی کو دیکھتی تو دل ہی دل میں بہت برہم ہوتی۔ اس کے روپ کا سونا اس گھر کی غریبی میں پیتل ہو جائے گا۔ امجد اور مناظر کو دیکھ کر اسے اس بات کا احساس ہوا تھا۔

دریا بی بی جلدی ٹھیک ہو جاتی اگر مناظر نے اسے اس طرح دکھ نہ پہنچایا ہوتا۔ اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس دن پٹ کٹ کے، بستر پر منہ اوندھائے لیٹا رہا۔ اور اگلی صبح اس کا نام و نشان نہ تھا۔ شاکر دریا بی بی کے پہلے شوہر کے گھر والوں سے پوچھ گچھ کر آیا، مگر مناظر وہاں بھی نہیں تھا۔

دریا بی بی بہت روئی اور اظہر سے بولنا بند کر دیا۔ وہ دن بھر کام کی چکی میں پستی رہتی۔ ایک گھر والی کا پورا فرض نباہتی، لیکن منہ سے ایک حرف نہ نکالتی۔ اس کا پتھر سا چہرہ دیکھ کر اظہر کو بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ ایک دوسرے کو وہ سمجھتے نہ تھے۔ بات چیت کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی وہ دونوں بے زبان جانوروں کی طرح ایک ساتھ رہ رہے تھے۔

چندر کوتل اپنی سوانگ منڈلی کے ساتھ بہت مصروف تھا۔ ایلوکشی اور چندرامنی دریا بی بی کو جاپے میں دیکھنے آئی تھیں۔ چندر کو یہ تو خبر تھی کہ اظہر کی مار کے بعد مناظر گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ خاموشی کی ایک چٹان، اسکے نتیجے میں، میاں

بیوی کے درمیان کھڑی ہوگئی ہے۔

ایک دن اظہر نے سارا ماجرا چندر کو کہہ سنایا او رشرم کے مارے سر جھکائے بیٹھا رہا۔

''اچھا، تمہارے اندر بھی غصہ بھرا ہے؟''

چندر ہنستا رہا۔ اگر مسکین بلیاں روہو جیسی بڑی مچھلی کا سر نگل سکتی ہیں تو پھر یہ اچنبھے کی بات کہاں تھی کہ اظہر کو بھی غصہ آ سکتا ہے۔

''مجھے اس طرح نہیں مارنا چاہئے تھا۔''

''دریابی بی کے پیر پڑے تم؟''

''نعوذ باللہ، تم جا کے اسے سمجھاؤ اس طرح نہیں چل سکتا زندگی کا کاروبار۔''

''کیا ہوا؟ دس برس تم بات چیت کرتے رہے اب کیا چپ رہے نہیں بنتی تم سے؟''

''باؤلے ہو بالکل۔''

اس سال فصل اچھی ہوئی تھی۔ اظہر کو اب گھر کے خرچ کی اتنی فکر نہ تھی۔ خواب دیکھنا اسے بھی اچھا لگتا تھا۔

اس دن کچھ دیر بعد چندر دریابی بی کو ہنسی ہنسی میں ستاتا رہا۔

''بھابی، میں تھیٹر میں تمہیں بلا نہیں سکتا۔ تم پر تو مذہب کی پابندیاں ہیں۔''

''میں تمہارے گھر آ کر ایک دن تمہارا تماشا دیکھوں گی۔'' دریابی بی کواڑ کی اوٹ سے بولی۔

''مجھ سے بول رہی ہو، اظہر خان سے بات کیوں نہیں کرتیں؟''

دریابی بی چپ ہوگئی۔ ذرا دیر بعد جواب دیا ''اگر کوئی میرے بیٹے کو گھر سے نکال دے تو''

''ہاں، یہ تو بری بات ہے۔ اور اگر میں لڑکے کو لے آؤں تو؟''

''پہلے، لے آؤ''

''ضرور، لاؤں گا میں''

MashalBooks.org

''امجد کو مارا میں نے برا نہیں مانا۔ ایک بدنصیب بچے نے یہاں آسرا ڈھونڈا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ اٹھایا انہوں نے۔ میرا کوئی خیال نہ کیا۔''

''یہ زیادتی کی ہے اس نے۔''

''میرا منی، ایسا بدنصیب بچہ۔ اور انہوں نے ہاتھ اٹھایا.....''

چندر کو احساس ہوا، وہ رو پڑی تھی۔

ڈیوڑھی میں پلٹا تو اظہر کو بہت برا بھلا کہا۔ ''سچ، خان بھائی، تمہاری سمجھ میں مامتا نہیں آتی؟''

اظہر خان حقہ پی رہا تھا۔ بیل کی سی بے جان آنکھیں بند کر کے اس نے جواب دیا۔ ''ہونہہ''

آج چندر ہار گیا تھا۔ وہ چپ رہا۔

''لڑکے کو ڈھونڈو۔ چندر''

''میں کسی کو لگاتا ہوں اس کام پر۔''

چندر چلنے کو اٹھا۔

اظہر حقہ پیتا رہا۔ اسے اب کسی بات سے دلچسپی نہ رہی تھی۔

دو چار بیگھے زمین پر اچھی خاصی فصل ہو گئی تھی۔ تین مہینے چین سے نکل جائیں گے۔ جیسے ہی کچھ پیسے ہاتھ لگے اظہر دریا بی بی کے لیے کھڈی کی ایک ساڑی خرید لایا۔ دونوں کے بیچ بول چال تو تھی ہی نہیں۔ اظہر نے ساڑی بستر پر رکھی، اور دریا بی بی سے براہ راست مخاطب ہوئے بغیر ایک آدھ بات کہی۔

کچھ دن ٹھہر کے، فصل لائی گئی۔ ایک دن اظہر نے دیکھا کہ جو ساڑی وہ دریا بی بی کے لیے لایا تھا وہ بوڑھی عاشق جان پہنے تھی۔ ایک ٹک وہ دیکھتا رہا سینکڑوں سوال اس مسکین آدمی کے دل میں بل کھاتے رہے۔

اس سہ پہر کو اظہر خان نے کنی بسولا اٹھایا اور ایک دوسرے گاؤں کی طرف چل کھڑا ہوا۔ دوسرے دن جب امجد نے باپ کے متعلق پوچھ گچھ کی تو دریا بی بی نے اسے ڈانٹ پلا دی۔

MashalBooks.org

بیسواں باب

یعقوب منڈی سے آلو پیاز خریدنے گیا تھا۔ اس دن زیادہ بیوپاری نہ آئے تو کچھ ڈھنگ کی خریداری نہ ہوسکی۔ پانچ میل چل کے گھر جانا اور پھر سویرے واپس آنا، کافی مشکل تھا۔ اظہر کا گھر پاس ہی تھا۔ پرانے رشتے کو استوار کرنے کا اچھا موقع تھا۔ اس نیت سے یعقوب نے اپنے نادار ماموں زاد کے گھر میں قدم رکھا۔

دریابی بی نے یعقوب کو فوراً ہی نہ پہچانا۔ اتنے برسوں میں وہ بہت بدل گیا تھا۔

''پہچانا نہیں مجھے۔ وہی دیور ہوں تمہارا، جو تمہیں بہت چھیڑا کرتا تھا۔''

''آؤ، آؤ، اندر آجاؤ۔''

''آج منڈی آنا بے کار گیا بھابی۔ کچھ زیادہ سودا نہیں لیا میں نے۔''

''اب پتہ چلا کہ غریب کی کٹیا تک ہاتھی.....''

یعقوب نے کہاوت بیچ سے ہی اچک لی ''ہاتھی نہیں، ایک چھوٹی سی چمگادڑ زیادہ مناسب رہے گا۔''

کئی سال پہلے یعقوب اس گھر میں آیا تھا۔ جب سے اب تک اس میں بہت تبدیلی آگئی تھی۔ لمبی دھوتی پہنے، اور گھنگریالے بالوں میں بیچ کی مانگ نکالے، چمڑے کے پمپ پہنے اور رڈھیلے ڈھالے کرتے میں وہ اترا رہا تھا۔ دانت پان کی عادت سے داغ دار تھے۔ اس کی مسکراہٹ سے خباثت ٹپکتی تھی۔ یعقوب کے پاس سو بیگھ زمین تھی۔ وہ دھان کی فصل کی ساتھ ساتھ، موسمی فصلوں جیسے آلو، ککڑی، پیاز اور پٹ سن کی بھی تجارت کرتا تھا۔ دریا بی بی جانتی تھی کہ پچھلے چند سال میں اس نے بہت پیسے کمائے تھے۔ اس کی خوشحالی کی ایک اور گواہی یہ تھی کہ اب اس کی دو بیویاں تھیں۔ حال ہی میں اس نے تیسرا رشتہ کرنے کا بھی سوچا تھا۔ لیکن اس کے پڑوسیوں اور دوسری بیوی کے میکے والوں نے اس کے ایسے لتے کئے کہ

اسے اپنے اس ارمان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

''اظہر بھائی کہاں ہیں؟'' چٹائی پر بیٹھے ہوئے یعقوب نے پوچھا۔

دریابی بی ایک گلاس سے اس کی تواضع کر چکی تھی اور اب اس کے لیے پان بنا رہی تھی۔ وہ پان بناتی رہی اور کچھ جواب نہ دیا۔

''کہاں ہے میرا بھائی؟''

''مجھے کیا خبر؟ پندرہ دن ہو گئے گئے ہوئے اور رسید تک نہ دی۔''

''عجیب آدمی ہے۔ کاروبار کی سوچتا رہتا ہے۔ کاروبار اس جیسے نیکوں کے بس کا روگ نہیں۔''

''یہ انہیں کون بتائے؟'' دریابی بی نے یعقوب کو پان تھماتے ہوئے کہا۔ ''انہیں آئے دن اس کی ہڑک اٹھتی ہے۔''

ہنسی کی ایک لہر کے ساتھ یعقوب نے دس روپیہ کا نوٹ جیب سے نکالا۔

''بھابی، میرے کہے کا برا مت ماننا۔ میں کھچڑی کھاؤں گا۔ کسی کو بھیج کے گھی اور بڑھیا چاول منگوا لو۔ گاؤں میں مرغی مل جائے گی کیا؟''

''یہیں مل جائے گی''

''بہت اچھے''

دریابی بی نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ ایسے مہمان تو کبھی نہ آیا کریں۔ یہ ہتک کا احساس اس کے دل کو چھید گیا۔ یعقوب نے بہت اصرار کیا۔ امجد اور نعیمہ اسکے پاس کھڑے اس کی حرکتیں دیکھ رہے تھے۔ یعقوب نے امجد اور نعیمہ کی ننھی ننھی مٹھیوں میں پانچ پانچ روپے کے نوٹ ٹھونس دیئے۔

''اپنے لیے مٹھائی لینا'' اس نے دونوں سے کہا۔

دریابی بی نے بہت احتجاج کیا مگر اس نے سنی ان سنی کر دی۔

''اگر یہ ہی کچھ کرنا ہے تو ہمارے گھر مت آنا۔ ہم تو غریب ہیں۔''

یعقوب نے برا مان کر کہا ''یہ میرے بھتیجا بھتیجی ہیں..... میرے نہیں ہیں کیا؟ تم جو چاہو کہتی رہو۔ اظہر بھائی کو آنے دو۔''

MashalBooks.org

وہ خوش دلی سے کھل کھلا کر ہنسا جیسے اس نے بڑی ہنسی کی بات کی ہو۔

دریابی بی اٹھ کھڑی ہوئی۔ مہمان داری کوئی معمولی بات نہ تھی۔

امجد نے احتیاط سے اپنا نوٹ تہہ کیا اور ماں کو دیا کہ وہ رکھ لے۔ اسے بہت سے کام کرنا تھے۔ گوالے کے یہاں سے گھی لانا تھا۔ اگر اس طرح اسے پیسے ملتے رہے تو وہ کام سے کس طرح جی چرا سکتا تھا۔ ایک بوتل لے کر وہ چلا۔

ایک مرغی فوراً ذبح کی گئی۔ ایک بڑا مرغا تھا ان کے پاس۔ پر وہ ابھی تک گھر نہ پلٹا تھا۔ اور اس کی کیا خبر کہ وہ کب آئے۔ مرغی ذبح کرنا روزی کے ایک وسیلہ کو ختم کرنے کے برابر تھا۔ لوگ بیماروں کے لیے انڈے اور چوزے خرید لیتے تھے۔

دریابی بی باورچی خانے میں تھی جب ننھی بچی نے چلانا شروع کیا۔ یعقوب نے اس کو اطمینان دلایا۔ ''تم پکانے میں لگی رہو، بھابی۔ میں بچی سنبھال لوں گا۔''

''ہاں، اچھی پیاری ہے۔''

بچی کو جھلاتے ہوئے یعقوب پھر باورچی خانے میں آن داخل ہوا۔

''اس میں کیا شک ہے۔'' اس نے مسکرا کر کہا ''اس کی ماں کو تو دیکھو۔''

دریابی بی شرم سے گلنار ہو گئی۔ وہ گوشت میں مصالحے ڈال رہی تھی۔ دھنیا بھوننا تھا اسے۔ اس نے چولھے پر توا چڑھایا۔ یعقوب کے وہاں ہونے سے اسے عجیب شرم سی آ رہی تھی۔

دریابی بی بولی ''یعقوب بھائی''

''جی''

''باہر کیوں نہیں بیٹھتے تم۔ پکانا ریندھنا سیکھنا ہے تمہیں؟''

''مجھے کون سکھائے گا بھابی۔''

''دو دو لونڈیوں کے ہوتے تمہیں سیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''پھر بھی، آدمی کو سیکھنا تو پڑتا ہے۔''

''بچی کو بھی باہر تازہ ہوا میں لے جاؤ۔ یہاں بہت گھٹن ہے۔''

دریابی بی پھر پکانے میں لگ گئی۔

MashalBooks.org

جیسے یعقوب کی بات ختم ہونے میں ہی نہ آ رہی ہو، وہ بچی کو لے کر پھر اندر چلا آیا۔

''بھابی، اظہر بھائی کو گئے پندرہ دن ہو گئے اور انہوں نے پیغام تک نہ بھیجا؟ تم ہی گزارہ کر سکتی ہو ان کے ساتھ۔''

''ان کے لئے ہماری کیا حیثیت ہے۔ ہے کوئی؟''

دریابی بی بانس کی پھنکنی سے چولھا پھونک رہی تھی۔ سارا باورچی خانہ دھوئیں سے بھر گیا۔

''ایسی پیاری بچی کی محبت بھی اسے باندھ کر نہ رکھ پائی۔'' یعقوب نے کہا۔

دریابی بی کو اب کچھ کچھ غصہ آ رہا تھا۔

''انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا۔''

''اتنی مہربانی کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر وہ نہیں آنا چاہتے تو یہاں کس کو پرواہ ہے۔'' یعقوب نے دریابی بی کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ آنسوؤں سے بھری ہوئی۔ دھویں کی وجہ سے یا زندگی نے ایسے کوڑے مارے تھے۔ یعقوب نے وجہ جاننے کی کوشش کی۔ دریابی بی کو ہمدردی نہیں چاہئے تھی۔ اگر اسے اکیلا چھوڑ دیا جاتا تو اس کے حق میں بہتر تھا۔ اس نے یعقوب کو کنکھیوں سے دیکھا اور چولھا پھونک پھونک باورچی خانے میں اور دھواں بھر دیا۔ بولی۔ ''بچی باہر لے جاؤ۔ مہربانی سے۔ دھوئیں سے اس کی آنکھیں خراب ہو جائیں گی۔''

بڑی بد دلی سے یعقوب وہاں سے ٹلا۔

گھر کے سینکڑوں کام، مہمان کے لئے خاصے کا کھانا پکانا۔ اس سب میں بہت دیر ہو گئی۔ دو ہی تو کوٹھڑیاں تھیں۔ یعقوب کے لئے بستر کا انتظام علیحدہ مسئلہ تھا۔ امجد غریب کو باہر دالان میں سونا پڑا۔

منڈی میں کام ختم کرنے کے بھی یعقوب تین دن اور ٹھہرا رہا۔ بظاہر وہ اظہر کی پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ احسان مندی میں ڈوبی ہوئی دریابی بی کو اس بات کا حد سے زیادہ خیال تھا کہ تواضع میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ یعقوب دونوں ہاتھوں سے خرچ کر رہا تھا۔ اس گھر کے بچے سندیش تو تیج ہار کو ہی چکھتے۔ یعقوب طرح طرح کی مٹھائیاں لے کر آتا۔ گھی، پراٹھے اور دوسری بڑھیا چیزوں کا بھی اہتمام کرتا۔

MashalBooks.org

گھر میں جشن کا سا سماں تھا۔ یعقوب عاشق جان کو بھی کہیں اور نہ کھانے دیتا۔ اب وہ بھی اس گھر کی مہمان تھی۔

جھجک کے مارے دریا بی بی احتجاج تو نہ کرتی لیکن اسے خیرات کا یہ ڈھونگ ذرا اچھا نہ لگتا۔

دو اور دن ٹھہر کے یعقوب چلا گیا۔ امجد دور تک اسے خدا حافظ کہنے گیا۔

MashalBooks.org

اکیسواں باب

دوپہر کو ہاشو امجد کو بلانے آئی۔ وہ اس کے گھر نہیں گئے لیکن گاؤں کی پرلی طرف ایک پیڑ کے نیچے جا بیٹھے۔

''کیا بات ہے؟'' امجد نے پوچھا۔

''تم بیٹھ کیوں نہیں جاتے اچھے بچوں کی طرح۔ سندیش لے کر دوں گی۔''

''نہیں، مجھے بات بتاؤ۔''

ہاشو ہچکچائی۔

''منی، واپس نہیں آئے گا؟''

''مجھے کیا پتہ؟ ماں اس کے لئے روتی ہے۔ ابا سے بولنا چالنا بند کر دیا۔''

ہاشو نے کہا ''اب تمہارے ابا بھی گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ منی نے اچھا نہیں کیا۔''

امجد نے یہ بات نہ مانی۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہو رہا تھا اس کی جھجک کم ہو رہی تھی۔

''تم بہت اچھے ہو'' ہاشو نے کہا۔

ذرا سا کھسک کر امجد نے طعنہ دیا۔ ''اب مجھ سے لاڈ کرنے کی ضرورت نہیں۔ منی بھائی یہاں نہیں ہیں اس لئے؟''

ہاشو کو اچنبھا ہوا۔ امجد ذرا سا لڑکا تھا مگر حسد کی رنجک اسے بھی چاٹ رہی تھی۔

وہ اس کے قریب ہو گئی۔ اس کے بالوں سے پیار سے کھیلتے ہوئے بولی۔ ''نہیں تم تو واقعی بہت اچھے ہو۔ میں تمہارا بھی خیال کروں گی اگر تم میرا ایک کام کر دو۔''

''کیا؟''

''منی کا پتہ لگاؤ۔''

''کیسے پتہ لگاؤں؟''

MashalBooks.org

''تم ان کے گاؤں کیوں نہیں چلے جاتے؟''

امجد نے کہا وہ نہیں جاسکتا۔

''بہت دور نہیں ہے وہ۔ بیل گاڑی کا کرایہ میں دے دوں گی۔''

''ماں مجھے ڈانٹیں گی۔''

''ان سے کہہ دینا اسکول جا رہے ہو۔''

ہاشو نے ساڑی کے کونے میں بندھی گرہ کھولی اور ایک اٹھنی نکالی۔

''لو یہ رکھ لو۔ بہت دیر نہیں لگے گی تمہیں؟''

''جو کہیں ماں کو پتہ چل گیا؟'' امجد کی آنکھوں میں خوف تھا۔

''انہیں کون بتائے گا!''

کہیں دور سے جنگلی پرندوں کی چہکار آئی۔

''جاؤ گے تم؟ ہیں نا!''

''ہاں'' امجد نے سر ہلا دیا۔

بھولے بھالے لڑکے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے، ہاشو نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ جنگل کا سناٹا کپکپا گیا۔

''تم بہت اچھے لڑکے ہو''

''چھوڑو مجھے۔''

''نہیں۔''

''میرے گال اس طرح مت کاٹنا جیسے منی بھائی کے کاٹا کرتی تھیں۔ ہاشو چاچی۔''

گھبرا کے ہاشو نے اپنی گرفت ڈھیلی کی اور دور کھسک گئی۔

امجد ہنسا ''ہاشو چاچی۔ منی بھائی سنکی ہیں کچھ۔ ایک دفعہ تتلی پکڑی تو بولے کہ اپنی قمیض اس کے رنگوں سے رنگ لیں گے۔''

ہاشو نے کوئی جواب نہ دیا۔

''تتلی کے رنگ سے کیا قمیضیں رنگی جاسکتی ہیں؟''

MashalBooks.org

''ہاں، رنگی جا سکتی ہیں۔ میں رنگ دوں گی تمہاری۔ پہلے منی کی خبر لے کر آؤ۔ تمہیں نظر نہیں آتا تمہاری ماں اس کے لئے کیسا بلکتی ہیں؟''

امجد اپنی ماں کے خیال سے دکھی ہوا۔ بڑے عزم سے بولا'' کیوں نہیں، میں جاؤں گا۔ چار آنے بیل گاڑی کا کرایہ۔ اور باقی کا چیوڑا لوں گا میں۔''

''شاباش۔''

ہاشو نے اپنا ہاتھ امجد کی طرف بڑھایا۔ جو اس وقت تک آنکھ سے اوجھل ہو چکا تھا۔

MashalBooks.org

بائیسواں باب

دریا بی بی نے بچی کا نام شریفن رکھا۔ اس کا عرف شری تھا۔ اس کے ذہن میں شیرامی تھی۔ خاص طور پر اس کی دکھی زندگی کا آخری وقت۔ وہ شیرامی کی یاد کو بچی کے عرف میں زندہ رکھنا چاہتی تھی۔ جس ملک میں ذات پات، مذہب دھرم کے ناگ پھن پھیلائے کھڑے تھے وہاں ایک دیہاتی عورت اس خفیف کوشش سے ان کا مقابلہ کرنا چاہتی تھی۔

اور گاؤں میں ہندو مسلم فساد بس ہونے کو ہی تھا۔

پچھلے کچھ برسوں سے دلدلی زمین کا پچاس بیگھے کا ایک ٹکڑا روہنی چودھری اور حاتم خان کے بیچ لڑائی کی جڑ بنا ہوا تھا۔ اب کچھ عرصے سے اس پر روہنی چودھری کا قبضہ تھا۔ حاتم خان کا اس زمین پر موروثی حق تھا، مگر اس حق کو جتانے کا دور دور تک امکان نہ تھا۔ کچھ مسلمان مچھیروں نے، جنہیں صاحب حیثیت مسلمان ''کم ذات'' کہتے تھے اس دلدلی زمین کو پٹہ پر لے لیا تھا۔ اس دلدل کی آمدنی نظر انداز کرنے کے لائق نہ تھی۔ حاتم خان نے کچھ کم ذات مسلمانوں پر کرایہ نہ دینے کا دباؤ ڈالا۔ روہنی چودھری کو اس سب کی خوب خبر تھی۔ اس نے نیچ ذات کے کچھ ہندوؤں کو گاؤں میں گروہی فساد کرانے کا بھرا دیا۔

اب کچھ دنوں سے حاتم بخش بڑا کٹر مسلمان ہو گیا تھا۔ پہلے اس کے بیٹے گھر میں بیٹھ کر پیتے تھے مگر اس نے کبھی ایک حرف نہ کہا تھا۔ اس نے خود کبھی نماز روزے کی پرواہ نہ کی تھی۔ مگر جمعہ کی نماز کے لئے مسجد میں جاتا۔ اس کی کھچڑی داڑھی اب اور سفید لگنے لگی تھی کیونکہ وہ اس پر سفیدہ لگاتا تھا۔ گھنٹوں تک لمبا جبہ پہنے، چھڑی تھامے ایک محافظ ساتھ لئے وہ گاؤں کے اندھیروں میں لوگوں کو جمع کرتا سازشیں جھگڑے کرواتا پھرتا۔ اس نے لوگوں کو وقت سے پہلے ہی نماز پڑھنے کی تاکید کی۔ کیونکہ نماز میں تاخیر کرنا بڑے گناہ کی بات تھی۔ گاؤں کا مکتب ڈھے رہا تھا اور پہلے اس نے مرمت پر کبھی ایک پیسہ خرچ نہیں کیا تھا اب اس

MashalBooks.org

نے مسلمانوں کو قورمہ پلاؤ کی دعوت پر بلایا اور بہانے بہانے یہ بات پھیلائی کہ ملحد ہندو زمیندار مسلمانوں کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔

موہیش ڈنگا بے کیف زندگی میں ایک لہر دوڑ گئی۔ گاؤں کے اس حصہ میں جہاں ہندو رہتے تھے رونی بھی کنجوسی سے کام نہ لے رہا تھا اور نہ ہی اس کے پروپیگنڈے میں کسی طرح کی کمی تھی۔

اس گھڑی تک حاتم بخش کو شاکر کی خاص پرواہ نہ تھی۔ گو کہ اس کی لٹھ بازی کا کافی شہرہ تھا۔ حاتم بخش نے روپے پیسے اور رخاطر مدارارت سے اس کو خرید لیا۔ شاکر تو ایک آتش مزاج مسلمان بن گیا۔ وہ جس نے زندگی بھر صرف عید بقرعید کی دو نمازیں اس طرح پڑھیں کہ جونیت امام کی سو میری۔ اب باقاعدہ نماز پڑھنا سیکھ رہا تھا۔ وہ قصبہ سے بنگالی میں نماز سیکھنے کی کتاب خرید لایا تھا۔ ہاشو جب اس کی غلط سلط عربی پر ہنستی تو بہت ڈانٹ کھاتی۔ ''سیانا کوا گوشت شوق سے کھاتا ہے۔'' دبی سہمی بیوی نے یہ فقرہ کسا تھا۔

چندر کوتل منڈلی کا راجہ تھا۔ پچھلے مہینہ وہ شیخ پاڑے کے ایک مسلمان سے زمین کی حد بندی پر الجھ پڑا تھا۔ رونی چودھری کے شہدوں نے موقع کا فائدہ اٹھایا۔ چندر اب یہ کہتا پھرتا تھا۔ مسلمان چوں بھی کریں تو ختم کر دو انہیں۔

ایک دن لگان پر کام کرنے والے کسانوں کے دو گروہ دلدل کے پاس لڑ پڑے۔ کچھ زخمی ہو گئے۔ اور ان پر فوجداری کا مقدمہ دائر ہوا۔ زخمی ہونے والوں کے پلے دھیلا نہ تھا لیکن جب تک حاتم بخش اور رونی چودھری کے پاس پیسہ تھا انہیں کس بات کی کمی تھی۔

گاؤں ڈر کے مارے سہما ہوا تھا۔

ایک دن دوپہر ڈھلے اظہر خان کندھے پر ایک تھیلا اٹھائے واپس ہوا۔ تھیلے میں طرح طرح کی چیزیں بھری تھیں۔ بندے، ایک بوتل آلتا اور لڑکیوں کے لئے کانچ کی چوڑیاں۔

نعیمہ اور امجد تو کھل اٹھے۔ سب کے لئے تحفے آئے تھے۔ امجد کو کاپی، پنسل اور ربر ملی۔ اسے لٹو اور ڈوری بھی ملی۔ نعیمہ کو بندے اور کانچ کی چوڑیاں۔

دریا بی بی کی چپ تو ٹوٹ گئی مگر میاں بیوی کے بیچ آئی خلیج ویسی ہی رہی۔ اظہر

خان تیس روپیہ لے کر گھر لوٹا۔ وہ پچھلے چار مہینوں میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا رہا۔ اک مہینہ دوکان بھی چلانے کی کوشش کی لیکن کچھ بنا نہیں۔

دریا بی بی کے پاس بھی پیسے تھے۔ یعقوب جب بھی آتا خوب لٹاتا۔ اکثر وہ منڈی ہاٹ کے دنوں میں آتا۔ اگر اظہر نہ بھی پلٹتا تو اسے محتاجی نہ ہوتی۔ یعقوب نے امجد کی فیس دینے کا وعدہ ہی نہیں کیا بلکہ تین مہینے کی پیشگی بھی دے گیا تھا۔

گاؤں کے جھگڑے سن کر اظہر کو حیرت ہوئی۔ امجد نے اسے مختصر حال سنایا۔ سنا جاتا تھا کہ شاکر کا کہنا ہے کہ پیسے بنانے کا وقت اور موقع آ گیا ہے۔ وہ دونوں زمینداروں سے گھسیٹ رہا تھا۔ اس نے روشنی چودھری کو یقین دلایا تھا کہ وہ لاٹھی کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ دیکھیں تو سہی حاتم بخش کتنے لٹھ باز لاتا ہے۔ اور حاتم بخش سے وعدہ کر لیا کہ ''پٹھان کی اولاد ہوں۔ اب آخری دفعہ ہی لاٹھی اٹھاؤں گا۔''

وقت ضائع کئے بغیر اظہر خان کھیتوں کو چلا گیا۔ زمین کی حالت دیکھنا سب سے زیادہ ضروری تھا۔ بال بچے ماشاء اللہ اچھی طرح تھے۔ اس سال اس کی فصل جو اچھی ہوئی تھی۔ کسان موسمی فصلیں لگا رہے تھے۔ کچھ جانوروں سے بچانے کے مارے، کھیتوں کے گرد باڑ لگا رہے تھے۔ اس سال وہ ککڑی بوئیں گے۔ پچھلے برس تربوز اچھے نہیں ہوئے۔ مگر دالان میں بیٹھے چندر نے اظہر کو نہ سلام کیا، نہ بیٹھنے کو کہا۔

''چندر''

چندر کچھ نہ بولا۔

ایلوکشی اظہر کے لئے ایک پیڑھی لے کر آئی اور چندر امنی اس کے پیچھے پیچھے آئی۔

''چندر'' اظہر نے پکارا۔

ایلوکشی نے اونچی آواز میں کہا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اجڈ بنے بیٹھے ہوئے ہو! بولتے کیوں نہیں تم؟ گاؤں میں ہندوؤں مسلمانوں کا جھگڑا ہے تو تمہیں، اپنے بھائی سے کیا شکایت ہے؟ لڑ تو رہے ہیں زمیندار۔ امیر امیر کے خلاف۔ تمہیں اس سے کیا غرض؟ وہ تمہیں دیں گے اپنی زمینداریاں؟ یہ بیٹھا ہے یہاں۔ روشنی چودھری اسے دے گا دلدلی زمین۔ اسی لئے یہ رات دن ہندو بستی کے چکر لگاتا رہتا ہے۔''

MashalBooks.org

طعنوں کے یہ تیر جس کے لئے تھے وہ بت بنا بیٹھا رہا۔ بیوقوفوں کی طرح پلکیں جھپکا کر اس نے اظہر کو دیکھا اور پھر نظر ہٹالی۔

چندرامنی اظہر کے لیے چلم بھر لائی۔ خاموشی سے حقہ پیتے پیتے، بیچ میں اظہر بولا۔

''چندر''

''چندر'' دل شکستہ اظہر کی آواز میں دکھ تھا۔''چندر، میں اتنے دن یہاں نہیں رہا اور میں سوچتا رہا کہ میں نہیں ہوں تو کیا ہوا چندر تو ہے۔ امیروں کے اپنے ٹنٹے جھگڑے ہیں ہم غریب لوگ ان میں کیوں پڑیں؟

ایلوکشی نے ایک بار پھر چندر پر زبانی تیر برسائے۔ وہ اب چٹائی پر بیٹھا ٹیک لگائے حقہ گڑگڑا رہا تھا۔لگتا تھا جیسے بھیشم تیروں کے بچھونے پر بیٹھا ہو۔

ایلوکشی کی جلی کٹی باتیں شاید یوں بے ثمر نہ رہتیں، لیکن چندر ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس نے اس طرح جماہی لی جیسے اس نے کچھ نہ سنا ہو۔

شام ہوگئی تھی۔ آنگن میں خاموشی تھی۔ ذرا دور مویشی رات کے لئے ستانے کو بیٹھ رہے تھے۔

اٹھنے سے پہلے اظہر بولا''جوگین کی ماں، میں کل پھر آؤں گا آج اس کے تیور اچھے نہیں۔'' اظہر کھیتوں کی طرف چل دیا۔ شام کے دھندلکے میں رنگے کھیت اظہر کے اپنے ذہن کی طرح خالی۔ وہ ہوا کی سرسراہٹ سنتا رہا۔

اظہر نے یکبارگی کان کھڑے کئے۔ چندر برا بھلا کہہ رہا تھا۔''نہیں، میری آنکھیں نہیں ہیں۔ مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ مسلمانوں کو بھی تو دیکھو ان کی آنکھیں بھی نہیں رہیں۔''

ایلوکشی کی آواز چندر کی آواز میں گھل مل گئی۔''تمہیں کیسے دکھائی دے؟ تاڑی میں تو دھت ہوتم۔''

اظہر نے مڑکر چندر کے گھر کی طرف دیکھا ایک انجانے دکھ سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اگلے دن اظہر موسمی فصل کے لئے کھیتوں کی گوڑائی کر رہا تھا۔ اس نے کئی سال سے مولیاں نہیں بوئی تھیں۔ اس سال وہ تھوڑی بہت لگائے گا۔ اور کھیتوں کے کنارے

MashalBooks.org

کنارے شکر قندی۔ امجد اس کے ساتھ آیا تھا۔ آج کل وہ اپنے باپ سے کتراتا تھا۔ وہ اسکول میں پڑھتا تھا تو اس عمر میں کھیتوں میں کام کیوں کرے؟

وہ خاموشی سے باپ کی بات مان رہا تھا۔ اظہر نے کچھ بانس کاٹے تھے۔ امجد کھیت کے گرد باڑ لگانے کو کھچپیاں بنا رہا تھا۔ اگر باڑ نہ لگی تو مویشی فصل نہ ہونے دیں گے۔

کسان دور پرے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ابھی تک تو کھیتوں کا رنگ اور ان کی باڑ ہوا سے جھولتے دھانوں کی بدولت قائم تھی۔ اب وہ بالکل ویران تھے۔ ہاں کسانوں کے آنگنوں میں بھوسہ کے ڈھیر اونچے ہو گئے تھے۔

اظہر ادھر ادھر دیکھے بغیر اپنے کام میں لگا رہا۔ امجد بھی چپ چاپ کام کئے جا رہا تھا۔ سیٹی کی آواز پر چونکا۔ یہ ضرور چندر کا کا ہوں گے۔ ان کے کھیت دو چار بیگھے پار ہی تو تھے۔ آہستہ آہستہ چندر کا ہیولی کھیت کی منڈیر پر نظر آیا۔

امجد کا دل اب کام میں نہ لگا۔ بس ابھی چندر کا کا ادھر آ جائیں گے اور پھر اسے کام کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ لیکن چندر کھیت میں نہ آیا۔ سامنے آنے سے پہلے وہ کچھ دیر کیلے کے پیڑوں کے پیچھے رکا پھر اس کی بے ساختہ سیٹی تھم گئی۔

امجد نے اسے سلام کیا۔ ''ارے چندر کا کا'' ان کی آنکھیں ملیں۔ ہنسی دبائے ہوئے چندر نے نظر پھیر لی۔

''ارے کا کا۔''

چاچا نے پھر بھی جواب نہ دیا۔

اظہر پھاوڑے سے زمین برابر کر رہا تھا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔

چہرے پر مسکراہٹ لئے امجد چندر کی طرف بڑھا مگر اظہر نے اسے ڈانٹ دیا۔

''کام کرو اپنا'' چندر کچھ دور کھڑا تھا۔ مگر نظریں پھیریں۔ اظہر سر جھکائے اپنے کام میں ایسے لگا رہا جیسے وہ ایک دوسرے کو جانتے نہ ہوں۔ امجد دونوں کی شکلیں تکتا رہ گیا۔ گاؤں ہندو مسلم فساد کے کنارے کھڑا تھا۔ کیا یہ اس کا نتیجہ تھا؟

چندر دھیمے قدموں سے کھیت کے پار چلتا گیا اور ڈھلتی شام میں پیڑوں کے

MashalBooks.org

پرے اوجھل ہو گیا۔

امجد نے پوچھا ''چندر کا کا ہم سے بولتے کیوں نہیں؟''

''کچھ نہیں۔''

باپ کا ایسا روکھا جواب سن کر امجد کو کچھ اور پوچھنے کا یارا نہ تھا۔

سیٹی کی آواز تیرتی چلی آئی۔ چندر کا کا کے سوا اور کون ہوگا؟ اداس اور رنجیدہ امجد کھیتوں کے پار تکتا رہا۔

MashalBooks.org

تیئسواں باب

اظہر کی چندرامنی سے اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ وہ کبھی کبھار گاؤں آجاتی تھی۔ صرف چندرا کیلا گھر چھوڑ گیا تھا۔ اس کے رشتہ دار اب بھی گاؤں میں اپنے جدی پشتی گھروں میں رہتے تھے۔

اظہر اپنے دھیان میں گم چلا جا رہا تھا یا یک آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے پکارنے والے کی طرف دیکھا نہیں۔ چندرامنی کو پہچاننا آسان بھی نہ تھا۔ اجلی ساڑی پہنے، ہونٹ پان سے رچائے، جیسے وہ بیوہ نہ ہو۔ اسے کسی اور کی بیوی سمجھ کر اظہر شرمندہ سا ہو گیا۔

''ارے، دادا، میں چندرامنی ہوں۔''

اظہر حیران رہ گیا۔ چندر کی آمدنی ضرور بڑھ گئی ہو گی۔ راجندر کے ساتھ مل کر سوانگ منڈلی بنا کر خوب کمالیا ہوگا۔

''ارے منی، یہ تم ہو، میں سمجھا کوئی اور ہے۔''

چندرامنی ایک اکھڑ لڑکی کی طرح ہنسی۔ ایک سال پہلے ہی تو ملیریا نے اس کی کیا درگت بنا ڈالی تھی۔

''تم اب ہماری طرف کیوں نہیں آتے، دادا؟''

اظہر نے شرم سے نظریں جھکا لیں۔

'' کیسے آؤں۔ چندر تو مجھ سے بات تک نہیں کرتا۔''

''اس لئے ایلوکشی اس سے لڑتی رہتی ہے۔''

''اگلے دن میں نے اسے دیکھا۔ ٹھیک نہیں لگتا تھا وہ۔''

چراوہے مویشیوں کو واپس لا رہے تھے۔ اظہر اور چندرامنی سڑک کے ایک طرف کو ہو لئے اور بات چیت جاری رکھی۔

MashalBooks.org

''بہت پیتے ہیں وہ۔'' چندرامنی نے کہا۔ ''کچھ ہو گیا ہے انہیں۔''

''کیا ہوا۔''

''مجھے تو بالکل ہی برداشت نہیں کر سکتے، ہر وقت ڈانٹتے رہتے ہیں۔''

''بس ایسے ہی بے وجہ؟''

''جی۔''

اظہر نے چندر کے حال پر کچھ افسوس نہ کیا۔ مویشیوں کا ایک اور ریوڑ بڑھا آ رہا تھا۔ ادھر دیکھتے ہوئے اظہر نے کہا۔ ''چندر واقعی اچھا آدمی ہے۔ کیوں بدل گیا وہ اتنا؟''

''کون جانے؟''

''راجندر کے چنگل میں تو نہیں پھنس گیا وہ۔''

چندرامنی کچھ نہ بولی۔ چپ رہی۔

اظہر نے بات جاری رکھی ''وہ لونڈا راجندر اچھا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ مل کر شاید وہ تاڑی زیادہ پینے لگا ہے۔''

نہیں دادا، راجندر تو.....''

اپنے حمایتی لہجہ پر چندرامنی پریشان ہو گئی۔

''امیروں کی لڑائی نے انہیں بگاڑا ہے۔''

''اگلے دن میں بھی اس سے نہیں بولا۔ مجھے بھی غصہ آ گیا تھا۔''

چندرامنی ہنس پڑی۔ ''میرے دونوں بھائی پگلے ہیں'' اظہر پر اس مذاق کا اثر نہ ہوا۔ اپنی بات کہتے ہوئے وہ بولا ''آج کل اس کے حال چال کیا ہیں۔''

''بہت اچھے، لکشمی ماتا کی دیا سے۔ تھیٹر سے کچھ پیسے بنا رہے ہیں وہ۔''

اظہر کو حسد کی جلن ہوئی۔ چندر کو تل مزے میں تھا۔

''اچھا اب اجازت، دادا ہم سے ملنے کسی دن آؤ نا!''

چندرامنی اب اور دیر نہ ٹھہری۔

MashalBooks.org

چوبیسواں باب

دونوں زمیندار مقدمہ بازی میں جکڑے ہوئے تھے۔ گاؤں میں اب اور کوئی جھگڑا نہ تھا۔ وہ ذرا دیر کا ہنگامہ شور وغل اب دب گیا تھا۔ چندر کوتل اظہر سے کتراتا تھا۔ ایلوکشی چندر سے اکثر اظہر کے معاملے میں لڑ پڑتی۔ چندر کوتل کے گھر کے قریب تک جاتا مگر اس سے ملنے کا حوصلہ نہ رکھتا تھا۔ شاکر کی رونی چودھری سے دوستی ہوگئی تھی۔ کسان اپنی فصلوں کے کام میں مصروف تھے اور انہیں زمینداروں کی لڑائیوں سے کچھ سروکار نہ تھا۔

ایک دن ایلوکشی اپنے طور پر ان سے ملنے آئی۔ اظہر گھر نہیں تھا۔ وہ بیج خریدنے دوسرے گاؤں گیا ہوا تھا۔

دریابی بی دھوپ میں بیٹھی چاولوں کا شولہ کھا رہی تھی۔

''میں اچھے وقت آئی ہوں۔'' ایلوکشی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آؤ، آؤ، دیدی۔''

دریابی بی نے کھاتے کھاتے، اسے بیٹھنے کو پیڑھی دی۔

ایلوکشی بہت ہی جلدی میں تھی کہنے لگی۔ ''کھاؤ، کھاؤ۔ میں بھی جلدی چلوں گی۔''

''کیوں؟ کیا مجھ سے لڑنے آئی ہو؟''

ایلوکشی نے ہنسنا شروع کر دیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے دیدی؟ ہر جگہ لڑائی جھگڑے۔ گاؤں۔ گھر میں۔''

''چندر کوتل سے بھی.....''

''ہاں''

دریابی بی نے جلدی سے کھانا ختم کیا۔ ایلوکشی نے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا۔

''یہ میری امانت رکھ لو۔''

MashalBooks.org

''میرے پاس کیوں؟''

''بس رکھ لو۔''

پھر اس کے کان میں کھسر پھسر کر کے کہا۔''میں اسے گھر میں کسی طرح نہیں رکھ سکتی، کسی طرح بھی نہیں۔''

''کیا سوانگ منڈلی سے پیسے کمائے جا رہے ہیں؟''

''ہاں، وہ لوندا راجندر بھی کمال کی چیز ہے۔ اب وہ ایک جاترا تھیٹر منڈلی بنانا چاہتا ہے۔''

اچانک آنگن میں ایک اجنبی کی پرچھائیں پڑی۔ ایلوکشی نے اس شخص کو پہلے نہ دیکھا تھا۔ اس نے ساری کے پلو سے فوراً سر ڈھک لیا۔

دریابی بی نے آنکھ اٹھا کر دیکھا اور ہنس دی۔

انجانا آدمی یعقوب تھا۔ دریابی بی نے ایلوکشی کے کان میں کہا''میرے میاں کا پھپیرا ہے۔''

یعقوب دالان میں چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بقچہ سا تھا وہ اس نے دریابی بی کو حفاظت سے رکھنے کے لئے دیا۔

''سب خیر خیریت ہے؟''دریابی بی نے پوچھا۔ ایلوکشی نئی نویلی دلہن کی طرح سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔ ڈانٹ کے لہجے میں دریابی بی بولی۔''گھونگھٹ اٹھالو، تمہارا بھی بھائی ہے۔''ایلوکشی نے گھونگھٹ ہٹا کر یعقوب کو نظر بھر کے دیکھا۔

''میری طبیعت اچھی نہیں۔ دریابی بی۔ پچھلے چار پانچ دن سے بخار آ رہا ہے مجھے۔ اب تمہارے گھر آ گیا ہوں میں۔''

''گھر سے بخار میں چلے آئے تم؟''

''جی ہاں''

ایلوکشی نے اجازت مانگی۔

''کاروبار کی دیکھ بھال کو اور کوئی نہ تھا؟''

ابھی تک یعقوب نے برداشت سے کام لیا تھا۔ اس کی بے چینی پتہ نہ چلتی تھی۔

MashalBooks.org

اب وہ بولا ''دریابی بی میرے لئے بچھونا کر دو۔ میں لیٹ جاؤں تو اچھا ہے۔''

''ابھی کرتی ہوں۔ مگر وہ میری بھابیاں کیسی عورتیں ہیں۔ تمہیں بخار میں آنے دیا؟''

یعقوب کچھ نہ بولا۔ دھوپ اسے اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے دالان سے سر باہر کو نکالا۔ دریابی بی بچوں کی کوٹھری میں بستر کر کے پلٹی۔

''بہت بری بات ہے۔ تمہیں بخار تھا اور پھر بھی انہوں نے آنے دیا۔ شاید کسی کو پتہ ہی نہ ہو۔''

''پتہ تھا انہیں اچھی طرح۔ میرا ماتھا چھو کر دیکھو۔''

دریابی بی نے بات دہرائی ''تمہیں بخار میں آنے دیا؟''

''میں تو منڈی سے آرہا ہوں۔''

حقیقت یہ ہے کہ یعقوب جیسے جھوٹے دنیا میں بہت کم تھے۔ اس کی گھریلو زندگی میں کوئی خوشی کوئی اطمینان نہ تھا۔ دونوں بیویاں کھلم کھلا لڑتی رہتیں۔ اس جیسے بدمعاش کی حرکتیں اس کی بیویوں کے کانوں تک بھی پہنچی ہوں گی۔ وہ گھر سے دونوں بیویوں سے لڑ کر آیا تھا۔ دریابی بی کو اس کا شمہ برابر بھی پتہ نہ چلا۔

یعقوب کا پچھلے کئی مہینوں سے اس گھر میں آنا جانا تھا۔ اس کی فیاضی نے اس کی ساکھ بنا رکھی تھی۔ دریابی بی نے اس کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ بخار کم کرنے کو اس نے ٹھنڈے پانی سے سر دھلا دیا۔ بستر پر ایک موٹا گدا بچھایا۔ جو یعقوب کے پیسوں سے ہی خریدا گیا تھا۔ اور کھڈی کی بنی ایک صاف چادر اسے اڑھائی۔

عاشق جان جو اپنی کوٹھڑی سے کم ہی نکلتی تھی۔ امجد سے خیر خبر لے لیتی۔

اس کے صندوق میں ایک پرانی شال تھی۔ کسی مردے کی میراث جو رشتہ داروں نے خیرات کر دی تھی۔ دریابی بی نے چادر کی جگہ شال اڑھادی۔ یعقوب کو ان گھریلو آسائشوں میں مزہ آرہا تھا۔

امجد نے یعقوب کے سر کی مالش کی اور نعیمہ اپنی دکھتی آنکھوں سے بڑے تجسس سے اسے دیکھتی رہی۔

MashalBooks.org

اس بیماری کے باوجود بھی یعقوب نے رشتہ داری کی وضع پورے سلیقے سے نبھائی تھی۔ بچوں کے لیے مٹھائی اور دوسری مزیدار چیزیں لانا نہ بھولا تھا۔ وہ چیزیں جو انہیں سونے کی صندوقچی سے زیادہ عزیز تھیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی کو بھی وہ نہ بھولا۔ اسکے لیے خوبصورت کپڑے لایا تھا۔

دریابی بی اس کے لیے پرہیزی کھانا لے کر آئی۔ یعقوب نے اپنے اردگرد بڑی مطمئن نظر ڈالی۔

دریابی بی بولی ''ڈاکٹر کو بلانا چاہئے۔''

''نہیں'' یعقوب نے منع کیا۔ ''میں اس کے بغیر ہی اچھا ہو جاؤں گا۔ ان کی دوائیں نگلنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

ساگودانہ ختم کر چکنے کے بعد اس نے دس کا نوٹ نکالا۔ دریابی بی نے ذرہ بھر احتجاج نہیں کیا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ بے کار ہوگا۔ یعقوب بہت ضدی تھا۔

دوپہر تک وہ بخار سے کراہ رہا تھا۔ کمرہ میں کوئی اور نہ تھا۔ دروازہ کھلنے کی آہٹ سے اس کی آنکھ کھلی۔ دریابی بی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''ٹھیک ہو؟''

اس نے پھر کراہنا شروع کر دیا۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ ''کوئی دبا دے تو کچھ سکون ملے۔''

''اچھا، چلو میں دبا دیتی ہوں۔''

دریابی بی نے یعقوب کا سر دبانا شروع کیا۔

''دریابی بی میں تمہارا بہت احسان مند ہوں۔''

''اصل اس کے الٹ ہے۔ یہ تو میں.....''

یعقوب نے اس کے منہ پر رکھنے کو اپنا ہاتھ اٹھایا، اپنا سر پیچھے کرتے ہوئے دریابی بی بولی۔ ''یہ تو ہم تمہارے احسانوں کے مقروض ہیں۔''

یعقوب نے دس روپے کا ایک اور نوٹ نکالا۔ ''پھر ذرا اور مقروض ہو جاؤ ورنہ میں مر جاؤں گا۔ یہ میری آخری بیماری بھی ہو سکتی ہے۔''

MashalBooks.org

کیا آدمی ہے یہ! ضرور ہذیان بک رہا ہے۔ دریا بی بی نے نوٹ ہاتھ میں لیا اور پھر یعقوب کے تھیلے میں رکھ دیا۔ یعقوب اسے دیکھتا رہا اور ایک حرف بھی زبان سے نہ نکالا۔

''ڈاکٹر کو بلا لینا چاہئے۔ تم کیا کہتے ہو؟''

''اگر تم ڈاکٹر کو بلاؤ گی تو میں بخار میں ہی گھر چلا جاؤں گا۔''

یعقوب کو ذرا دیر میں نیند آ گئی اور دریا بی بی نے سر دبانا بند کر دیا۔ امجد کی آواز سن کر وہ یعقوب کے بستر کے پاس سے اٹھی اور باہر آ گئی۔ گھر کے ایک ہزار کام اس کے کرنے کو تھے۔

سورج ڈوبنے سے پہلے اظہر سر پر ایک بوری رکھے پلٹا۔ اسے ککڑی کے بیج نہیں ملے تھے۔ پودے ایک تو سوکھے ہوئے تھے اور دوسرے مہنگے بہت تھے۔ یعقوب کے آنے اور بیمار ہونے کی بات اس کے کان میں پڑی، لیکن اس سے ملنے کی اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا اور کچھ کھا پی کر دالان میں بیٹھ کر حقہ پینے لگا۔

دریا بی بی نے کہا۔''جا کے دیکھ آؤ اسے۔ تھوڑا سا تمیز نہیں برت سکتے۔ آخر وہ کیا سوچے گا؟''

اظہر کو دریا بی بی کی سرزنش اچھی لگی۔ اب دریا بی بی گھر بار کی باتیں اس سے کرنے لگی تھی۔ وہ اس سے اسی طرح کی امانت کی توقع کرتا تھا۔

اظہر یعقوب سے بڑی دیر تک اپنے گھر بار کی باتیں کرتا رہا۔ اس کی کھیتی باڑی، بچوں کی تعلیم، نعیمہ کی آنکھوں کی بیماری اور دوسری چھوٹی موٹی باتیں۔ اس نے ککڑی کے پودوں کی بات تک بتا دی۔

یعقوب نے بیس روپے کا نوٹ جیب سے نکالا اور اظہر کو تھماتے ہوئے بولا''اظہر بھائی تم نے اکیلے بہت دکھ جھیلے۔ اب میرے ساتھ حصہ داری میں کام کر لو۔ کوئی مشکل تمہارے راستے میں نہیں آئے گی۔''

اظہر نوٹ ہاتھ میں لئے کچھ دیر بیٹھا رہا۔ اور پھر قدرے ہچکچاہٹ سے یہ پیشکش قبول کر لی۔

''کیا کہتے ہیں آپ؟''

MashalBooks.org

''بہت مشکل پڑ رہی ہے۔ تمہارے ساتھ حصہ داری میں کام کرنے کی تجویز اچھی ہے۔''

اظہر رات گئے تک باتیں کرتا رہا۔ وہ تو دریا بی بی نے ڈانٹ پلائی کہ بس کرو اب، بہت ہوئی۔ کھانا کھلاتے ہوئے دریا بی بی ہنس کر بولی۔ ''یا تو اس سے ملنے کو تیار نہیں تھے اور اب چپک کر ہی رہ گئے۔''

MashalBooks.org

پچیسواں باب

بیساکھی کی ایک طوفانی رات میں عاشق جان گزر گئی۔ کسی کو یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ اس نے کب دم دیا۔ کچھ دنوں سے امجد دوسرے کمرے میں سوتا تھا۔ دن چڑھے تک جب عاشق جان باہر نہ نکلی تو دریابی بی اس کی کوٹھڑی میں اسے دیکھنے گئی۔ بڑھیا کا ٹھنڈا جسم وہاں پڑا ہوا تھا۔

دریابی بی کچھ دیر تک روتی رہی۔ امجد، اور اظہر بے وقوفوں کی طرح اسے دیکھتے رہے۔ بڑھیا کے آگے پیچھے اظہر کے سوا کون تھا۔ سو اس نے پڑوسیوں کے ساتھ مل کر اس کا کفن دفن کیا۔

دریابی بی نے بے چاری بڑھیا کی زندگی کا سوچا اور دل میں سوچتی رہی کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ شاید اس کے نصیب میں بھی ذلت کی موت لکھی ہے۔

ایک ہی ہفتہ میں عاشق جان دھیان سے اتر گئی۔ چوتھے کی فاتحہ پر دریابی بی نے دو بھکاریوں کو کھانا دے دیا۔

عاشق جان کی وفات کے بعد امجد کچھ دن اکیلے نہیں سو پایا۔ مناظر تو تھا نہیں۔ اسے اپنی چھوٹی سی کوٹھڑی میں بھی سونے سے ڈر لگتا تھا۔

''کس بات کا ڈر ہے تمہیں؟'' دریابی بی نے اسے ڈانٹا۔ ''تمہاری دادی تو جنت میں ہیں۔''

امجد کا ڈر پھر بھی نہ نکلا۔ اسکول میں اس نے بھوتوں کی کہانیاں سنی تھیں۔ اور نقش آسانی سے مٹنے والا نہ تھا۔

اس نے ماں سے پوچھا۔ ''ماں لوگ مر کے کیا بھوت ہو جاتے ہیں؟''

''ہاں، صرف برے لوگ۔''

MashalBooks.org

''اور دادی؟''

''وہ ایک اچھی عورت تھیں۔ وہ جنت میں گئیں۔''

''اچھے لوگ کیا دوسروں کے گھروں میں کھاتے پھرتے ہیں؟''

''غریب تھیں وہ، بیچاری۔''

دریابی بی کو لگا کہ اس کے جواب سے اسکے بیٹے کو اطمینان نہیں ہوا۔

''مجھے ڈر لگتا ہے۔ دادی اب بھی میرے پاس سوتی ہیں۔''

دریابی بی نے امجد کو بدشگونی سے بچانے کو تھوتھو کیا۔

''تمہیں، یہ اس لئے لگتا ہے کہ تم ان کے ساتھ سو کر بڑے ہوئے'' وہ بولی۔

''مجھے ڈر لگتا ہے، ماں''

''اب تو بڑے ہو گئے ہو، حوصلہ نہیں تم میں.....''

''تو''

امجد ماں کے پاس گھس کر سوتا رہا۔ کٹھل کے پیڑ میں ہوا سرسراتی تو وہ ماں سے چمٹ جاتا۔ خواب میں دادی عاشق جان، لٹھیا ٹیکتی، کسی کے چہلم کا فاتحہ کا کھانا کھانے جا رہی تھی۔

اظہر تک جب یہ معاملہ پہنچا تو وہ امجد کو مکتب کے مولوی کے پاس لے گیا انہوں نے قرآنِ مجید کی آیت اس پر پڑھ کر پھونکی او رایک گلاس پانی پر۔ اظہر کو یہ متبرک پھونکیں ایک روپے میں پڑیں۔ مولوی نے امجد سے جمعہ کو پھر آنے کو کہا۔ اظہر نے دل میں کہا تھا تا کہ ایک روپے اور رکھ سکو۔

امجد کا ڈر کسی طرح جاتا ہی نہ تھا۔ مارے ڈر کے وہ اکیلا برآمدے میں نہ بیٹھتا۔ لیکن اس نے ماں سے یہ بات چھپائی۔ کسی اور وجہ سے اس نے اپنے ڈر پر قابو پا لیا۔

ان روپئوں کے علاوہ جو یعقوب نے اظہر کو دئے تھے اب اس کے پاس اور بھی کچھ پیسے تھے۔ دریابی بی سے چھپا کر، عاشق جان نے ایک چھوٹا سا ڈبہ اظہر کے پاس رکھوایا تھا۔ اس میں کوئی بیس کے قریب روپئے تھے۔ دریابی بی کو اس کی کچھ خبر نہ تھی۔

سب مل ملا کر اظہر کے پاس اب قریباً پچاس روپئے تھے جیسے وہ مچھلی یا کسی

اور کاروبار میں لگا سکتا تھا۔ لیکن اسے یعقوب اچھا نہ لگتا تھا۔ جس کی چپڑی مانگ، رنگین لنگیاں اور ڈھیلی ڈھالی دھوتیاں اظہر کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ اس کے ساتھ مل کے کاروبار کرنا شاید ممکن نہ ہو۔ یعقوب اس سے چھوٹا تھا اور اظہر کو یہ بات مناسب نہ معلوم ہوتی تھی کہ وہ اس کا حکم مانے۔ لیکن پیسہ یعقوب ہی لگاتا اور اظہر کے پاس اس کے اشاروں پر ناچنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ جاتا۔

اگر کہیں چندر ہی مل جاتا۔ ہندو مسلم جھگڑے کے بعد سے چندر نے اس طرف کا رخ نہیں کیا تھا۔ اگلے دن ایلوکشی آئی تھی۔ کیسی سمجھدار عورت تھی۔ ''بادشاہوں کی لڑائی میں ہم تو تنکے ہیں۔'' اس نے کہا تھا۔ ''ہم کیوں جا کے اپنے سر پھٹوائیں؟'' ایلوکشی سچی تھی۔ چندر کا معاملہ دوسرا تھا۔ اظہر اس سے مایوس ہو گیا تھا۔

اس گاؤں میں دو عقیدوں کے مسلمان رہتے تھے۔ حنفی اور ''لامذہبی'' جس میں لامذہبوں کی کثرت تھی۔ حاتم بخش خان حنفی تھا۔ اس کی ترغیب پر گاؤں میں ایک بڑا جلسہ ہوا جس کو دونوں عقیدے والوں کی رضا مندی حاصل تھی۔ تین یا چار مولانا بھی اس موقع پر بلائے گئے تھے۔

مسلمانوں میں مذہب کے معاملے میں جوش ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔ پانی کے ٹیکس والے معاملے نے اس میں کچھ جان ڈالی تھی مگر حاتم بخش کی تسلی نہ ہوئی تھی۔ مسلمان بدعقیدہ ہوتے جا رہے تھے۔ اب بھی کچھ مسلمان ہندو روہنی چودھری کے ساتھ تھے۔ مذہبی جوش کو ہوا دینا بہت ضروری تھا۔ حاتم بخش کو مسلمانوں کے تفرقے سے بڑی مایوسی تھی۔ اسلام کے زوال دیکھ کر اس کے دل میں سینکڑوں شگاف پڑ گئے تھے۔

گاؤں کی عید گاہ میں جلسہ کا اہتمام تھا۔ بہت لمبے چوڑے شامیانے لگائے گئے تھے اور مولاناؤں کے لئے اسٹیج بنائی گئی تھی۔ چٹائیوں اور دریوں کا فرش کیا گیا تھا۔ پڑوس کے گاؤں سے بھی بہت سے مسلمان آئے تھے۔

ایک مولانا کی تقریر سے وعظ شروع ہوا۔

''بھائیو''

بھائیوں نے کان کھڑے کئے۔ اسلام کی ابتر حالت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا

پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ تھوک نگل کر، آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں انہوں نے کہا ''اسلام خطرے میں ہے، اور اگر ابھی تک اس کا نام باقی ہے تو وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ حاتم بخش خان جیسے برگزیدہ لوگ باقی ہیں۔ جس دن یہ نہ رہے تو خدا معلوم اسلام کا کیا حشر ہو۔ مسلمانوں کی بدعقیدگی پر فرشتے بھی آنسو بہاتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کو پھر بھی خیال نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ کے یہ نافرمان بندے اس طرح ہیں جیسے سینکڑوں تیر کلیجے کے آر پار ہوں۔ ''یااللہ!'' وہ ایک بار پھر روئے۔ حاتم بخش ان کے عین سامنے قالین پر بیٹھے تھے۔ اپنی آنکھیں رومال سے پونچھتے رہے۔

سننے والوں کی آنکھیں نہ سہی دل ضرور بھیگ گئے تھے۔

''عزیز بھائیو! میرا اللہ، بزرگ و برتر، غائب و حاضر، قرآنِ مجید میں فرماتا ہے۔ اکٹھے ہو جاؤ اور اللہ تعالیٰ کی رسی مضبوطی سے پکڑ لو۔ سختی سے اور مضبوطی سے.....''

مولانا نے مکا تان کر دکھایا۔

''مضبوطی سے پکڑو جس طرح حاتم بخش خان مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔''

حاتم بخش کا نام جو بار بار دہرایا گیا تو دوسرے معززین کافی پریشان ہوئے بنیادی وجہ جلن تھی۔

''عزیز بھائیو'' خطبہ پھر شروع ہوا ''اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے احکام نہ مانے تو تم دوزخ میں جلائے جاؤ گے اور حشر کے دن تمہیں رسول ﷺ کی شفاعت نصیب نہ ہوگی۔ ہرگز نہیں.....''

''ہرگز نہیں.....قطعاً نہیں.....''

مجمع میں سارے سر ایک ساتھ ہلے۔

ایک گہری سانس لے کر مولانا نے کہا ''ہمارا، رسول ﷺ پر درود ہو''

درود کافی دیر تک پڑھا جاتا رہا۔

''دوزخ کی آگ کبھی نہیں بجھتی۔ بدتر گناہگاروں کے لئے بدتر دعائیں۔ اس قدر آگ، اس قدر تپتی آنچ.....''

دوزخ کا ذکر کر کے مولانا تھک گئے۔ ان کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ شاید جہنم کی

MashalBooks.org

آگ سے.....ایک گلاس پانی غٹاغٹ پی گئے۔

ایک ڈکار لے کر انہوں نے دوزخ کی آگ پھر بھڑکانا شروع کر دی۔ دن گرم تھا۔ جلسہ اس سے زیادہ گرم ہوتا گیا۔

اسی دوران میں کسی نے حاضرین پر گلاب چھڑکا۔ ہوا میں خوشبو کے پھیلتے ہی جلسہ اور بھی سنجیدہ ہو گیا۔ پھر ایک مولانا اٹھ کھڑے ہوئے انہیں لامذہبیوں نے مدعو کیا تھا۔

کچھ دیر انہوں نے بھی اسلام کی ابتر حالت کا حال زار بیان کیا۔ اب دوسرے معززین کے نام لئے جا رہے تھے۔ سچے مسلمان وہی تھے۔ حاتم خان کا نام اس فہرست میں شامل نہ تھا۔ سو اب ان کے دل میں حسد کے اکھوے پھوٹ رہے تھے۔ مولانا نے سیرۃ الاولیا کا موضوع اٹھایا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ جیسے لوگ اب پیدا نہیں ہوتے۔ علی کرم اللہ وجہہ ایک دراز قد شخص تھے۔ ان کی داڑھی ان کی ناف تک پہنچی تھی۔''

''غلط'' دوسرے مولانا نے احتجاج کیا ''علی کرم اللہ وجہہ دراز قامت نہیں تھے اور نہ ان کی داڑھی اتنی لمبی تھی۔''

''خاموش''

''صحابہ کرامؓ کے بارے میں گستاخی کے مرتکب نہ ہو''

''کس نے گستاخی کی ہے؟ کیا امام ابوحنیفہ غلط تھے؟''

''ابوحنیفہ کون ہیں؟''

''امام''

''تو پھر امام صحیح نہیں ہیں''

اس پر مذہبی والے بہت خوش ہو گئے۔ ان کی قطاروں میں خوشی کی ایک ہنکار پھیل گئی۔

لیکن حنفی، امام ابوحنیفہ کے پیروکار، اس بات پر مولانا سے بہت خفا ہو گئے۔

''چپ ہو جاؤ'' پہلے مولانا چلائے۔ لیکن ان کے مخالف کو چپ کرانا آسان نہ تھا۔

''یہ خرافات کون سی کتابوں میں ملیں تمہیں؟ سنن ترمذی کے مطابق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ریش مبارک ناف تک، نہیں تھی۔''

MashalBooks.org

''تمہاری کتاب جھوٹی ہے''

ان مولانا کے حنفی حلیف چپ رہنے والوں میں سے نہ تھے۔ مجمع میں غصہ کی بھنبھناہٹ پھیل گئی۔

''خاموش رہو'' مذہبی والے مولانا چلائے۔

''نہیں، چپ رہتا میں۔'' حنفی مولانا نے بھی اتنا ہی چلا کر جواب دیا۔

''بدتمیز ہو تم۔''

مخالف کا صبر اب ہاتھ سے جاتا رہا۔ وہ چلایا۔ ''تم خود ہو بدتمیزوں کی اولاد۔''

''یہ بات ہے، حرامزادے۔''

وہ فوراً اٹھے اور مولانا شاہ فخرالدین کو کھینچ کر تھپڑ مارا۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے کو پکڑ لیا اور وہ ہاتھا پائی شروع ہوئی کہ داڑھیاں نچ گئیں۔

دونوں گروپوں کے حامی جیسے ہی اپنوں کی حمایت میں دوڑے مجمع تتر بتر ہو گیا۔ مولاناؤں کے آپس کا جھگڑا ان کے حامیوں کی لڑائی کا پیش خیمہ بن گیا۔

''مارو سالے مذہبیوں کو، فرش کر دو سالے حنفیوں کو.....''

متبرک جلسہ میں متقی مسلمان یک دم ہی ایک دوسرے سے گالم گلوچ پر اتر آئے۔

اب حاتم بخش کو بھی غصہ آ گیا اور انہوں نے اپنے حلیف مولانا کے حق میں چلانا شروع کر دیا لیکن اسے جیسے ہی یہ احساس ہوا یہ دھینگا مشتی ختم نہیں ہونے والی وہ ایک عیار آدمی کی طرح اندھیرے میں ایک طرف کو سٹک لیا۔

جلسہ میں اظہر خان بھی آیا تھا۔ عام طور پر مزاج کا حلیم انسان، ان معاملوں میں پکا مسلمان تھا۔ وہ بھی اسی طرح وحشی ہو سکتا تھا۔ روشنیاں بجھ گئیں تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دل کی بھڑاس نکالی۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتا رہا۔ ''مار ڈالو، حرام زادوں کو جو اپنے مذہب کے خلاف کوئی گستاخی نہیں برداشت کر سکتا۔

لڑائی تو داڑھیوں سے شروع ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ اپنی داڑھی صحیح حالت میں لے کر گھر تک نہ پہنچے اور بہت کچھ زخمی بھی ہوئے۔ اتنے ہی پر بس نہ ہوئی اب دونوں گاؤں ایک دوسرے کی مخالفت کے گڑھ بن گئے۔

MashalBooks.org

دوسرے کچھ مذہبی والوں کو حنفیوں کو مارنے پیٹنے کا موقع مل گیا۔ جنموں کا بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ دونوں طرف کے مولانا اس فساد کے جرنیل بن گئے۔ لیکن مرد میدان کہیں میدان میں نظر نہ آتے تھے۔ اپنے اپنے حجروں میں بیٹھے چوزوں کی کلیجی کا مزہ پلاؤ اور پراٹھوں کے ساتھ اٹھاتے رہے۔

فساد کا یہ تناؤ ایک ہفتہ تک جاری رہا۔ خدا معلوم یہ حالت کب تک رہتی اگر شاکر نے سب پر احسان نہ کیا ہوتا۔ شروع میں تو وہ بھی جذبات کے ریلے میں بہہ گیا۔ لیکن جب وہ یہ سمجھ گیا کہ ان مولاناؤں کا کیا ارادہ ہے اور فساد کی جڑ بھی وہی ہیں تو اسے غصہ آ گیا۔ اپنی لاٹھی اٹھائے پہلے تو حنفیوں کے گاؤں گیا گاؤں میں گھسنے سے پہلے ہی اس نے للکارنا شروع کیا۔ ''میرے ہاتھ میں لاٹھی ہے مگر لڑائی کرنے نہیں آیا ہوں۔''

گاؤں والے تماشہ دیکھنے کو اکٹھے ہو گئے۔ اس اکھڑ اور مضبوط آدمی سے کوئی بھی لٹھ پونگا کرنے کو تیار نہ تھا۔

شاکر نے ایک مولانا کو برآمدے سے کھینچا۔ دو تھپڑ لگائے اور لاٹھی سے بھی تواضع کی۔ ''فوراً نکل جاؤ یہاں سے'' اس نے کہا۔ ''فساد شروع کرانے آئے ہو یہاں؟ ہے نا؟ اپنی خباثتیں تو تم سے سنبھلتی نہیں اور تم یہاں مرید کرنے آئے ہو لوگوں کو!'' مریدوں کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ مولانا کے چھکے چھوٹتے دیکھ کر کوئی ایک قدم بھی نہ ہلا۔

شاکر خود وہابی تھا۔ اپنے گاؤں کے مولانا کی خوب پٹائی کر کے اس نے بھگا دیا تھا۔ گاؤں نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ شروع میں تو کچھ لوگ شاکر سے خفا تھے۔ لیکن جلد ہی انہوں نے بھی شکرانہ ادا کیا۔ بہت سی عورتیں اللہ تعالیٰ سے شاکر کے لئے دعائیں مانگتیں۔

مائیں، جو بچوں کے خیال سے ڈری رہتی تھیں اب انہیں بھی چین ملا۔

دو چار دنوں میں موہیش ڈنگا کے حالات پھر معمول پر پلٹے۔ اظہر پھر چپ رہنے لگا۔ پچھلے دنوں سے اس کی شکل دیکھ کر دریا بی بی کو بھی ڈر لگتا تھا۔ لگتا تھا مذہب کے نام پر بالکل ہی وحشی ہو گیا ہے۔ ویسے ایسی بدمزاجی اس نے پہلے کبھی نہیں دکھائی تھی۔

دریا بی بی نے ایک دن موقع ڈھونڈ کر بڑے طعنے سے اس سے پوچھا ''جب تمہارے بے خطا ہونے پر بھی کوئی تم پر ظلم کرتا ہے تو پھر یہ سارا غصہ کہاں چلا جاتا ہے؟''

MashalBooks.org

''کون سا غصہ؟''

''تمہیں تو یاد نہیں ہوگا، نہیں نا، جب زمیندار تمہاری ساری فصل اٹھوا کر لے گیا تھا اور تم بھیگی بلی بنے بیٹھے رہے تھے؟''

''ہونہہ''

''ہونہہ'' دریا بی بی نے طنز سے دہرایا۔ اس نے شاکر کی تعریف شروع ہی کی تھی کہ اظہر خاموشی سے کھیتوں کی طرف چلا گیا۔

امجد پہلے ہی سے کھیت پر تھا۔ اس کے اسکول کی چھٹی تھی۔ اسے کھیتوں میں کام کرتے شرم آتی تھی۔ لیکن گھر کی حالت دیکھ کر وہ باپ کا ہاتھ بٹانا چاہتا تھا گو کہ اس کے دل سے باپ کی عزت کم ہوتی جارہی تھی۔

مرچیں لگانے کے لئے ایک کیاری تیار کی جارہی تھی۔ ہل تو چل چکا تھا۔ اب صرف پودوں کے لئے نالیاں بنانا رہ گیا تھا۔ اس کے گرد مضبوط جنگلا لگانا پڑے گا کیونکہ گائے بکریاں مرچوں کے پودے شوق سے کھاتی ہیں۔

اس طرح کے کام امجد کو اچھے لگتے تھے۔ ایک چھوٹا پھاوڑا لئے وہ مٹی سے ایک سیدھی منڈیر بنا رہا تھا۔ اسی گھڑی بارش کا چھینٹا، پڑ گیا اور اس طرح کیاری کو پانی لگانے کی ضرورت نہ رہی۔

اظہر کا یوں اچانک چلے آنا امجد کو اچھا نہ لگا۔

''تم نے تو اچھا خاصا کام کر لیا''

''جی، ابا''

''شاباش''

''اس دفعہ ہم اپنی مرچیں منڈی میں نہیں بیچیں گے سارا سال خریدتے رہیں۔'' اظہر نے کہا۔

''ضرورت کے وقت آپ کو یہ بات یاد رہے گی''

''نہیں، ہم اس سال نہیں بیچیں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو۔''

اظہر کچھ ہچکچایا۔ ابھی اس کے پاس کچھ رقم تھی۔ پھر بھی اسے دھڑکا تھا۔ قسمت کے

کرم کو ختم ہوتے کیا دیر لگتی ہے؟

دن کی روشنی ماند پڑ گئی تھی اور کھیتوں کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔ باپ بیٹے نے موسمی فصل کے لئے کچھ دیر اور کام جاری رکھا۔ اچانک ہی کہیں دور سے آتی گانے کی آواز کان پڑی۔ باپ بیٹے دونوں ہمہ تن گوش بن گئے۔ گانے والا۔ دہرا دہرا کر گا تا رہا۔

''بھگوان، یہ جھاڑو اٹھائے لیو سر پر.....''

آواز جانی پہچانی تھی۔ اظہر پھر کام میں لگ گیا۔

''چندر کا کا، ہے نا ابا؟''

اظہر نے جواب نہ دیا۔ امجد نے کھیت کے پار دیکھا۔ گانے والا ابھی تک نظروں سے اوجھل تھا۔ امجد کا جی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ اظہر نے بھی دیکھا اسے کام میں غفلت اچھی نہ لگتی تھی۔

''کام کرو اپنا، امو''

''یہ چندر کا کا ہیں نا، ہیں نا؟''

''ہیں، پھر کیا کرو گے تم؟''

گانا جاری تھا۔

''بھگوان، جو بھی دیکھے تمہیں، اس کی آنکھوں میں مرچیں لگ جائیں''

امجد ہنس پڑا۔''ابا، چندر کا کا باؤلے ہیں بالکل، بھگوان اللہ تعالیٰ ہی ہوا نا کیوں؟''

''کام سے لگو اپنے''

کیلے کے پیڑوں کے پیچھے سے چندر پگڈنڈی پر سامنے آ گیا۔ اس کی آواز پاس آتی جا رہی تھی۔ امجد کو خوشی ہوئی۔ مگر اس کی خوشی ذرا دیر ہی کی تھی۔ چندر کا کا ان کی طرف نہیں آئے۔ ہندو مسلمان دونوں جھگڑ رہے تھے۔ لعنت ان کے جھگڑوں پر!''

اظہر نے پھر امجد سے کام میں دل لگانے کی تنبیہ کی۔

گانے والا ادھر ہی کو آ رہا تھا۔ امجد نے دیکھا کہ چندر کا کا باڑ کے باہر نہیں رکے۔ وہ مسلسل ان کی طرف بڑھتے آ رہے تھے۔ بالکل پاس آ کے چندر کوتل ان کے برابر آ کھڑا

ہوا۔

اظہر خاموشی سے کام میں لگا رہا جیسے چندر کوتل کی موجودگی کو نظر انداز کر رہا ہو۔امجد نے باپ کی خفگی کی خاطر آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔

تینوں چپ تھے۔ اس سے زیادہ الجھن میں وہ کبھی نہ ہوئے تھے۔آخرکار چندر بے وقوفوں کی طرح ہنس پڑا۔ اسے کنکھیوں سے دیکھ کر امجد پھر گوڑائی میں لگ گیا۔

''اظہر بھائی، ارے خان صاحب''چندر نے کچھ ہچکچا کر پکارا۔ دوسری جانب ابھی تک خاموشی تھی۔

''بیٹے، تمہارے ابا بہرے ہو گئے کیا؟'' چندر امجد سے مخاطب ہوا۔''بہرا ابا ہاں؟''

اظہر ٹس سے مس نہ ہوا۔ گو کہ اس نے کام کرنا روک دیا تھا۔کھی کھی کر کے ہنستا ہو چندر اظہر کے سامنے جا بیٹھا او راس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ ان کی آنکھیں ملیں۔ چندر کی ہنسی بے اثر نہ تھی۔ اظہر اپنی مسکراہٹ نہ دبا سکا۔

چندر نے انگلیاں چٹخائیں او رجست لگا کے امجد کو کندھے پر بٹھا کے کھڑا ہو گیا۔ امجد اب بڑا ہو گیا تھا۔ اب لوگوں کے کندھے چڑھتے اسے شرم آتی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا چندر اسے ہوا میں اچھال چکا تھا۔

مٹل مٹک کے ناچتے ہوئے چندر بولا''مجھے پرواہ نہیں مذہب کی۔ شاکر نے بالکل ٹھیک کیا ہے۔''

ابھی اس کی بات پوری ہی ہوئی تھی کہ ڈھلتی سہ پہر میں کھیت اس کی ہنسی سے گونج گئے۔ اچانک ہی امجد کو زمین پر اتارتے ہوئے اس نے کہا''چلم تو پلاؤ''

دوسروں کو بات کرنے کا موقع ہی نہ دیا او رچندر بولا''اب جو ہمارے پنڈت آئے تو داڑھی نوچ ڈالوں گا۔''

تینوں ہنس پڑے۔

''چندر کیا ہو گیا تھا تمہیں؟''اظہر نے پوچھا۔

''بھوت چمٹ گئے تھے مجھے۔''

''بڑا ہی جلالی بھوت تھا کوئی۔''

''ہاں خان بھائی، میری آنکھیں تو کل کھلیں۔''

چندر چپ ہو گیا اس کے چہرے پر کپکپی دوڑ گئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''کیا بات ہے، چندر؟''

اظہر نے ہمدردی سے ہاتھ بڑھایا۔

''شیبو، اسماعیل، دونوں ڈسٹرکٹ ہسپتال میں دم توڑ گئے۔''

''مر گئے؟'' اظہر سن ہو گیا۔ شیبو اور اسماعیل دونوں پانی کے ٹیکس والے فساد میں بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ تب سے یہ دونوں جگری دوست ڈسٹرکٹ ہسپتال میں تھے۔ تینوں بڑی دیر تک چپ بیٹھے رہے۔ شام نے افق پر اپنی سیاہی پھیر دی۔

''شیبو کے بیوی بچے فاقوں سے مر جائیں گے۔ روہنی اور حاتم حرامزادوں کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

اندھیرے میں ان کے چہرے نظر نہیں آ رہے تھے۔ چپ کو توڑتے ہوئے اظہر بولا ''چلو چندر، گھر چلیں۔''

چندر ایک حرف کہے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک آن میں وہ پگڈنڈی تک پہنچ گیا۔

باپ بیٹا، گونگوں کی طرح گھر کی طرف ہو لیے۔ امجد بے کل تھا۔ چندر کاکا سے وہ بہت دنوں بعد ملا تھا۔ اور ساری شام کھیت میں ہی بے کار بیت گئی تھی۔ ذرا دیر بعد چندر کے گانے کی آواز آئی۔

اظہر بولا ''بالکل ہی پاگل ہے چندر، تاڑی زیادہ پی گیا ہو گیا''

''نہیں ابا ان کے منہ سے بو نہیں آ رہی تھی۔''

لوک گیت کی دھن شام کے سائے میں لپٹے کھیتوں کے پار ہوا میں تیرتی چلی آئی۔ ایک دم سے امجد بولا ''ابا بھگوان کے معنی اللہ تعالیٰ ہیں نا؟''

''ہاں اظہر بے اعتنائی سے بولا۔

MashalBooks.org

چھبیسواں باب

ہاشو دریابی بی کے پاس اکثر آیا کرتی۔ گھنٹوں بیٹھتی جب تک کہ اس کی ساس اس کو فوری طور پر نہ بلوالیا کرتی۔

امجد مناظر کو ڈھونڈھنے گیا۔ دریابی بی کو یہ خبر نہ تھی کہ مناظر واپس اپنی ددھیال نہیں گیا۔

ہاشو نے امجد کو بہت سمجھایا بجھایا کہ وہ یہ بات ماں کو نہ بتائے کہیں وہ اور فکر مند نہ ہو جائے۔ امجد جھوٹ بول گیا۔ ''وہ وہیں ہے، ماں۔''

ہاشو کہہ رہی تھی ''دیدی، تمہاری چھوٹی بیٹی بہت پیاری ہے۔ اسے مجھے دے دو۔ میرے بچہ نہیں ہے۔''

''باؤلی ہوئی ہو۔''

''مجھے بچے کی اتنی تمنا ہے۔ چاہے اندھا لنگڑا ہی کیوں نہ ہو۔''

دریابی بی نے اس بانجھ عورت کو تسلی دی۔

''ہو گا تمہارے بچہ جب اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوئی۔ ابھی کون سی تمہاری عمر ڈھلی ہے۔''

ہاشو نے ٹھنڈی سانس بھری اور خاموش ہو گئی۔ اس پل امیرن امبیا کے ساتھ آ گئی۔

''آؤ، آؤ، بوبو آؤ'' دریابی بی انہیں دیکھ کر کھل اٹھی۔

''آخر وقت مل ہی گیا مجھے'' امیرن نے صفائی پیش کی۔ ''کام مجھے سارا دن دوڑائے رکھتا ہے۔''

''اصل میں تمہیں ہمارا خیال ہی نہیں'' دریابی بی مسکرائی۔

MashalBooks.org

''بوبو تم یوں کہو گی۔ سو پریشانیاں ہیں۔ بھات میرے گلے سے نہیں اترتا۔''

''کیوں کیا ہوا؟''

امیرن نے اپنے دیور کی کہانی سنائی جو اس کی جائیداد چھیننے کے درپے تھا۔ دو چار سال میں وہی تو امیا کے بیاہ کے کام آسکتی تھی۔ شاید اسے گھر داماد مل جائے وگرنہ اس ذرا سی لونڈیا کے جانے کے بعد وہ اکیلی کیسے رہ سکے گی۔

''امیا کے لیے پریشان مت ہو۔ اللہ تعالیٰ کی چیز، اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو۔ ہاں وہ تمہارا دیور بڑا کمینہ ہے۔ ''گدھوں کی طرح نظریں جمائے رہتا ہے''

امیا ماں کے پاس نہیں بیٹھی۔ وہ کٹھل کے پیڑ تلے امجد سے باتیں کر رہی تھی۔

''منی واپس نہیں آئے گا۔''

''ماں ابھی تک اس کے لئے روتی ہے۔'' امجد نے ملول آواز میں کہا۔

''وہ اچھا ہے۔''

''کیوں نہیں؟''

''ہاں، تم اسے لے کر کیوں نہیں آئے؟''

''ڈھونڈھنے تو گیا تھا۔''

سچ بات اس کے منہ سے نکلنے کو ہی تھی کہ اسے ہاشو کی ہدایت یاد آ گئی۔

''دیکھا ہے میں نے اسے'' امجد گھوم کو بولا۔''جب اس کا جی چاہے گا آجائے گا۔''

امیا اس جواب سے مطمئن نہ ہوئی۔

''جھوٹ ہے یہ۔ اگر تم اس سے ملے تھے تو وہ کیوں نہیں آیا؟''

''وہ نہیں آنا چاہتا۔''

''وہ پڑھتا بہت اچھی طرح ہے۔''

ان دونوں کی بات چیت مناظر کے گرد گھومتی رہی جیسے اس کے سوا بات کرنے کو اور کچھ بھی نہ ہو۔

امیرن، ہاشو اور دریا بی بی باتیں کرتی رہیں۔ لفظوں میں تکلیف کم کرنے کی بڑی

MashalBooks.org

قوت ہوتی ہے۔ ایک کا دکھ، دوسرے کے دکھ کی آنچ کو کم کر سکتا ہے۔ ہمدردی کا ایک رشتہ سا بندھ جاتا ہے۔

''بدنصیب'' امیرن نے ہاشو سے کہا۔'' بچے کے لئے تڑپتی ہے۔ ہمیں دیکھو ہم کس طرح جل رہے ہیں۔''

''میرے پاس وہ بھی نہیں جس کے لئے جلوں۔''

اب کچھ دنوں سے دریا بی بی کا مزاج روکھا نہ رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس مفلس گھر میں بھی خوشحالی کا ذرا سا جھونکا آ گیا تھا۔ باتوں میں وقت گزر گیا۔ یہاں آ کے امیا کا تو جانے کو جی نہ چاہتا۔

شام ہونے کو تھی۔'' گھر چلنا چاہئے۔'' مگر امیا کے کان پر ماں کے بلائے سے جون نہ رینگی۔

''تم جاؤ، ماں۔''

''اچھا تم یہاں دریا کی بہو بن کر رہو۔''

دریا بی بی نے بھی ایسے ہی ہوائی قلعے بنائے تھے۔ مناظر بس اب سولہ سال کا ہو جائے گا پھر.....''

''ٹھیک ہے اسے یہیں چھوڑ جاؤ۔'' دریا بی بی ہنس پڑی۔

''اچھا ہے مجھے تھوڑا سکھ ملے گا۔ پہلے تو تم اسے کھلاؤ پہناؤ، پھر کہیں یہ بڑی ہو گی۔''

ہاشو نے ساری بات کو بڑی سنجیدگی سے لیا۔'' مجھے دے دو۔ میں اسے کھلاؤں گی۔ پہناؤں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ تم لے جاؤ۔''

''آؤ، امیا'' ہاشو نے پکارا'' آ جاؤ۔ میری پیاری۔''

اسی وقت شاکر کی ماں کی اونچی آواز ذرا دور سے سنائی دی۔ ہاشو چل دی۔

امجد اپنی چچیوں کو پہنچانے گیا۔ اس نے اپنی ماں کی ایک نہ سنی اسے اب بھوت پریت سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ چندر کا کا کے گیتوں کی لہریں اس کا ڈر بہا کر لے گئی تھیں۔

MashalBooks.org

ماں بیٹی جنگل میں پگڈنڈی پر سنبھل کر چلتی گئیں۔ کچھ دور چل کر امجد ٹھٹک گیا کر کھڑا ہو گیا۔ بید کی جھاڑیوں میں شام کے جھٹپٹے میں، ہوا سرگوشیاں کرتی رہی۔ ایک شام کو وہ یہاں منی بھائی کے ساتھ آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ منی بھائی سے واقعی محبت کرتا تھا۔

MashalBooks.org

ستائیسواں باب

چندر کو تل مصروف تھا۔

فصل اس سال اچھی ہوئی تھی۔ سوانگ منڈلی کی مانگ بڑھ گئی تھی۔ چندر کو کئی جگہ بلایا جاتا۔ راجندر نے منڈلی کو ملبوسات لا کر دیئے تھے جس سے اس کی دلفریبی بڑھ گئی تھی۔ اب انہیں بہت سے گاؤں میں تماشہ کرنے کو بلایا جاتا۔

اظہر کو حصہ دار نہ ملا۔ چندر نے اس سے کچھ دن ٹھہرنے کو کہا۔ لیکن اظہر مایوس ہو گیا۔ جب تک پیسے ہی نہ بچیں شاید۔ اس نے خود ہی کچھ کرنے کا ارادہ کر لیا۔

یعقوب نے جو ہاٹ کے دن آیا کرتا تھا اس سے پھر بات چھیڑی۔ وہ ایسے ہی ہاتھ ہلاتا نہیں چلا آیا۔ اس کے ساتھ سودا سلف بھی آیا۔ مرغی، گھی، یہاں تک کہ بہت عمدہ چاول تک۔ اظہر کو یہ بات نہیں بھائی۔ اس سے اس کی عزت نفس کو ٹھیس لگتی تھی۔ یعقوب کے ساتھ۔ شراکت کا خیال ہی اچھا نہ لگا۔

دریابی بی نے یعقوب کے طور طریقے مان لئے تھے۔ اس کی عزت نفس اتنی آسانی سے خطرے میں نہ پڑتی تھی۔ یعقوب آخر رشتہ دار تھا۔ اس کی لائی ہوئی چیزوں کے معاملے میں اتنی نازک مزاجی سے کام نہیں چلے گا۔

اظہر چپ رہا۔ دریابی بی بڑی مستعد میزبان لگ رہی تھی۔ ایک مدت کے بعد اس گھر میں پلاؤ کی مہک اٹھی۔ یعقوب نے تو لچیوں کی بھی فرمائش کی تھی۔ مگر دریابی بی نے کہا کہ لچیاں ناشتے پر کھا لینا۔ یعقوب چاچا کے نام سے ہی بچے کھل اٹھتے۔ ننھی نعیمہ کی تو رال ہی ٹپکنے لگتی۔

یعقوب پابندی سے امجد کے اسکول کی فیس دیتا چلا آ رہا تھا۔

دو چار سال پہلے دریابی بی عاشق جان کی چھوٹی موٹی خیرات لینے پر ٹوکتی تھی اب

وہ خیال خواب ہو گیا تھا۔ دریا بی بی جانتی تھی کہ اس کا میاں کیا سوچتا ہے۔ لیکن اس سے اس کی شکایتیں ختم نہیں ہوتی تھیں۔ رشتہ داروں کے ساتھ ایسے سخت اصول برت کر کچھ حاصل وصول نہیں ہوتا۔

اظہر نے اپنا شام کا کھانا دال اور آلو کے سالن کے ساتھ کھایا۔ یعقوب بڑی اچھی مچھلی بھی لایا تھا۔ اس نے چھوئی تک نہیں۔

دریا بی بی نے پوچھا ''کچھ ماس نہیں لوگے کیا؟''

''نہیں، میرا پیٹ کچھ گڑ بڑ ہے۔''

اظہر اصل وجہ چھپا گیا۔ یعقوب سے جو پیسے اس نے لئے تھے اس کے کلیجے میں کانٹا بن کر کھٹک رہے تھے۔ یہ بھی ممکن نہ تھا کہ وہ انہیں واپس کر دیتا۔ یوں تو اس کے سارے خواب چکنا چور ہو جاتے۔ اگر وہ ایسا مجبور نہ ہوتا تو یعقوب کے منہ پر کہتا کہ اپنی دادو رسی بند کرو۔

دریا بی بی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ بات سب سے زیادہ کسے دکھتی تھی۔

''ہر مہینہ اموکی فیس، دینا بہت مشکل ہے۔ اگر اگلے سال بھی فصل اچھی نہ ہوئی تو اللہ تعالیٰ جانے کیا ہو۔''

اظہر نے کوئی جواب نہ دیا۔

''اب تمہیں پھر کاروبار کی سوجھی ہے۔ پہلے پیسہ برباد کر کے دیکھ لیا؟''

''اللہ چاہے تو دیر نہیں لگتی۔''

''اللہ تعالیٰ کی مرضی کی رٹ لگاتے تم نے دس سال لگائے۔'' دریا بی بی خفا ہو کر بولی۔ ''وہ تو تمہاری مرضی ہے جس کا ہم انتظار کر رہے ہیں۔''

اظہر کچھ جواب دینے کو تھا لیکن چپ رہنے میں خیر جانی۔

''یعقوب بھائی کے ساتھ کاروبار کیوں نہیں کر لیتے؟ دیکھیں پھر اللہ تعالیٰ کی مرضی کیا رنگ بدلتی ہے۔''

''بات نہیں بنے گی۔''

''نہیں، کیوں بننے لگی!''

MashalBooks.org

دریا بی بی کو تاؤ آ گیا تھا۔ اس نے اظہر کی حماقت کے سینکڑوں بکھان کئے۔ مگر اس کا مخالف چپ رہا۔ وہ تو سو گیا تھا۔

بڑا پر تکلف ناشتہ کرتے ہوئے یعقوب نے دریا بی بی کو اپنے منافع کا حساب بتایا۔ تین ہزار اس نے پٹ سن میں کمائے۔ دو ہزار گودام کے کاروبار میں اور اسی طرح اور بھی۔

اظہر اس وقت آس پاس نہ تھا۔ وہ کھیت پر جا چکا تھا۔

یعقوب بولا ''ہمارے بھائی بھی مزے کی چیز ہیں۔ اگر میرے ساتھ کاروبار میں مل جاتے تو اللہ تعالیٰ ان پر کرم کی نظر کرتا۔''

''وہ تو دیوانے ہیں۔ انہیں کون بدل سکتا ہے؟''

''میں تو لاکھ کما لیتا اگر میرے پاس تمہارے جیسی سمجھ ہوتی۔''

دریا بی بی اپنی تعریف سے خوش ہوئی۔ وہ اپنے دیور کے لئے پان بنا رہی تھی۔ پٹاری میں چھالیہ نہ رہی تھی۔ وہ چھینکے پر سے لینے کو اٹھی اور مڑ کر دیکھا تو یعقوب اس کی کمر کو گھور رہا تھا۔ گو یہ بات اس طرح واضح تو نہ تھی مگر اس کی نظر شائستہ نہ تھی۔

دریا بی بی پان کے کٹورے تک گھبرائی ہوئی پلٹی۔ اس نے یعقوب کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر نہ دیکھا۔ شاید یہ نظر کا دھوکا تھا یا وہ دوسروں کو اسی طرح دیکھا کرتا تھا۔ اکیلے میں بھی اس کا دل پریشان رہا۔ شاید وہ آدمی اتنا برا نہ تھا صرف بے تمیز تھا۔ ان عیاش کاروباری لوگوں کے اعمال سے ناواقف، دریا بی بی اپنی الجھی سوچوں سے حل تلاش کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ اظہر جو اس آدمی کو بہتر طور پر سمجھتا تھا۔ اس سے دور ہی رہا۔

اسی صبح یعقوب چلا گیا۔ اس کا بستر ٹھیک کرتے ہوئے تکیہ کے نیچے سے دریا بی بی کو دس روپیہ کا ایک نوٹ ملا۔ وہ ذرا دیر کو ٹھٹک گئی اور ان جانے میں نوٹ ہاتھ میں لئے مسلتی رہی۔ جب اسے ہوش آیا کہ وہ کیا کر رہی ہے تو اس نے ساڑھی کے پلو میں نوٹ باندھ لیا۔ کچھ دیر کھیت میں کام کر کے اظہر چندر سے ملنے چلا گیا۔ جو اپنے سوانگ کا بہروپ بھر رہا تھا۔ انہیں تماشے کا بلاوا ملا تھا۔

چندر نے اظہر سے بیٹھنے کو کہا اور حقہ تیار کرنے لگا۔ اس سے پہلے شیبو کی بیوی آئی

تھی۔ چار سال کا ایک لڑکا ماں سے چمٹا، انگوٹھا چوس رہا تھا۔ ایک ننھی بچی اس کی گود میں تھی۔ جیسے ہی اظہر کی نظر اس پر پڑی، شیبو کی بیوی نے گھونگھٹ کاڑھ لیا۔

''کیسی ہو؟'' اظہر نے پوچھا۔

''بھگوان نے اسے مار ڈالا۔ اب میں کیسی ہوں گی۔ چاچا؟''

وہ شیبو کی طرح اسے چاچا کہتی تھی۔

چندر حقہ تھامے آن کر اظہر کے پاس بیٹھ گیا۔

''دیکھا تم نے خان۔ ہمارے دھرم کیا کر ڈالتے ہیں۔''

''ہاں، میں نے دیکھا''

''تم نے دیکھا، خاک۔ دھرم! اگر حاتم بخش مسلمان ہے اور روہنی چودھری ہندو تو پھر اچھوت کون ہے؟ وہ پیسے کی خاطر دھرم والے ہیں۔ اور دو غریب اپنی جان سے گئے۔'' شیبو کی بیوی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم گئی تھیں روہنی چودھری سے ملنے؟''

''گئی تھی۔ پانچ روپے دیئے انہوں نے۔'' شیبو کی بیوی بڑے دکھی لہجے میں بولی۔

''لو یہ سنو، خان! پانچ روپے۔ دھار ماروان پر۔ ایک جان کی قیمت پانچ روپیہ۔ اظہر بھائی۔ جب تک ہم زندہ ہیں۔ میں دھرم کی کوئی بات نہ مانوں گا۔ میں تو خود روہنی کے جال میں پھنس گیا تھا۔ سالا روہنی!''

''بے کار میں بدزبانی کیوں کرتے ہو؟''

''بدزبانی مت کہو۔ تم امداد کرو گے شیبو کی بیوی کی۔ اور اگر تم اس کا بھی وعدہ کر لو تو کیا اس کا شوہر واپس لے آؤ گے؟ اور مجھ سے کہتے ہو میں بے تمیزی کرتا ہوں۔''

آنکھیں سرخ کئے چندر کش پہ کش لگائے گیا۔

''بدزبانی مت کرو'' یہ فرماتے ہیں جناب! اسماعیل کی بیوی بچے لے کر میکے چلی گئی۔ وہ بھی غریب ہیں۔ شیبو کی بیوی کا کوئی نہیں وہ کہاں جائے۔ اس کے پاس تو سر پر چھپر ڈالنے کو دو گٹھے بھوسہ تک نہیں۔ میں اس سے کہتا رہتا ہوں۔ یہاں آجائے۔ میں ایک جھونپڑی او رڈال لوں گا۔ گاؤں کے لڑکے، بشیر پاور، گنیش بے اجرت کام کرنے کو تیار

ہیں۔'' اظہر بولا۔ ''جب ضرورت ہو مجھے بھی بلا لینا۔''

''ضرور، میں بلاؤں گا تمہیں۔ حاتم بخش مسلمان ہے مگر اس کی ساری برادری شراب پیتی ہے۔ اور تم وہی کچھ کرتے ہو جو وہ تم سے کرنے کو کہتا ہے۔ نہیں کرتے کیا؟''

''تم بھی تو روہنی کے اشاروں پر ناچتے تھے۔''

''بالکل ٹھیک'' چندر نے شرمندگی سے جواب دیا۔ ''مگر اب اور نہیں۔ خاک میں ملاؤ ان کے دھرم کو اور اظہر بھائی مجھے تمہارے یہ بودے طور طریقے اچھے نہیں لگتے۔ جب ان سے بات کرو تو آواز اونچی کر کے اور سینہ ٹھونک کے بات کرو۔''

''پیسے والے ہیں وہ۔ پولیس اور دوسرے.....''

چندر نے بات کاٹی۔ ''کوئی قانون نہیں ہے کیا؟ ہم کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ گاؤں میں ہزاروں غریب ہیں۔ اگر پولیس قانون کا خیال نہیں کرتی اور یہ سوچتی ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتی ہے۔ تو پھر ہماری بھی لاٹھیاں ہیں، کیا نہیں ہیں؟''

چندر کے بڑے بڑے دیدے گول گول گھوم گئے۔ اپنی بات اچانک ختم کر کے بولا اسے بھی معلوم نہ تھا کہ اگلے وقت کے کھانے کا کیا ہوگا۔ صرف چوڑی سڑک ہی امید بندھاتی تھی۔ وہ پھر نکل کھڑا ہو۔ پیسہ کی خاطر اس نے اتنی ذلت اٹھائی تھی۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ کیا اس کے نصیب کبھی نہیں بدلیں گے؟

اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہے تو کتنی دیر اور لگے گی؟

MashalBooks.org

اٹھائیسواں باب

دریابی بی گھر کا کام کاج جلدی نبٹا کے ننھی شری کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔
سورج ابھی ڈوبا ہی تھا۔ دریابی بی کو جماہیاں آرہی تھیں۔ امجد اپنے کمرے میں زور زور سے پڑھ رہا تھا۔ اظہر برآمدے میں اپنے حقہ میں مگن بیٹھا تھا۔ گڑگڑ کی آواز متواتر آرہی تھی۔ ''منی کی ماں'' اظہر نے پکارا۔ اس نے دریابی بی کا نام اس دن سے بدل رہا تھا جس دن سے اس گھر میں مناظر آیا تھا۔ کبھی کبھار ہی وہ اسے ''اموکی ماں'' کہہ کر پکارتا۔

''کیا ہے؟''

''میں دوسرے گاؤں گیا تھا''

''کیوں؟''

''دھان کے بیج خریدنے''

مجھے بتانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''نہیں، بس.....''

اظہر چپ ہو گیا۔ لیکن اس کی آواز سے ایسا لگتا تھا جیسے ابھی بات باقی ہو۔

''منی اس گاؤں میں نہیں ہے؟'' وہ بولا۔

دریابی بی نے کان کھڑے کئے۔

''وہاں نہیں ہے؟''

دریابی بی دالان کے سرے پر بیٹھی تھی۔ وہ میاں کے پاس کو سرک گئی۔

''کون نہیں ہے وہاں؟''

اسے لگا اس نے غلط سنا ہے۔

''کون نہیں ہے وہاں؟'' اس نے اپنی بات دہرائی۔

''منی''

MashalBooks.org

''منی نہیں ہے اس گاؤں میں؟''

''نہیں''

''کب سے؟''

''وہ وہاں گیا ہی نہیں۔''

امجد کو بلایا گیا۔ وہ کتابیں چھوڑ کر آیا۔

''اموتم نے نہیں کہا تھا کہ تمہارے منی بھائی اپنے چچاؤں کے گھر ہیں؟''

''میں ان کے گھر نہیں گیا تھا۔ میں نے صرف سنا تھا.....''

''سنا تھا تم نے۔'' طیش میں آکر دریابی بی نے قہر آلود نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔

امجد رو پڑا۔ اظہر کا پچھتاوا بھی کچھ کم نہ تھا۔ وہ خود کو بار بار کوستا رہا۔

''میرا ذلیل غصہ اس دن بھڑک اٹھا۔ اللہ تعالیٰ کرے میرے اس ہاتھ کو کوڑھ ہو جائے۔''

دریابی بی ایک حرف نہ بولی۔ اس بات کا گمان تھا کہ جو کچھ بھی کہا گیا وہ اس نے سنا بھی یا نہیں۔ دالان میں اچانک سناٹا چھا گیا۔

امجد اپنے کمرے کو کھسک گیا۔ اس نے پڑھنا بند کر دیا۔ اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اظہر گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھا رہا، اس کو یہ بھی پتہ نہ چلا کہ دریابی بی شری کو لے کر کس وقت وہاں سے اٹھ گئی۔ وہ اسی طرح سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو ہر چیز نامانوس سی لگتی تھی۔ دالان میں کوئی لیمپ نہ تھا۔ آنگن میں گھرا اندھیرا تھا۔ سینکڑوں ٹڈیاں چک چک کئے جا رہی تھیں۔ ان کی چک چک اظہر کے دماغ میں گونج رہی تھی۔ بڑی احتیاط سے اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہر چیز خاموش تھی۔ امجد کا کمرہ بھی نہیں کھلا تھا۔ وہ کھانا کھائے بغیر ہی سونے لیٹ گئے تھے۔ دالان میں چٹائی بچھا کر اظہر لیٹ گیا۔

سویرے تڑکے ہی وہ کھیت کو چلا گیا۔

دریابی بی کی التجا پر امیرن نے منی کے متعلق پوچھ گچھ کرنے کی حامی بھر لی۔ دوپہر ڈھلے وہ اداس پلٹی۔ یہ بات سچ تھی منی اپنے چچاؤں کے گھر واپس نہیں گیا۔ دریابی بی کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ ہاشو اس سے ملنے آئی اور اس کے آنسو بھی روکے نہ رکے۔

MashalBooks.org

''اگر وہ میرے پاس نہ آتا تو مجھے پرواہ نہ ہوتی۔لیکن وہ میرے پاس آیا اور میں نے اسے بھگا دیا۔''

دریابی بی ہچکیاں لیتی رہی۔

امیرن نے کہا''میں نجومی کے پاس جاؤں گی۔ وہ بتا دے گا کہ وہ کہاں گیا ہے اور کب واپس آئے گا.....''

امیرن نے کھوئے ہوئے آدمی کی کہانی انہیں سنائی جو پلٹ آیا تھا۔

دریابی بی کو یقین نہ آیا پھر بھی بولی۔''پانچ پیسہ دوں گی۔''

''وہ پانچ پیسہ اور چھالیہ لیتا ہے۔''امیرن نے اسے بتایا۔

''لو،ابھی لے جاؤ۔''

امیرن اور نہ ٹھہر سکتی تھی۔ امیا گھر پر اکیلی تھی۔اندھیرا ہو گیا تھا۔اسے جنگل سے ہو کر جانا تھا۔امیرن اور ہاشو نے اجازت چاہی۔

اظہر کھیت سے واپس آچکا تھا۔ یہ صرف امجد کو ہی پتہ تھا۔اس نے باپ کو ایک نظر دیکھا اور اپنے کمرے میں تیل کے لیمپ کی روشنی میں پڑھنے چلا گیا۔مگر اس کا دل کام میں نہیں لگ رہا تھا۔

جب مہمان چلے گئے تو دریابی بی امجد کے کمرے میں گئی۔

''امو''

''ماں''

''کل صبح تم گاؤں چلے جاؤ گے؟اور پھر منڈی کے قصبہ بھی۔''

''ٹھیک ہے ماں۔ مجھے بھی منی بھائی کا رنج ہے۔''امجد کی آنکھیں بھر آئیں۔

''تمہارا ابا کھیت سے نہیں پلٹے کیا؟''

''آ گئے ہیں، میں نے دیکھا تھا۔''

لیمپ ہاتھ میں لئے دریابی بی کمرے میں گئی۔ بانس کی کھونٹی پر اظہر کی لنگی اور جبہ نہیں تھا۔ اس کے راج مستری والے اوزار کمرے کے طاق میں جہاں رکھے ہوتے تھے، اب وہ جگہ خالی تھی۔ دریابی بی نے غور سے ادھر ادھر دیکھا اور فوراً سمجھ گئی کہ کیا ہو گیا ہے۔

MashalBooks.org

انتیسواں باب

''تمہارا باپ پھر بڑی مچھلیوں کے شکار پر نکل گیا۔ کوئی سمجھے خانوں کے لئے دال ترکاری کافی ہوگی۔''

جب چندر نے مذاق میں یہ بات کی تو اسے اندازہ نہ تھا کہ دریابی بی ڈیوڑھی سے لگی کھڑی ہے جیسے ہی اسے احساس ہوا اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

دریابی بی نے اسے بلا بھیجا تھا۔ امجد کو اچھی طرح پتہ تھا کہ مشکل کے وقت میں اسے ہمیشہ سب سے پہلے چندر کا کا کا خیال آتا تھا۔

''بالکل ٹھیک'' دریابی بی بولی۔

اپنی ہنسی دباتے ہوئے چندر نے کہا۔''ٹھیک بات ہے۔ میں نے اس جیسا کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔ ہر تھوڑے دن بعد اسے خبط سوار ہو جاتا ہے، دو ہفتہ گزر گئے ہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ خیر خبر ہی بھیجے۔ مگر وہ ایسا کہاں کرے گا۔''

امجد بولا''آپ کو خبر تو ہے کا کا، ہم ابا کو ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ اسی لئے تو وہ چھوڑ چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔''

چندر نے زور سے تردید کی''نہیں، یہ بات نہیں بیٹا۔ وہ ہے ہی خبطیوں جیسا۔ جب دنیا اسے دکھ پہنچاتی ہے تو وہ اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ سوچتا ہے مصیبتیں اس طرح ٹل جائیں گی۔ مگر تکلیفیں ایسی آسانی سے کہاں جاتی ہیں؟ یہ انگریزی راج ہے۔ ذرا انگریز کو جانے دو ان حاتم بخش، روہنی حرامزادوں کو جا لینے دو، ہماری تکلیفیں بھی جب ہی جائیں گی۔''

یہ سب کچھ امجد کی سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن وہ چندر کی بات ماننے کو تیار نہ تھا۔ اسے اپنے باپ سے شکایت تھی۔

''معاملہ یہ ہے'' چندر بولا''تمہارا باپ ایک.....''

''چھپا شیطان ہے''۔ دریابی بی نے چندر کی جملہ پورا کیا۔

MashalBooks.org

چندر جی کھول کر ہنسا جیسے وہ پھر سے وہی پرانا چندر ہو۔

''بالکل ٹھیک کہتی ہو، دریا بی بی۔ میرے جی میں جو کچھ ہوتا ہے اگل دیتا ہوں۔ مگر خان بھائی۔ وہ تو ضرورت سے زیادہ ایک حرف بھی نہیں بولتا۔ اگر کسی کو ہزار روپے میں ایک چپ شیطان چاہیے، تو میں تمہارے باپ کو بیچ ڈالوں گا۔ امو۔''

چندر ہنسا امجد کی ہنسی بھی اس کے ساتھ شامل ہوگئی۔

دریا بی بی نے امجد کو ڈانٹ کر پکارا ''امو، اپنے کاکا سے زمین کے بارے میں پوچھو۔''

ان دونوں کی ہنسی رک گئی۔ امجد کی بجائے چندر نے جواب دیا۔

''اس کی فکر مت کرو۔ میں خود دھان لگاؤں گا۔ اس سال بھوسہ اچھے داموں بک رہا ہے۔ لوگ اپنے گھروں میں چھپر چھا رہے ہیں۔ میرے خیال میں کچھ تو ہم خود رکھ لیں گے اور باقی بیچ دیں گے۔''

''کم از کم ایک کہان تو رکھ لینا۔''

چندر بولا ''دھان کے علاوہ، ایک بیگھے میں کچھ تربوز اور پیٹھا لگا دوں گا۔ یہ منڈی کے کچھ بلاوے ہیں۔ اور امجد بھی تو ہے۔ دیکھتے ہیں ہم دونوں کیا کر سکتے ہیں۔''

امجد سے مخاطب ہو کر دریا بی بی نے کہا ''امو، کاکا کے لئے پان اور حقہ لاؤ۔''

چندر نے انکار کیا۔ ''نہیں، آج نہیں۔ مجھے اب راہ لینا چاہئے۔ دریا بی بی۔ کھیت میں کرنے کو بہت کام ہے۔''

چندر چلنے کو ہوا اور امجد اس کے ساتھ ہولیا۔ اگر وہ چندر کاکا کے ساتھ موہیش ڈنگا کے جنگلوں نہروں تالابوں میں گھوم سکے تو اسے اور کیا چاہئے۔ ڈھیر سارے ہنسی ہنسوڑ کے گیت، لطیفے اور پیار چندر کاکا کے پاس دینے کو کیا کیا تھا۔

چندر کی یقین دہانی سے دریا بی بی کو حوصلہ تو ہوا مگر اس کی بے چینی کم نہ ہوئی۔ پہلے بھی بہت دفعہ ایسا ہو چکا تھا۔ وہ کم بخت ہمیشہ پلٹ آتا تھا۔ اگر اس دفعہ نہ پلٹا تو کیا ہوگا؟ ابھی تک تو دریا بی بی اپنے قد کاٹھ کے زور پر سب کچھ جھیل جاتی تھی۔ اس کی صحت تو ٹھیک تھی، مگر اس کا دل کمزور اور اکیلا ہو گیا تھا۔

MashalBooks.org

سوچوں میں گم، دریا بی بی بکریوں کو کٹھل کے پتے کھلا رہی تھی۔ دالان میں شری آرام سے سو رہی تھی۔ اچھے مزاج کی بچی تھی۔ بھوک لگتی تو روتی، پیٹ بھر جاتا تو سو جاتی۔ دریا بی بی کو اس طرح گھر کا کام کاج یک سوئی سے کرنے کو مل جاتا۔ بکریاں اسے بہت پیاری تھیں، ہر سال بیاہتیں اور بچے مل جاتے۔ لوگ بقرعید اور تہواروں پر بکریاں مول لے لیتے۔ ان موقوں پر انہیں بیچنے کا فائدہ ہوتا، اچھے پیشے مل جاتے جو کڑے، وقتوں میں کام آتے۔

دریا بی بی بکریوں کو چارہ کھلانے میں اس طرح مصروف تھی کہ اسے آنگن میں امیرن کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ بکریوں کو کھلانا تو روز کا معمول تھا۔ وہ بکریوں کو دیکھ نہیں رہی تھی۔ اپنے خیال میں گم ٹہنیاں اور پتے ان کی طرف بڑھائے جاتی۔

امیرن نے دریا بی بی کا اداس چہرہ دیکھا اور اسے رسان سے پکارا۔

خوش دلی سے مسکرا کر دریا بی بی نے کہا ''تم کب آئیں؟''

''تم نے دیکھا نہیں مجھے۔ گھر والی بی بیاں اسی طرح گم سم ہو جاتی ہیں جب ان کے شوہر انہیں چھوڑ کر چلے جائیں۔'' امیرن نے ہنس کر کہا۔

بکریوں کو پرے ہنگا کر دریا بی بی نے امیرن کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور بولی ''چلو بوبو، اندر چلو، کیسا شوہر؟ کہاں کا شوہر؟ میں اس کی فکر کروں گی؟''

امیرن نے دلجوئی سے کہا ''کیسا آدمی ہے۔''

''چلو چل کے پان کھاؤ، آؤ بیٹھ کر بات کریں۔''

''دریا کنارے رہنے والوں کے دکھ کبھی ختم نہیں ہوتے۔''

دونوں عورتیں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ گاؤں کی، پڑوسیوں کی، شاکر کہاں گیا ہے لڑائی کرنے کو۔ ہاشو کی ساس اس کو کس طرح تنگ کرتی ہے۔ او رایسی ہی ہزار باتیں۔

امیرن ایک مصروف عورت تھی۔ اپنی گایوں، بچھڑوں بطخوں اور مرغیوں کی راجدھانی کی ملکہ۔ اس کے پاس گپ لگانے کو وقت نہ ہوتا تھا۔ وہ تو ایک بات بتانے آئی تھی۔ اور اس موقع کے انتظار میں تھی کہ دریا بی بی سے کہہ سکے۔ ایک دم ہی بولی۔

MashalBooks.org

''دریا بوبو، میرے پاس ایک خبر ہے۔''

چوکنا ہو کر دریا بی بی نے بڑے غور اور آمادگی سے امیرن کو دیکھا۔

''منی کی خبر ہے میرے پاس''

دریا بی بی بغیر زیادہ جوش کا اظہار کئے، اس طرح بولی، جیسے کوئی او رخبر ہوتی تو اسے زیادہ خوشی ہوتی۔ ''کیسی خبر؟''

''منی اپنے پرانے گھر سے دس میل دور اسکول جاتا ہے۔ اپنے چچاؤں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔''

امیرن نے جلدی جلدی بتلایا۔

''جہاں رہے خیرت سے رہے۔'' دریا بی بی نے کہا۔ ''وہ میرا بیٹا کب ہے؟ ہے کیا؟ میرا اس پر کیا حق ہے؟''

''کون کہتا ہے وہ تمہارا بیٹا نہیں؟'' امیرن نے تردید کی۔ ''تم دیکھ لینا پلٹ کے تمہارے ہی پاس آئے گا وہ۔''

''کچھ فرق نہیں پڑتا۔ جہاں بھی ہے وہیں رہے۔ تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

''میرا تھیالی رشتہ دار اس گاؤں کے ساتھ والے گاؤں میں رہتا ہے جہاں اب منی ہے۔'' میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ لڑکے کا پتہ لگائے۔

''تم بہت اچھی ہو۔''

امیرن اپنی ذمہ داریاں نبھانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔ ابیا گھر میں اکیلی تھی۔ اور اس کا دیور جائیداد ہتھیانے کی سازشیں کرتا رہتا تھا۔ وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ امیرن کو حیرت تو یہ تھی کہ دریا بی بی نے آج بیٹے کی بات خود نہ اٹھائی تھی۔ اور دنوں میں تو گھنٹوں اس کے بارے میں بات چیت کرتے نہ تھکتی۔

دریا بی بی امیرن کے ساتھ ڈیوڑھی تک گئی اور پھر آنے کو کہا۔ جیسے ہی وہ مڑی لگتا تھا اس کے پیر من من بھر کے ہو گئے ہوں۔ آہستہ آہستہ چل کے وہ دالان میں سوئی شری تک پہنچی اور سوتی بچی کے چہرے کو تکنے لگی۔ صرف دریا بی بی ہی جانتی تھی کہ وہ اس گھڑی کیا سوچ رہی ہے۔

MashalBooks.org

تیسواں باب

منڈی جاتے ہوئے خیر خبر کو یعقوب آ گیا۔ خالی ہاتھ نہیں آیا۔ بچوں کے لیے مٹھائی کے علاوہ وہ اتنا اور کچھ لے کر آیا جو کسی بھی گھرانے کو تین چار دن خوشی اور آسودہ کر دیتا۔ پہلے پہلے دریا بی بی اعتراض کیا کرتی۔ اوراب وہ اپنے ہاتھوں سے بغیر کسی جوش اورولولے کے لفافے اور پڑیاں کھولا کرتی۔

آج وہ جھینگا مچھلی کے ساتھ بڑی سی اور مچھلی لے کر آیا تھا۔ جب کبھی اظہر مچھلی پکڑنے جاتا تب ہی اچھی بڑھیا مچھلی پکا کرتی۔

''دریا بی، مجھے مٹر کہیں نہیں ملے۔ مجھے جھینگوں کے ساتھ مٹر بہت اچھے لگتے ہیں۔''

بچوں نے یعقوب کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ نعیمہ جو اکثر پوچھا کرتی،''چچا کب آئیں گے ماں؟''اس سے الگ ہی نہ ہوتی تھی۔ امجد اس سے جڑ کر بیٹھا۔ شرمیلا تھا، بات تو کم تا مگر گھنٹوں یعقوب کے ساتھ لگا رہتا۔

تکلیف بر طرف، یوں تو یعقوب مہمان ہوتا، مگر اپنی دل پسند چیزوں کی فرمائش کرتا۔ سودا سلف تو خود ہی لے کر آتا تھا۔

سہ پہر کو دریا بی بی لچیاں تل رہی تھی۔ بچے کہیں ادھر ادھر تھے۔ نعیمہ بھولپن میں لچیوں کے شوق میں چلی آئی تو ماں نے ڈانٹ کر باہر نکال دیا۔ امجد کو بھی ڈانٹ پڑی۔ اتنے بڑے لڑکے ہو تم، اسکول جاؤ اپنے، کیوں اتنے بدنیت ہو تم؟ کبھی لچی نہیں دیکھی تم نے؟ کوئی پیٹو ہوتا تو یہ سب سن کے مارے شرم کے دوڑ جاتا۔

گرم تیل میں لچیوں تلے جانے کی سن سن آواز آ رہی تھی۔ دریا بی بی اپنے خیالوں میں گم کام میں لگی تھی۔ اس کا گول چہرہ چولھے کی گرمی سے پسینے سے تر بتر تھا۔

''دریا بی بی کھانا پکانے میں اب اور کتنی دیر ہے؟''یعقوب باورچی خانے میں

داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''بینگن تو پکا لئے میں نے۔ اب لچیاں تل رہی ہوں۔'' یعقوب کی طرف آنکھ اٹھائے بغیر دریابی بی نے چولھے میں لکڑی لگاتے ہوئے جواب دیا۔

''آؤ، پھر گرم گرم لچیاں کھالیں۔''

''ٹھیک ہے، مگر تم بیٹھو گے کہاں؟''

''ابھی بتاتا ہوں۔'' یعقوب نے کہا اور اکڑوں بیٹھ گیا۔

''کپڑے خراب ہو جائیں گے تمہارے۔ دریا بی بی بولی۔ یعقوب ریشمی لنگی اور سفید قمیض پہنے تھا۔ وہ مذاق نہیں کر رہی تھی۔

''بچہ نہیں ہوں میں'' یعقوب اس طرح زور سے ہنسا جیسے اس نے کوئی بڑا مذاق کیا ہو۔

''ٹھیک ہے، بیٹھو، میں رکابیاں اتارتی ہوں۔''

دریابی بی نے مچان سے کچھ برتن اتارے اور یعقوب کے سامنے بینگن اور لچیاں رکھ دیں۔

''بچوں کو بلاؤ۔''

''وہ کھا چکے'' ترنت اور مختصر سا جواب۔ یعقوب اسے لچیاں بیلتے دیکھتا رہا۔ دریابی بی کی نظر کڑاہی پر تھی جس میں تیل اونٹ رہا تھا۔

''واقعی کھالیا انہوں نے؟''

''ہاں'' اس کا لہجہ تیکھا تھا۔ اس نے گرم لچیاں اچھی طرح نچوڑیں اور یعقوب کی رکابی میں رکھ دیں۔ وہ آہستہ آہستہ کھانے لگا۔

''تھوڑا سا پانی، دریا بھابی''

دریابی بی نے فوراً تعمیل کی۔ بات چیت کچھ زیادہ دیر نہ چلی۔ یعقوب، اصل میں دریابی بی سے خوف کھاتا تھا۔ آنکھ بھر کے دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔ اس کا سنجیدہ چہرہ ایک طرح کی تنبیہ تھا۔ اس کے سامنے یعقوب کچھ پریشان رہتا۔ مگر اس کی دو بیویاں تھیں۔ اور ایک طرح کا اعتماد اس کے اندر چھپا ہوا تھا۔ مگر دریابی بی کے سامنے ہر چیز پر پانی پھر جاتا۔

MashalBooks.org

دریا بی بی تو اتنی پرسکون تھی اور یعقوب پھر بھی گھبرایا ہوا تھا۔

''جب بھی تمہارے گھر آتا ہوں'' وہ ایسے بولا جیسے خود سے باتیں کر رہا ہو، ''تو مجھے اس طرح کا سکون ملتا ہے جو کہیں اور نہیں ملتا۔''

''کیوں؟'' ایک مختصر سا سوال۔

''کیوں؟ اور کون میرا اتنا خیال کرتا ہے۔''

''خیال؟'' دریا بی بی زور سے ہنس پڑی۔

یعقوب نے کان کھڑے کئے۔ کیا اس کی ہنسی زہر خند تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ آیا نہیں۔ اسے مزید موقع دئے بغیر دریا بی بی نے کہا۔ ''کہاں اچھی خاطرداری ہوتی ہے تمہاری؟'' ''تم چیزیں لے آتے ہو اور میں ہوٹل کے خانساماں کی طرح پکا دیتی ہوں۔''

اس کی آواز میں ایک کاروباری پن تھا۔ یعقوب اس بات سے بدمزہ ہوا۔ اس خلیج کو پاٹنے کی خاطر بولا ''نہیں، دریا بھابی، یہ سب نصیب کی بات ہے۔ مجھے ایسا سکون اور کہیں نہیں ملتا۔''

''اللہ تعالیٰ کے فضل سے دو دو بیویاں ہیں تمہاری۔''

''بیویاں'' یعقوب نے قہقہہ لگایا۔ اس کے منہ سے لچیوں کے خستہ ذرے ادھر ادھر ہر طرف بکھر گئے۔

''بیویاں؟'' بیویوں کو تم نے کہاں دیکھا، دریا بی بی۔''

''پھر وہ دونوں کیا ہیں؟''

''گوشت کے پہاڑ۔''

ہنستے ہوئے دریا بی بی نے یعقوب کی طرف دیکھا۔ آنکھیں نیچے کرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے نہیں دیکھیں تمہاری بیویاں، لیکن اگر موٹاپا کسی کو گوشت کا پہاڑ بنا دیتا ہے۔ تو میں بھی گوشت کا تودہ ہوں۔''

نہیں دریا بھابی، تم تو خاندان کی لکشمی ہو۔''

دریا بی بی اپنی تعریف سے خوش ہو کر ہنستے ہوئے بولی ''یہ تو میرے لئے نئی بات ہے یعقوب بھائی۔'' اس بے تکلفی کو یعقوب ترستا تھا۔ ہنس کر بولا ''مجھے دو لچیاں اور کھلا دو اور

پھر بچوں کو بلاؤ۔

''وہ پھر کھالیں گے۔ پہلے تم کھالو۔'' دریا بی بی نے سادگی سے کہا۔

کھانا ختم کر کے یعقوب بولا۔''دریا بھابی، میں ذرا ٹہل آؤں۔تمہارے گاؤں میں جنگل زیادہ ہیں اس لئے بٹوہ ساتھ لے کے جانا کچھ مناسب نہیں۔تم رکھ لو اسے۔''

''کتنے پیسے ہیں اس میں۔''

''پانچ سو۔''

''یہ تو بھاری رقم ہے۔اگر کہیں کچھ چوری چکاری ہو جائے۔''

''چور تمہارے پاس پیسے چرانے نہیں آئے گا۔''اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر یعقوب نے کہا۔

''پھر کاہے کے لئے آئے گا۔''

''انہیں ڈر نہیں لگتا کیا؟ یعقوب نے بات بدلتے ہوئے کہا۔''حوصلہ ہے تمہارے پاس۔ اگر میرے گوشت کے پہاڑوں کو اس جیسی جگہ میں رہنا پڑ جائے تو مجھے دس محافظ نوکر رکھنا پڑیں۔''

دریا بی بی نے اپنا ہاتھ بڑھایا یعقوب نے فوراً ہٹوا اسے تھمایا اور شام کے جھٹ پٹے میں نکل گیا۔ بٹوے کو پلو میں باندھ دریا بی بی پھر اپنے کام میں لگ گئی۔

دوسرے دن یعقوب کو منڈی والے قصبے کے لئے کشتی پکڑنا تھی۔

''بٹوہ دے دو، دریا بھابی۔''یعقوب نے چلتے وقت کہا۔

بٹوہ واپس کرتے ہوئے دریا بی بی بولی۔''مجھے تم سے ایک درخواست کرنا ہے۔''

یعقوب کو خیال تھا شاید وہ ادھار مانگے گی۔

''حکم کرو۔''

''ذرا دھیان رکھنا۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔تمہارے خیال میں میں اپنا نہیں ہوں؟''

یعقوب نے دریا بی بی کی طرف دیکھا۔ وہ زمین پر آنکھیں جمائے تھی جیسے وہاں کچھ ڈھونڈھ ہی ہو۔

MashalBooks.org

''میں اپنی بات نہیں کر رہی تھی'' دریا بی بی نے آہستہ سے کہا۔

''پھر کس کا؟'' یعقوب نے مایوس ہو کر پوچھا۔

''اپنے چچا زاد کا''

''ارے اظہر بھائی؟'' وہ ایسے ہی موجی آدمی ہیں۔ دیکھ لینا کسی دن چلے آئیں گے۔''

یعقوب بے پروائی سے بولا۔''تم ان کے لئے کیوں اتنی فکر مند ہوتی ہو؟''

''تم مجھ سے یہ کہہ رہے ہو کہ میں اپنے شوہر کے لئے کیوں پریشان ہوتی ہوں؟'' دریا بی بی نے یعقوب کو بلا جھجک دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، نہیں، یہ بات نہیں۔ وہ تو سادھوؤں کی طرح ہیں۔ ان کی فکر کرنے سے فائدہ کیا ہے؟'' یعقوب نے آنکھیں جھکا کر قصور واروں کی طرح کہا۔

''آدمی فکر کرنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکتا۔ میں تم سے اس لئے کہہ رہی تھی کہ تم مرد لوگ شہروں قصبوں میں خرید و فروخت کرنے جاتے ہو۔''

''یقیناً میں تلاش کروں گا۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔''

''تمہاری مہربانی۔ اللہ تعالیٰ تم پر فضل کرے۔'' دریا بی بی نے بغیر کسی طنز کے کہا۔

''بس اب چلوں؟ یقین کرو میں تمہیں خیر خبر دیتا رہوں گا۔''

یعقوب اور زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔

MashalBooks.org

اکتیسواں باب

ایک دو گھروں کے علاوہ، دریا بی بی شاید ہی کہیں ملنے جاتی۔ اپنی فطری جھجک کے علاوہ وہ اظہر سے ڈرتی بھی تھی۔ وہ خاموش سا آدمی تھا مگر شرع کے خلاف کوئی بات برداشت نہ کرتا۔

اب شوہر کی غیر حاضری میں گھر بار چلانے کی خاطر اسے دور دور بھی جانا پڑتا۔

امیرن کا گھر گاؤں کے دوسرے سرے پر تھا۔ راستہ جھاڑیوں سے اٹا پڑا تھا اور عام طور پر سونا رہتا۔ دریا بی بی کو بھی اس رستے سے ڈر لگتا تھا، عام طور وہ امجد کو ساتھ لے کر آتی۔ نعیمہ ماں کے بغیر ایک پل نہ رہتی، وہ بھی ساتھ ہوتی۔ امجد کو البتہ یہ راستہ اچھا لگتا اور وہ اکثر فرمائش کرتا ''چلو امیرن چاچی کے ہاں چلیں۔''

وہاں اور بہت دلچسپیاں تھیں۔ اور امیا ایک چونچال لڑکی تھی جس سے وہ کھیل سکتا تھا۔ جب تک کہ دونوں عورتیں باتیں کرتیں۔

اس دن امجد نے دریا بی بی کو امیرن کے ہاں چلنے کے لئے پھر تکتکایا۔ وہ دونوں وقت کا کھانا پکا چکی تھی، شام کو صرف گرم ہی کرنا تھا۔ اسی لئے اسے بھی کوئی اعتراض نہ ہوا۔ امیرن سے ملنے کے خیال سے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

امیرن گایوں کو بھوسہ ڈال کر فارغ ہوئی تھی۔ اور ہاتھ دھو رہی تھی۔ اس نے جو دریا بی بی اور بچوں کو دیکھا تو مسکرا کر آؤ بھگت کی۔ ''آؤ، بوبو۔ امجد اور نعیمہ بھی آئے ہیں۔ ارے امیا آ دیکھ لو.....''

ماں کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ لڑکی وہاں پہنچ گئی۔ امیا ذرا بڑی ہو گئی تھی مگر چونچال اسی طرح تھی۔ امجد کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولی ''امجد بھائی، چلو چل کے ناریل کے پاس والی کمرخ کی جھاڑی میں فاختہ کا گھونسلا دیکھیں۔''

''چلو چلیں۔''

MashalBooks.org

جیسے ہی امجد امیا کے پیچھے پیچھے دوڑا امیرن پکاری۔ ''جنگل میں زیادہ دور تک مت جانا۔ سانپوں نے آفت ڈھا رکھی ہے۔''

مگر اس کو کون سنتا تھا؟ امیرن نے پان بنایا۔ دریا بی بی عام طور پر پان نہیں کھاتی تھی، مگر وہ امیرن کی بات ٹال نہ سکی۔

''میرا دیور'' امیرن نے کہنا شروع کیا۔

دریا بی بی اسے ٹوک کر بولی۔ ''پھر ستانا شروع کر دیا اس نے۔''

''بری عادتیں مشکل سے چھٹتی ہیں۔ اگلے دن ہمارے جھنڈ میں سے دو بانس کاٹ کر لے گیا۔

چلو خیر۔ پھر امیرن آگ بگولہ ہو کر کوسنے لگی ''اچھا ہے اس کے بیٹے کے کفن دفن میں کام آجائیں گے۔''

دریا بی بی نے بھی خفگی کا اظہار کیا ''ایک بیوہ کی مدد کرنا تو درکنار، اور اس کے مال سے چوری بھی کرے۔ سزا بھگتنے سے بچے گا تو نہیں۔''

انہیں سب کچھ آسانی سے مل جاتا ہے۔ دوسروں کی قیمت پر خود امیر بن بیٹھتے ہیں۔ وہ تو اچھی پناہ میں ہے۔ آج کل وہ مسجد کا موذن ہے۔

نعیمہ کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ اسے دوڑنا بھاگنا اچھا نہ لگتا تھا۔ اس کی چاچی نے اسے چاول کے مرمروں کے کچھ لڈو دیدیئے تھے، وہ مزے سے انہیں کھانے میں مگن تھی۔ شاید اس کے گلے میں پھندا پڑ گیا تھا اس نے چچی سے پانی مانگا۔

دریا بی بی نے آنگن میں نظر دوڑائی۔ امیرن کے گھر آکر اسے بڑا حوصلہ ملتا تھا۔ بیوہ ہو کے بھی اپنا گھر بار اچھی طرح چلا رہی تھی۔ آنگن ہمیشہ صاف ستھرا ہوتا۔ گرداگرد ترکاریوں کی کیاریاں تھیں۔ پچھلے سال اس نے لیمو کا پودا لگایا تھا جو اب خوب پھول پھل رہا تھا۔ اس کے بال بچے زیادہ نہیں ہیں اس لئے وہ یہ سب کچھ کر پاتی ہے۔

دریا بی بی نے سوچا۔

امیرن نے نعیمہ کو گلاس میں پانی دیا۔

''تم نے اسے گلاس میں دے دیا ہے، اب وہ توڑ ڈالے گی۔'' دریا بی بی نے

MashalBooks.org

خدشہ ظاہر کیا۔

''میں پکڑے ہوں، امیرن نے احتجاجاً کہا'' ہے کیا ہمارے پاس! یہ گلاس وہ زندہ تھے جب پریش پور کے میلے سے خرید کر لائے تھے۔''

''ہمارے گھر میں تو انہوں نے سب چیزیں توڑ پھوڑ دی ہیں۔ کانچ کی ایک دو چیزیں ہی بچی ہیں۔ وہ میں نے سنبھال لی ہیں۔ آئے گئے کے لئے ضرورت پڑتی ہے۔''

امیرن کو فرصت کم ملتی تھی۔ سہ پہر تو گائے او رنچھڑے کی دیکھ بھال میں گزر جاتی۔ ترکاری کی کیاریوں میں پانی دینا ہوتا۔ امیرن جلدی جلدی باتیں کئے جارہی تھی۔ اس نے مناظر یا اظہر کا سوال نہیں چھیڑا۔ کہیں اس سے دریا بی بی کا دل دکھے۔ کہیں کینچوا ڈھونڈھتے سانپ ہی نکل آئے۔

پھر بھی سانپ نے اپنا پھن اٹھا ہی لیا۔

امیرن کہہ رہی تھی''تم جانو میں اکیلی ہوی تو یوں جان مارتی؟ میری ماں نے ایسی ڈرپوک نہیں جنی۔ مگر یہ میرے گلے کی ہڈی!''

دریابی بی کی سمجھ میں اس کی بات نہ آئی، اس نے سوالیہ نظروں سے امیرن کو دیکھا۔

امیرن ہنسی،''تم نے میرے گلے کی ہڈی نہیں دیکھی تم وید ڈاکٹر ہوتیں تو دیکھ لیتیں۔ ذرا ٹھہرو ابھی دکھاتی ہوں تمہیں یہ ہڈی۔ امیرن نے پکارا''اری، امیا۔''

بچے کہیں آس پاس ہی تھے۔ امجد اور رمیا آ گئے۔

''یہ ہے میرے گلے کی ہڈی۔''امیرن نے امیا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''کیا بات ہے، ماں؟''امیا نے پوچھا۔ وہ اپنا کھیل چھوڑ کر آئے تھے، زیادہ ٹھہرنا انہیں کھل رہا تھا۔

''جاؤ، جا کے کھیلو۔''

جیسے ہی بچے واپس بھاگے دریابی بی ہنس کر بولی۔''تم نے مجھے خوب الو بنایا۔''

''کیوں ہڈی نہیں میرے گلے کی؟ میری اکیلی جان ہوتی تو میں آزاد ہوتی جو چاہتی کرتی۔ اب مارے پریشانی کے راتوں کو نیند نہیں آتی۔''

MashalBooks.org

امیرن کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔

دریا بی بی نے ٹھنڈی سانس بھری۔''میری والیوں کو دیکھ میرے پاؤں کی زنجیریں۔''

''ان کے بغیر گھر بھی سونا لگتا ہے۔ اب ہاشو ہی کو دیکھو۔ اپنے میاں کی آنکھ میں تنکا ہے وہ۔ ساس کے گلے میں ہڈی۔ اس لئے کہ بچہ نہیں ہوا اس کے۔

''وہ ہی ٹھیک ہے۔ بچہ نہ ہونے پر ایک فکر ہونے پر سوفکریں۔''

''سچ کہا، بو بو۔''

''اگر میرا منی یہاں ہوتا۔ تو پھر مجھے کاہے کا ڈر تھا۔''

امیرن اس موضوع سے کترانا چاہتی تھی۔ مگر دریا بی بی اس بات کو چھوڑتی ہی نہ تھی۔

''منی یہاں ہوتا، تو میں امبیا تم سے مانگ لیتی۔ یا وہ تمہارے پاس رہ لیتا۔ تمہارا بھی کوئی نہیں ہے، اس طرح ایک لڑکا گھر میں ہوتا۔''

جیسے کوئی سنہری خواب دیکھ رہی ہو، اس طرح امیرن نے کہا''کیا ہوگا یہ میرے نصیب میں؟''

تم مان بھی جاؤ، تو تمہارا شوہر؟ تم تو خاندانی خان ہو۔''

''وہ کیا کہے گا؟ وہ اس کا باپ نہیں ہے۔''

امیرن خوش ہوگئی۔ یہ بھی جانتی تھی کہ بس ایک بہلاوا ہے۔

''مگر وہ تو گھر سے بھاگ گیا۔''

دریا بی بی بہت اداس ہوگئی۔ امیرن نے بچوں کو پکارا اور ناریل کے لڈو دیئے۔ بچوں کا شور غل، ماحول کو پھر سے معمول پر لے آیا۔ شام ڈھلے ابھی زیادہ دیر نہ ہوئی تھی۔ دریا بی بی جانتی تھی کام کتنا ضروری ہوتا ہے۔ اس نے امیرن سے اجازت چاہی۔

خدا کی دنیا کتنی بڑی ہے؟ پالکی کی جھلملی میں سے کتنی نظر آسکتی ہے؟

امجد کی طرح دریا بی بی کو بھی گھنی جھاڑیوں کے بیچ پگڈنڈی پر چلنے کا مزہ آنے لگا۔

جھٹپٹا ہو چکا تھا۔ جنگل میں جگنو ایک دوسرے سے روشنی کی آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔

MashalBooks.org

بتیسواں باب

چندر خوب تاڑی چڑھائے گھر کو جا رہا تھا۔ گھر پہنچا تو اس کے کندھے پر لکڑی کا چیلا رکھا تھا۔ جیسے وہ یقیناً مرگھٹ سے اٹھا لایا تھا۔

دوپہر کو کھیتوں میں کوئی بھی نہ تھا اور چندر گنگناتا آ رہا تھا۔ جیسے ہی گھر کے پاس پہنچا گیت رک گیا۔ گویا سورما من گیا تھا۔ لکڑی کا چیلا زن زن گھماتا وہ ہندی میں چلایا۔ ''ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ۔''

چندرامنی، اس کے بچے اور چندر کی بیوی اپنی جھونپڑی سے ہندی اردو میں یہ ڈانٹ سن کر باہر نکل آئے۔ پہلے تو حیران ہوئے اور پھر مزہ لینے لگے۔ چندرامنی کو بہت غصہ آیا۔ چندر کے لئے تاڑی پانی کی طرح تھی۔ اسے اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ لیکن اس بے ڈھب سہمے، مرگھٹ کی لکڑی کندھے پہ لئے چلے آنا ایسی بدشگونی تھی کہ اس سے رہا نہ گیا۔

''تم آؤ یہاں اور پھر میں تمہیں بتاتی ہوں تمہارا ''ہٹ جاؤ۔''

''جتنے بوڑھے ہوتے جاتے ہیں اتنے ہی سنکی ہوتے جاتے ہیں۔'' چندرامنی نے بھابی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آگے دیکھو آنگن میں یہ لکڑی لئے ہوئے'' چندر کی بیوی نے خبردار کیا۔ چندر نے ایک دم لکڑی گھمانا روک دیا اور ہندی اردو میں پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''کیا ہوا؟'' اندر گھس کے دیکھو پھر میں تمہیں بتاتی ہوں۔ کیا ہوا؟''

چندر نے پھر لکڑی گھمائی۔ لیکن آنگن کے سرے پر کرنجے کے پودوں کے پاس آن کر ٹھہر گیا۔ ننھے جوگین نے ماموں سے کہا۔ ''ماما، مت آنا آنگن میں، مامی مارے گی۔''

''منہ بند کرو بیٹے، میں زمیندار ہوں۔ کس کی مجال ہے مجھے روکے۔''

جیسے بھیشم مگدر کندھے پر لئے کھڑا ہو، چندرتن کے کھڑا ہو گیا۔ کھونٹے کی طرح سیدھا۔ اس کے لمبے بال ہوا میں بکھرے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی گول آنکھیں نشہ میں

MashalBooks.org

دھت۔ جوگین کا بڑا بھائی ڈر کے مارے ماں کے پلو میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔

ساڑی کا پلو کمر کے گرد کستی ہوئی چندر کی بیوی گرجی ''دور پھینکو اس لکڑی کو۔ پہلے جا کے دریا میں نہاؤ اس سے پہلے کہ تم گھر میں گھسو ورنہ.....''

چندر نے بیوی کی بھینچی ہوئی مٹھیاں دیکھیں۔

''ہٹ جاؤ۔ میں زمیندار ہوں۔'' وہ چلایا۔ اپنی انگلی سے نیم دائرہ بناتے ہوئے اپنی پشت کی طرف، کھیتوں کی جانب اشارہ کر کے بولا ''وہ سب زمینیں میری ہیں۔ تم مجھے روکو گی؟ ہوش ٹھکانے ہیں؟''

''آنگن میں پیر رکھ کے دیکھو۔'' چندر کی بیوی منہ بنا کر بولی۔

اس کی بات کا جواب دئے بغیر چندر پودوں کو تہس نہس کرتے ہوئے چلایا ''یہ مزارع ہیں میرے، کچھ سنا تم نے۔''

''باؤلا''

''باؤلا'' سورما نے مگدر اٹھایا اور پھر ذرا تھما۔ پہلے تو طنز سے ہنسا۔ اور پھر للکارتے ہوئے گرجا۔ ''باؤلا! ایک کتیا کا پلا زمیندار کیسے باؤلا ہو سکتا ہے؟''

مار ڈالوں گا سب سالوں کو۔'' مگدر باز اپنے خیالی مزارعوں کو ٹھنڈا کرنے کو آگے بڑھا۔ اس کا نشہ سر چڑھ کے بول رہا تھا۔

اپنے مخالفوں کو ہنستے دیکھ کر چندر نے آنگن کی طرف پیش قدمی کی۔ اس کی بیوی نے فوراً ایندھن کی ایک لکڑی اٹھائی۔

''باؤلی'' چندر چلایا۔ ''اگر تم پگلی نہیں ہو تو لوگوں کو مارنے پر کیوں تلی ہوئی ہو؟ مگدر بازی کا کھیل پھر شروع ہو گیا۔ کون جانے یہ سب کچھ کب تک ہوتا رہتا اگر امجد دریابی بی کا پیغام لے کر نہ پہنچتا۔

چندر کاکا کی یہ نئی نویلی حرکتیں دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گیا۔ وہ سورما کے انداز دیکھ کر واقعی ڈر گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ماں کی بات کہے بغیر ہی پلٹ جائے۔

اچانک ہی سورما کی نظر اس پر پڑ گئی۔ غریب خیالی مزارع مہا سورما کی اور سزا سے بچ گئے۔ مگدر اٹھائے وہ دھیرے دھیرے امجد کی طرف بڑھا۔ امجد ڈر کے مارے پیلا پڑ

گیا۔ بڑی ہمت کر کے اس کے منہ سے نکلا'' کا کا، ماں بلا رہی ہیں تمہیں۔ بڑی ضروری بات ہے۔'' سورما نے تو جیسے امجد کی بات سنی ہی نہیں۔ اپنا مگدر کندھے پر رکھے وہ مست ہاتھی کی طرح بڑھتا رہا۔ ایک دم لکڑی ایک طرف کو پھینک کر اس نے امجد کو لپک کر کندھے پر بٹھالیا۔ چھوٹا تھا تو امجد کو اس میں بہت مزہ آتا تھا لیکن اب بڑے ہو کر اسے شرم آتی تھی۔

'' کا کا، مجھے نیچے اتار دو۔'' اس نے التجا کی۔ مگر نشہ باز اپنی ہی دھن میں تھا۔ اب گوئے مہاراج نے گانا اور ناچنا شروع کر دیا۔

چا چا، کیسا سمے آن پڑا
میں کھانے کو کہاں سے لاؤں
تمہارے لئے ایسے ٹیڑھے وقت میں
تالاب میں بطخیں کھیل میں مگن ہیں
مرغیاں بھی کڑک ہو گئیں
جھاڑیوں میں، پیڑوں تلے
لومڑی کا بچہ تک نہیں۔

چندر نے سر ہلایا۔ بھگوان نہ کرے ایک مسلمان کا بیٹا۔ اس نے زور سے زمین پر تھوکا اور ایک نیا گیت گانا شروع کر دیا۔

'' بھتیجے، کا ہے کو فکر کرے
ہم الا بلا کیوں کھائیں، تھو
گھر میں موٹی چچی ہے ہماری
کیوں نہ اس پر چھری پھیر دیں؟
آہا، بھتیجے ہوئی نا سمجھ کی بات۔
اور میں کہتا ہوں سنو، سنو، سنو، سنو۔

ہنسی کی گونج میں چندر کے گھر کی طرف چل پڑا۔ ڈھلتی سہ پہر کے بدلتے رنگ چاروں طرف پھیلے ہوئے تھرتھراتے گیت کی لے آس پاس کے کھیتوں میں پھیل گئی۔

'' گھر میں موٹی چچی ہے ہماری

MashalBooks.org

کیوں نہ اس پر چھری پھیر دیں۔
چندر کے کندھے پر شرم سے جھینپے ہوئے بیٹھے امجد نے ہنسنا شروع کر دیا۔

MashalBooks.org

تینتیسواں باب

پورا ایک سال گزر گیا۔

صرف زمین ہی ایک سال میں سورج کے گرد نہیں گھومتی تھی انسانوں کی عجیب و غریب دنیا بھی اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھی تھی۔ افراط اور افلاس، ہنسی او رآنسو، ایک انوکھے تناسب سے اپنے اپنے نشان چھوڑتے جاتے تھے۔.....

یہ گرداب بلا اپنے بہاؤ میں دریا بی بی کو عجب الجھے راستوں پر لے گیا۔ اس کا شوہراب گھر سے غائب نہیں تھا۔ اظہر بس تین ہفتے جینے کو گھر پلٹ آیا تھا۔ پچھلے ایک سال میں اس نے بہت کچھ کیا تھا۔ راج گیری اس کا پرانا ہنر تھا۔ اینٹوں کی بھٹوں کی چوکیداری، مسجدوں کے اماموں کا ہاتھ بٹانا اور چھوٹی موٹی دوکان جیسے سراب اس کے عشق تھے وہ ایک نئی ابتدا کا خیال لے کر پلٹا تھا۔ آنے سے پہلے بھی اس نے ایک دوکان کی تھی۔ اس کے حلیم مزاج میں ایک ہلچل مچی تھی۔ وہ اپنے آپ کو جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب اس کی نمازوں میں وہ خشوع نہ رہا۔ سجدے میں جاتے ہی اسے نیند آنے لگتی۔ چندر تو کافر تھا اس سے بھی زیادہ مفلس، مگر وہ خوش تھا۔ زندگی کے جھٹکے اسے شکستہ پر نہ کر پائے تھے۔ او راظہر زندگی اور خوشی کی لگن لئے چوہے دان میں پھنسے چوہے کی طرح ادھر ادھر مایوسی سے گھومتا پھرتا۔ قادر مطلق اللہ تعالیٰ پر اسے کتنا یقین تھا؟ اظہر فرصت کے وقت اپنے اس سوال کا جواب اکثر ڈھونڈا کرتا۔ اپنی دوکانداری کے آخری دن بھی ایک گاہک سے اس کا جھگڑا مول تول پر ہو گیا تھا۔ دوسرے ہی دن اس نے دوکان بیچ ڈالی تھی۔ وہ گاؤں واپس جا کر چندر سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اسے زندگی میں خوشی کیسے ملی؟ چندر حاتم خان کے خاندان والوں سے نفرت کرتا تھا۔ کیا اس کی خوشی، اس کی نفرت میں تھی؟ نفرت تو حسد تھی، فساد تھی، کیا ایسی کیچڑ میں کنول کھلتے ہیں؟ وہ چاہے کچھ بھی کرے۔ اس سے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کا ایک ایک پل چندر کی زندگی میں شامل کر دے گا۔ چندر تاڑی پیتا تھا، ناچتا تھا، گاتا تھا۔ اسے اس سے کوئی غرض نہ

تھی۔ اظہر کو ایک نیا حوصلہ مل گیا تھا۔ مگر وہ اکیلا نہیں پلٹا۔ ایک روگ سا لگا کے لایا تھا۔ ادھر ادھر گھومتے رہنے میں جان لیوا ملیریا اس کے اندر گھر گیا تھا۔ آئے دن ملیریا بخار اسے گھیر لیتا۔ گھر واپس آتے ہوئے ایک نئی علامت نے سر اٹھایا۔ موہیش ڈنگا میں تو بس آخری سین ہونا تھا۔

اظہر ایک عاجز و نیک انسان تھا۔ اس کے آخری دنوں میں اس کے ساتھیوں نے اس کی دل دہی میں کمی نہ کی۔ چندر اکثر آتا او رگھنٹوں بیٹھا رہتا۔ بات چیت تو کم ہی ہوتی۔ مگر آنے کا ناغہ نہ ہوتا۔ جیسے ہی بخار بڑھا، چندر بڑھا، چندر مندر کے پجاری سے ایک درخت کی جڑ لایا اور اظہر کی کلائی پر اس کا کلاوہ باندھ دیا۔ کوئی دوسرا موقع ہوتا تو اظہر احتجاج کرتا اور ممکن تھا کہ چندر سے قطع تعلق کر لیتا۔ مگر مرنے سے پہلے کا اظہر ایک مختلف انسان تھا۔ آخر وہ تو خود کو چندر کے حوالے کرنے کے خیال سے پلٹا تھا۔ پہلے جب بھی چندر آتا اس کی ہنسی سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی۔ اب تو وہ خود اس قدر فکر مند لگتا تھا۔ ایک دن تاڑی کے نشہ میں ہونے کے باوجود وہ چپ بیٹھا رہا۔ کسی بات کا جواب نہ دیا۔ اور ایک حرف کہے بغیر چلا گیا۔ جیسے کہ اس کے سامنے بھی اس کے اپنے بال بچوں کا خیال ایک سوالیہ نشان بنا کھڑا ہو۔ اظہر کے بال بچوں کے بے پناہ ہمدردی ملی۔ یہاں تک کہ یعقوب بھی کسی سے پیچھے نہ رہا۔ وہ تو پانچ میل دور سے ایک ڈاکٹر کو پالکی میں بٹھا کے لے کر آیا۔ مگر اس وقت تک بیماری، علاج سے آگے گزر چکی تھی ڈاکٹر کے پاس بھی دلاسہ دینے کو کچھ نہ تھا۔

دریابی بی کی خوش دلی اب پہلے جیسی نہ رہی تھی۔ اس کے گھر کے کام کاج اور تیمارداری کے معمول میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آیا تھا۔ گھر کے کام کے بیچ وہ مریض کے پاس بیٹھی رہتی۔ مگر ہر ضرورت سے بے نیاز اظہر بے حس و حرکت پڑا رہتا۔ وہ دریابی بی کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا۔ اس کی کھلی آنکھیں ایسی پتھرائی رہتیں جیسے اب وہ دیکھنے کے لئے نہ ہوں صرف سوچنے کے لئے ہوں۔ اگر دریابی بی کچھ پوچھتی بھی تو ہاں یا نہ سے زیادہ جواب نہ ملتا۔ میاں کی خاموشی اسے بہت بے چین کرتی۔ وہ ذرا ذرا دیر بعد بچوں کو اس کے پاس بھیجا کرتی۔ صرف نعیمہ سے بات چیت ہوتی جیسے وہی اس کی بات کو سمجھتی ہو۔ اگر باپ بیٹی کی بات چیت کے دوران کبھی دریابی بی آجاتی تو اظہر چپ ہو جاتا۔ دریابی بی اس کی پٹی سے لگی چپکے چپکے

آنسو پیتی رہتی۔ کیا اسے یہ خیال نہ تھا کہ وہ اپنے پیچھے کیسی ذمہ داریاں چھوڑ کر جا رہا ہے؟ وہ اکثر اس سے پوچھنے کو ہوتی مگر کبھی پوچھ نہ پاتی۔

اظہر کے گلے سے خرخر کی سی آواز نکل رہی تھی۔ آج کل لیمپ ساری رات جلتا رہتا۔ دریابی بی اٹھ کے بیٹھی اور بولی ''درد ہو رہا ہے کیا؟''

''نہیں؟'' اور پھر اسے غور سے دیکھتے ہوئے اظہر نے کہا۔ ''امو کی ماں.....میں'' وہ بولتے ٹھہر گیا۔

دریابی بی نے پوچھا'' مجھے کچھ بتانا چاہتے ہو؟''

اظہر نے ہاں میں سر ہلایا۔ اور پلکیں جھپکے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر یوں ہی گزر گئی۔ اس کے بولنے پر کان دھرے، دریابی بی نے محبت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر دیں اور پھر پوچھا'' کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

اظہر نے کچھ بھی نہ کہا۔ اس نے اپنا سوکھا کمزور ہاتھ دریابی بی کی طرف بڑھایا اور پھر مٹی بھینچ لی۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔..... پلک تک نہیں جھپک رہی تھی۔ مریض کی سانس کی آواز کے سوا کمرے میں سناٹا تھا۔ کانپتی ہوئی دریابی بی اب اس انتظار میں تھی کہ ان ہونٹوں سے اب کوئی بات نکلے گی۔ ایک لفظ بھی سنائی نہ دیا۔ زندگی سے لڑنے والے سپاہی کو دینا سے پروانہ راہداری مل چکا تھا۔ دریابی بی کو یہ اندازہ نہ ہوا کہ جان بس اس کی آنکھوں میں اٹکی ہوئی تھی۔ اپنے مردہ شوہر کی آنکھوں پر آنکھیں جمائے وہ دیکھے چلی گئی۔

MashalBooks.org

چونتیسواں باب

امیرن نے نصیحت کی، بطخیں، مرغیاں بکریاں اور پال لو۔ اس طرح دن گزر جائیں گے۔ میرا میاں جب مرا تھا مجھے بھی چاروں طرف اندھیرا نظر آتا تھا۔ ہمت کرنا چاہئے تمہیں، صرف پریشان ہونے سے وقت نہیں کٹتا۔''

دریا بی بی رضامند ہوگئی۔ مگر اس میں بڑی دشواریاں تھیں۔ وہ پردہ کرتی تھی۔ آس پاس کھیت نہیں تھے۔ امجد اسکول سے فارغ ہو چکا تھا۔ مگر مویشی چرانے پر تیار نہ تھا۔ تعلیم کا ایسا اثر تھا۔ پہلے باپ سے ڈرتا تھا اور کچھ نہ بولتا تھا مگر اب وہ خودسر تھا۔ کھیتی باڑی اسے اچھی نہ لگتی تھی۔ پہلے سال اس نے چندر کاکا کے ساتھ مل کے کام کیا مگر فصل اچھی نہ ہوئی۔ اسے زمین سے کوئی لگاؤ نہ تھا اور اس کی دیکھ بھال میں بہت لاپرواہی برتی تھی۔ اگلے برس چندر کاکا نے تجویز دی کہ تین بیگھے زمین بیچ دی جائے۔ خریدار یعقوب تھا۔ ڈیڑھ بیگھے زمین ابھی تھی۔ مگر اسے بھی بکنا تھا۔ کیونکہ امجد کو اب چندر کاکا کے ساتھ میں مزہ نہ آتا تھا۔ اس سے اتنی محنت نہیں ہوتی تھی۔ دریا بی بی امجد سے خفا تھی۔ مگر اس سے گلہ نہ تھا۔ تیرہ برس کے لڑکے کے لیے کھیتی باڑی کا کام مذاق کی بات تھی۔

امیرن کا خاندان چھوٹا تھا۔ دریا بی بی کے گھر میں اتنے کھانے والے تھے۔ یہ آسان بات نہ تھی شروع میں دلجوئی کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن ہر چیز کیا آخر حد ہوتی ہے۔ بے چارا خود بہت مصروف تھا۔ وہ کھیتی باڑی کرتا، مچھلیاں پکڑتا، گانے گاتا، مگر ان سب سے ہمیشہ کمائی نہ ہوتی۔ اس کی ہمدردی پھر بھی بے لوث تھی۔ اگر خود نہ آپاتا تو ایلوکشی کو خیر خبر لینے بھیجتا۔ ایلوکشی خالی ہاتھ نہ آتی۔ وہ ریت رواج کا خیال کرتی۔ کبھی مچھلی، ترکاری اور کچھ نہیں تو پیٹھے کا ایک ٹکڑا ہی لے کر آتی۔

زندگی آہستہ آہستہ ریزہ ریزہ ہو رہی تھی۔ نعیمہ کو اب ٹھیک سے نظر نہ آتا تھا۔ شاید اس کی بینائی جانے والی تھی۔

یعقوب کبھی کبھار اپنے اسی ٹھسے او رشان سے آتا۔ اور روپے پیسے سے ان کی امداد کرتا۔ اب ادھار مانگتے دریا بی بی کو شرم نہ آتی تھی۔ مگر اس طرح کب تک چل سکتا تھا؟ گائے پچھلے دنوں سے کم دودھ دینے لگی تھی۔ اسے بھی بیچنا پڑا۔ ننھی شری کے لئے اب دودھ بھی نہ رہا۔ وہ اب بڑوں کا کھانا کھاتی۔ آئے دن اس کا پیٹ خراب ہو جاتا، جس کا ٹھیک ہونا آسان نہ ہوتا۔

ایسے کٹھن وقت میں مناظر کا خط ان کے دکھوں میں اضافہ کرنے کو ملا۔ اس نے لکھا تھا ''ماں، سلام، میں جگہ جگہ پھرا، اور اب ایک اسکول میں پڑھتا ہوں۔ اگر تم مجھے پانچ روپے مہینہ بھیج دیا کرو، تو مجھے زندہ رہنے کا سہارا ہو جائے گا۔ اگر ایسا کرنا مشکل ہو، تو مت بھیجنا۔ میں پھر بھی کسی نہ کسی طرح گزارہ کرلوں گا۔ امو اور نعیمہ کو میرا پیار تمہارا چاہنے والا منی۔

خط لفافے میں آیا تھا۔ جو امجد نے ماں کو پڑھ کر سنایا۔ وہ لفافے کو مٹھی میں بھینچے خوشی اور مایوسی کی ملی جلی سوچوں میں کھو گئی۔ اتنے برسوں میں منی کتنا بڑا ہو گیا ہوگا؟ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اس نے اپنی سوچیں کہیں دفن کر دیں۔ پانچ روپے سات راجاؤں کی دولت تو نہ تھے۔ لیکن پھر بھی سب سے پہلے ان کے متعلق سوچنا تو تھا۔

اس کے پاس بیٹھے امجد نے پوچھا ''ماں، تم منی بھائی کو پیسے نہیں بھیجو گی؟''

''تم بھیج سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں؟'' تم مجھے پیسے دو۔ میں منی آرڈر سے بھیج دوں گا۔ ساتھ والے گاؤں میں تو ڈاک خانہ ہے۔''

ایک بناوٹی مسکراہٹ دریا بی بی کے ہونٹوں تک آئی۔ امجد ابھی تک کتنا بھولا تھا۔

ذرا دیر پہلے ہی امجد خبر لے کر آیا تھا کہ یعقوب سال کی فصل کشتی میں بھر کے لے گیا ہے زمین تو یعقوب کے ہاتھ کچھ عرصہ پہلے بیچ دی گئی تھی۔ مگر اس کی فیاضی کی یہ مہربانی تھی کہ وہ آدھی فصل سے حصہ داروں کو ادائیگی کرنے کے بعد، آدھی اس خاندان کو دے دیتا تھا۔ اب وہ بات بھی ختم ہو گئی تھی یعقوب اب زمین کا مالک تھا۔ وہی فصل بھی لے جائے گا۔ اس میں کوئی انہونی بات نہ تھی۔ پھر بھی دریا بی بی مارے غصہ کے تلملاتی رہی۔ اس نے اور

کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔منی کا خط پکڑے پکڑے اسے یعقوب کا خیال آیا او روہ بڑبڑائی ''صرف پانچ روپے''، امجد نے یہ نہیں سنا۔

دو چار دن بعد جب یعقوب آیا تو دریا بی بی نے اس سے مدد چاہی۔

''مجھ پر ایک عنایت کرو گے؟''

''بتاؤ، بتاؤ''یعقوب نے بڑی توجہ سے کہا''تم اس قدر خاموش کیوں ہو؟''

''کسی وجہ کے بغیر تو نہیں۔ یہ تو تمہیں نظر ہی آنا ہے کہ ہم کس قدر ''خوش''ہیں۔''

''کیوں ناخوش ہو تم؟ تمہاری ایک مسکراہٹ لاکھ روپے کی ہے۔''

کوئی اور وقت ہوتا تو دریا بی بی کو ایسی مفت کی تعریف اپنی توہین لگتی۔لیکن آج اس نے بڑے سبھاؤ سے اس کو برداشت کیا۔ ہاں یعقوب نے بات کہنے کے بعد، اس کو کنکھیوں سے دیکھا تھا۔

''میں لاکھ روپے کی التجا نہیں کر رہی ہوں۔صرف پانچ روپے۔''

''بس، یعقوب نے ہونٹ سکیڑے۔

''ہاں''

''صرف''

''ہاں تمہیں مگر ہر مہینہ دینا ہوں گے۔''

''کیا کسی کو دو گی؟''

''ہاں''

''کس کو؟''

''تمہاری مہربانی ہو گی یہ مجھ سے کبھی مت پوچھنا۔''

''جو تمہاری مرضی'' یعقوب نے مسکرا کر سر ہلایا۔''مجھے بتاؤ او رکیا چاہئے تمہیں۔ پتھر کی طرح ہو تم۔کبھی اپنی زبان نہیں کھولی۔ میں ساری فصل لے گیا او رتم نے کچھ بھی نہ کیا۔''

''تم اپنی زمین کی فصل لے گئے۔'' دریا بی بی نے ایسے لہجہ میں کہا جس میں طنز چھپا ہوا تھا۔''میں کچھ کہنے والی کون ہوتی ہوں؟''

MashalBooks.org

''کیوں نہیں؟ رشتہ دار ہو میری۔ زمین خرید لی میں نے تو کیا فصل بھی لے جاؤں؟''

''تمہیں ضرور لے جانا چاہئے۔''

''آدمی اپنے رشتہ داروں سے تو ظلم نہیں کر سکتا۔''

''اس میں ظلم کی کیا بات ہے؟''

تم مجھ سے یہ تو پوچھ سکتی تھیں میں فصل کیوں لے گیا؟ تم نے نہیں پوچھا۔ میں خود تمہیں بتاتا ہوں۔تم جانتی ہو میرے گھر میں گوشت کے دو پہاڑ ہیں۔ان کو یہ بات کٹکتی تھی کہ میں نے زمین تو خرید لی مگر فصل پھر بھی گھر میں نہیں جاتی۔اس لئے اس دفعہ گھر لے گیا۔ یہ رہے اس فصل کے دام۔''

یعقوب نے جیب سے پچیس روپے نکالے۔''منڈی میں دھان کا بھاؤ ڈھائی روپے من ہے۔ ہمارے دس من دھان ہوئے تھے۔''

دریا بی بی نے یعقوب کی طرف دیکھا۔کبھی کسی نے اس کی آنکھوں میں ایسا تشکر ایسی منت نہ دیکھی تھی۔

یعقوب نے بٹوے سے پانچ روپے کا ایک اور نوٹ نکالا۔

''یہ لو، یہ میں ہر مہینہ دیا کروں گا۔''

دریا بی بی نے پیسے لینے کو ہاتھ بڑھا دیا۔

''مجھے اپنے ہی گھر کا آدمی سمجھو۔دریا بھابی۔''

دریا بی بی نے جواب نہ دیا۔صرف اس کی طرف بے تکان دیکھا۔اس نے ڈر کے مارے آنکھیں نیچی کر لیں۔

رات کو بستر پر لیٹی دریا بی بی یعقوب کے رویے پر بل کھاتی رہی۔ پانچ روپے کا نوٹ اب بھی اس کے تکیے کے نیچے رکھا تھا۔

اندھیرے میں ٹٹول کر دریا بی بی نے نوٹ نکالا اور اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ جیسے انہیں سکھانے کو اسے کاغذ کے اس پرزے کی ضرورت تھی۔

MashalBooks.org

پینتیسواں باب

امجد ڈاک خانے سے لفافہ لے آیا تھا۔

دریابی بی بولی ''امو، اپنے منی بھائی کو خط لکھوا ور کہو جلدی سے گھر آ جائیں۔''

امجد خط لکھنے بیٹھا ہی تھا کہ ہاشو آ گئی۔

ہاشو نے ادھر ادھر دیکھا اور چپکے سے بولی ''میری ساس کے تیہے کو جانتی ہو بوبو؟''

یہاں آؤں تو بھی خفا ہوتی ہے۔ بچہ نہیں ہے نا میرے۔ بس یہی بات لے کے ہزاروں بکھان کرتی ہے۔ کیسے آؤں میں؟''

''شاکر بھائی کہاں ہیں؟''

''مجھے بھی ان ہی کی فکر تھی۔ کسی زمیندار کی زمین کے جھگڑے میں گئے ہیں۔''

''تم روک نہیں سکتیں، انہیں؟''

''میری کون سنتا ہے؟ اس بار ٹانگ میں چوٹ لگی ان کے۔ میں نے ہلدی چونے کا لیپ کیا۔ آج کچھ بہتر ہیں۔ سات آٹھ دن کو گئے تھے۔ میں تو فکر کے مارے بیمار پڑ گئی۔ آدمی کے جی کو چین نہ ہو تو کہیں ملنے ملانے بھی نہیں جایا جاتا۔ کیوں؟''

ہاشو نے دریابی بی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''سچ کہتی ہو'' دریابی بی نے ہمدردی کی۔ ''جی ہی خوش نہ ہو تو چھیر کھٹ پر سونے میں بھی آرام نہیں۔''

پھر امجد کی طرف مڑ کر بولی ''کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ میرا حال لکھ دو اور لکھ دو ہم سب خیریت سے ہیں۔''

''اچھا، ماں۔'' امجد پنسل چلاتے ہوئے بولا۔

ہاشو بولی ''بوبو، کس کو لکھوا رہی ہو؟''

''اپنے منی کو۔''

MashalBooks.org

''اس کی خیر خبر ملی؟''

''ہاں''

''شکر ہے اللہ تعالیٰ کا۔ امو میری بھی دعا لکھ دینا۔''خوشی سے جھوم کر اس نے بات بڑھائی۔''بڑا ہی خوبصورت لڑکا ہے، ماں کے دل میں ٹھنڈا ڈالے گا۔''

''میرا دل تو جلتا رہتا ہے۔ ہاشو تو''دریا بی بی نے آہ بھر کر کہا۔

''تمہارا لاڈلا آئے گا تمہارے پاس۔تم دیکھ لینا۔ میری بات ٹھیک ثابت ہو گی۔ مجھے ہے ایسا خیال۔''

''موتیوں میں تلو، ہاشو۔ میری بے کار زندگی کو کنارا مل جائے گا۔

''مجھے پکا یقین ہے تمہارا اپنا پیارا بچہ تمہارے پاس آئے گا۔''

''پندرہ برس کا ہوا اب وہ کیسا ہو گیا ہوگا۔ کتنے برسوں سے میں نے اسے نہیں دیکھا۔''انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

دریا بی بی کی غمگین آنکھیں ہاشو کو دکھی کر گئیں۔

امجد نے خط پورا کر لیا تھا، اور اب دونوں عورتوں کی باتیں سن رہا تھا۔ جیسے ہی وہ چپ ہوئیں تو امجد نے پوچھا''ماں میں ایک بات اور لکھ سکتا ہوں؟''

''سب لکھ لیا تم نے؟''

''جی''

''تو پھر اور کیا؟''

''یہ کہ ابا نہیں رہے۔''

''نہیں، یہ لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''دریا بی بی نے ڈانٹ کے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔''

ایسا لگا جیسے یہ خاموش سا لڑکا بالکل سن ہو گیا ہو۔

ہاشو چلنے کو اٹھی۔

''امو، چلو مجھے چھوڑ آؤ۔''اس نے کہا۔ بڑی ہی رضامندی سے امجد ہاشو کے پیچھے ہو لیا۔ وہ دونوں احاطے کے نیچے راستہ پر کھڑے تھے۔ شام کے دھندلکے میں ان کے ارد گرد

MashalBooks.org

کی دنیا اداس لگتی تھی۔ موہنجو ڈنگا فی الواقع ایک جنگل ہی تھا۔ گھنی جھاڑیوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے ہاشو کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ پگڈنڈی بھی بمشکل نظر آتی تھی۔ اس کے دونوں طرف کب سے ٹڈیاں چک چک کر رہی تھی۔ ہاشو امجد کے پیچھے پیچھے ہولی۔ وہ ذرا دور ہی گئے ہوں گے کہ اس نے امجد کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا ''میری دعا لکھ دی تھی بیٹا؟''

''لکھ دی تھی، ہاشو چاچی۔''

''سچ مچ؟ قسم کھاؤ۔ مجھے ہاتھ لگا کے کہو۔''

''لکھ دی، لکھ دی، لکھ دی، تین دفعہ سچ، امجد نے ہاشو کا کندھا چھوتے ہوئے کہا۔

خوش ہو کے ہاشو بولی۔'' کل آنا تمہارے لئے کھیر پکاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آؤں گا۔''

''جب منی کا جواب آئے گا تو مجھے فوراً خبر کرنا۔ دیر مت لگانا۔''

ہاشو کا درخواست کرنے کا انداز امجد کو عجیب سا لگا۔

''اب جاؤ تم، میں چلی جاؤں گی۔ سانپوں سے بچ کر چلنا، بیٹا''

اب امجد کے ڈرنے کی باری تھی۔ اس نے جواب دینے کا بھی انتظار نہ کیا سانپوں سے اس کا دم نکلتا تھا۔

MashalBooks.org

چھتیسواں باب

تین چار مہینے بعد مناظر کا ایک اور خط آیا۔ اس کا پتہ بدل گیا تھا۔ جس خاندان کے پاس وہ رہ رہا تھا اب وہ ایک طالب علم کی امداد نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے اسے کہیں اور جانا پڑا تھا۔ اور اب پندرہ روپے مہینہ سے کم میں اس کا گزارہ نہیں ہوسکتا تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اب کیا کرے۔

دریا بی بی پریشان ہوتی رہی۔ پندرہ روپے میں تو سارے گھر کا مہینہ چین سے گزر سکتا تھا۔ جو کچھ دھان ملے تھے۔ اس سے تو چار مہینے نکلے۔ باقی سال اللہ تعالیٰ گزروائے گا۔ کبھی کبھی امجد چندر کے ساتھ مزدوری کرنے چلا جاتا۔ لوگ بچوں کو مزدوری پر رکھنے سے کتراتے تھے۔ چندر کی خاطر وہ اسے تین چار آنے دے دیتے۔ انڈے مرغی بیچ کر ان کا گزارہ چلتا۔ سونے پر سہاگہ منی کی یہ فرمائش۔ دریا بی بی سوچتی رہی۔ کوئی نہ کوئی راستہ تو نکالنا ہی پڑے گا۔ پھر یعقوب کے پیر پکڑ لے؟ نہیں یہ ممکن نہیں۔ جتنی تدبریں بھی سوچتی وہ گھوم پھر کے اسی ایک نقطہ پر پہنچ جاتیں۔ دریا بی بی نے یہی فیصلہ کیا کہ یعقوب کو بتانا ہی پڑے گا۔

یعقوب ہنس دیا۔ اور بولا۔ ''دریا بی، جس کسی چیز کی بھی ضرورت ہو، بس کہہ دیا کرو۔''

''تمہارے ہم پر پہلے ہی اتنے احسان ہیں۔ مجھے شرم آتی ہے۔''

''اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ میں تو بس تمہیں مسکراتا دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''مسکرانا ایسا آسان نہیں''

''آسان ہو جاتا ہے اگر دل موم ہو جائے۔'' یعقوب مسکرایا۔ بیوگی کے بعد سے دریا بی بی کے جسم میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ سوائے اس کے کہ اس میں ایک طرح کی سختی آ گئی تھی جس نے اس کے وقار میں اضافہ کر دیا تھا۔ لوگ اسے مغرور سمجھتے تھے۔ مگر وہ خود

MashalBooks.org

کو ایسا نہ جانتی تھی۔ اسے تو لگتا کہ وہ عاشق جان کی طرح ہوتی جا رہی ہے اس خیال سے وہ ڈر کے مارے پیلی پڑ جاتی۔

''نہیں ایسا نہیں ہے، میں بظاہر ایسی لگتی ہوں۔'' دریابی بی نے بہت رسان سے کہا۔

''بے کار میں دکھ اٹھاتی رہتی ہو۔ صرف مجھے بتا دیا کرو۔ میں یہ پندرہ روپے مہینہ بھی دیا کروں گا۔ میرے جانے سے پہلے مہربانی کرنا اور تین مہینے کے پیشگی لے لینا۔''

''اللہ تعالیٰ تمہارا بھلا کرے۔ وہ تمہیں اس سے بھی زیادہ مالا مال کرے۔'' دریابی بی نے کہا۔ شدت جذبات سے اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

''تمہاری دعا چاہئے۔'' ہم بے چارے دکھیا۔ ہماری مسکراہٹ اور اس کی قیمت! دریابی بی طنز سے مسکرا کر بات ختم کر دی۔

اسے اس کا موقع نہیں دیا۔

''ہانڈی چولھے پر چھوڑ آئی ہوں۔ جلنے کی بو آ رہی ہے۔'' دریابی بی باورچی خانے کی طرف لپک گئی۔ یعقوب دریابی بی کا سڈول جسم دیکھ کر مسکرایا۔

فاقے دریابی بی کے لئے نئے نہ تھے۔ کبھی کبھی بچے سارا کھانا کھا لیتے۔ اور دریا بی بی خوشی خوشی انہیں ہانڈی پونچھ کے کھلا دیتی۔ ایسا بھی موقع ہوتا کہ یہ بات کھل جاتی تو امجد بہت پانی پانی ہوتا۔ نعیمہ اور شریفہ اتنی چھوٹی تھیں کہ ان کی سمجھ میں یہ سب کچھ نہ آتا تھا۔ جب امیرن کو پتہ چلا تو اس نے دریابی بی کی خبر لی۔ ایک بار تو روٹھ کر چلی گئی۔ ''تم ہمیں نہیں بتاتیں۔ اپنا نہیں جانتیں نا۔ اگر تم امجد سے ایک مٹھی چاول یا ذرا سی ترکاری منگوالوگی تو کیا مجھے کھلے گا؟'' کسی سے کچھ مانگنے کا خیال دریابی بی کو ٹکڑے ٹکڑے کر جاتا۔ اپنی پچھلی زندگی کا خیال کرتی تو اسے لگتا جیسے اب اپنے آپ پر بھروسہ نہ رہا ہو۔ اس کا اعتماد ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ پہلے تو کسی وقت کا فاقہ ایسا مشکل نہ لگتا تھا۔

اس رات امجد اور نعیمہ کے کھانے کے بعد کچھ نہ بچا تھا۔ صبح کو کمزوری لگ رہی تھی کہ یعقوب آ گیا۔ خاطر مدارات کے طمطراق میں کسی کمی کے بغیر۔ بڑھیا چاول، مچھلی، ترکاری، گھی ___ اپنی نمود و نمائش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

دریابی بی تو پکانے ریندھنے میں جٹ گئی۔ جب سب کھا چکے تو دریابی بی نے نہار

MashalBooks.org

کلیجے کھایا اور خوب کھایا۔ پہلے تو دوسروں کا لایا کھانا اسے عاشق جان کی یاد دلاتا کس کے چالیسیوں پر عاشق جان کی ضافتیں۔ آج تو اس کی بھوک چمکی ہوئی تھی اور اس کے خالی پیٹ نے باقی تلافی کر دی۔

دوپہر کے بعد امجد چندر کے پاس کام ڈھونڈھنے کی خاطر چلا گیا۔ نعیمہ شری کو کمر پر لادے ہاشو کے ہاں چلی گئی۔ ہاشو انہیں کل بلا گئی تھی۔ انکا ایک پیٹھا پک کر اترا تھا۔ وہ اس کا حلوہ بنانے کو تھی۔

اتنا کام کرنے کو تھا۔ برتن بھانڈے دھونے مانجھنے کو تھے۔ گھر کے جانوروں کو بھی دیکھنا بھالنا تھا۔ دریا بی بی کا پیٹ اتنا بھر گیا تھا کہ اسے اونگھ سی آ رہی تھی۔ اس نے سوچا بس ذرا دیر لیٹ لے۔ لیکن جیسے ہی لیٹی، اسے لگا بہت نیند آ رہی ہے۔ فاقہ زدہ بدن اگر ذرا دیر کو سستانا چاہتا تھا تو اس میں اچنبھے کی کیا بات تھی۔

بیساکھ کا گرم دن تھا۔ گرداگرد گھنے پیڑوں کے مارے گھر میں گرمی کی رسائی نہ تھی۔ کمرے میں تو اچھی خاصی خنکی تھی۔ کٹھل کے پیڑ پر بیٹھی ایک فاختہ مسلسل کوکو کئے جا رہی تھی۔ آج دریا بی بی کے تھکے وجود کو کوئی بے چینی نہ تھی۔

پھر اچانک وہ جاگ گئی۔ دریا بی بی کو لگا کہ کوئی اسے اس طرح بھینچ رہا ہے کہ چورا چور کر ڈالے گا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو یعقوب کو دیکھا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ اس نے تو بانس کا دروازہ پٹ کھلا چھوڑ دیا تھا مگر اب وہ بند تھا۔ دریا بی بی کا سارا بدن جیسے ٹھنڈا پڑ گیا اسے صرف اتنا احساس تھا کہ کسی اور کی گرم سانس اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس نے اٹھ کے بیٹھنا چاہا، مگر دوسرے شخص کی گرفت اسے شکنجے میں کسے ہوئے تھی۔ اپنی مجبوری و بے کسی میں وہ چپ رہی اور پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔ جیسے وہ اندھی ہو گئی ہو، اور ساری دنیا گھور اندھیرے کی لپیٹ میں ہو۔

باہر فاختہ افسردگی سے کوکو کرتی رہی۔

MashalBooks.org

سینتیسواں باب

اس دن شام کے کھانے پر امجد بولا ''ماں، یعقوب چاچا ایک دم ہی چلے گئے۔ میں سوچ رہا تھا وہ کل صبح جائیں گے۔''

پہلے تو دریا بی بی نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اچانک ہی بھڑک کر بولی۔ ''کھانا کھا رہے ہو تو کھاؤ، بہت باتیں کرتے ہو تم۔''

امجد نے آنکھ اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ اور پھر اپنے کھانے میں مگن ہو گیا۔ اگلے دن صبح پھر اسے ڈانٹ پڑی۔ اس نے گھر کے پیچھے کوڑے کے ڈھیر پر نہ صرف پکا ہوا کھانا پڑا دیکھا بلکہ کچی ترکاریاں بھی۔ اسے پتہ تھا یعقوب چاچا کل یہ ہی لے کر آئے تھے۔ وہ ماں کے پاس دوڑ کر گیا۔

''ماں آ کے دیکھو تو، کس نے یہ سارا کھانا پھینک دیا؟''

دریا بی بی بطخوں اور مرغیوں کو دانہ دے رہی تھی۔ اس نے سنی ان سنی کر دی۔ بیٹے نے ماں کی پھر منت کی۔

اگلے تین چار دن امجد گھر میں اداس سا پھرتا رہا۔ اس نے اپنی ماں کو اس حال میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کون جانے یہ صورت حال کب تک او رر ہے؟ کہ یعقوب کے پھر آجانے سے معاملہ کچھ سنبھل گیا۔ وہ اکیلا نہیں آیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو ساتھ لایا تھا اور سودا تو لایا ہی تھا۔ اس کا بیٹا نو دس برس کا ہوگا۔ کیوں لایا تھا وہ اپنے بیٹے کو؟

دریا بی بی نے حسب عادت بچے کی آؤ بھگت کی۔ اور حسب معمول یعقوب سے بات چیت کی دیور کی چالیں اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔

مناظر کا پھر خط آیا تھا۔ دریا بی بی نے یعقوب سے بیٹے کے ساتھ رخصت ہونے سے پہلے پندرہ روپے لے لئے۔

امجد کو احساس تھا کہ ماں کا موڈ ابھی ٹھیک نہ ہوا تھا۔ اسے اکثر ڈانٹ پڑا کرتی۔

MashalBooks.org

نعیمہ اور شری تک اگر ذرا بھی روتیں تو مار کھاتیں۔ ماں نے ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔ ایک دن وہ امیرن چاچی کے پاس گیا اور ان سے شکایت کی۔

امیرن کاموں کے مارے بہت دن سے ان کے یہاں نہ جا سکی تھی۔ ایک دن وہ آئی اور اس نے پوچھا ''بوبو، کیا یہ سچ ہے کہ تم بچوں کو مارا پیٹا کرتی ہو؟''

''اپنے دکھ میں انہیں نہ ماروں تو کیا کروں؟ یہ مریں گے تو مجھے چین ملے گا؟''

''ہے، ہے، بوبو'' امیرن نے بات کاٹی ''ایسی بدشگونی کی باتیں نہیں کرتے۔ میری تو ایک ہی ہے۔ وہ بھی کچھ کم جان نہیں جلاتی۔''

''گنتی سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ ہیں ہی ہمارے جلانے کو، چاہے کتنے ہوں۔ ان میں سے ایک تو اپنی شکل بھی نہیں دکھاتا۔ میں اس کے لئے گھلتی رہتی ہوں۔ وہ جو یہاں ہیں وہ بھی کچھ کم نہیں ستاتے۔ اللہ تعالیٰ انہیں لے کیوں نہیں لیتا؟''

دریا بی بی اپنے حواسوں میں نہ تھی۔ امیرن نے بات آگے نہ بڑھائی۔ کام نبیڑنے کے بہانے اس نے اجازت چاہی۔

کچھ مرغیاں جنہیں دوپہر کو دانہ نہیں ملا تھا۔ کڑکڑا کے دریا بی بی کا ناک میں دم کئے ہوئے تھیں۔ ایک جو ذرا قریب تھی دریا بی بی نے اسے پکڑا اور گھما کے صحن میں پھینکا۔ زخمی مرغی درد کے مارے تڑپتی بلبلاتی پھری۔

نعیمہ جسے ڈھنگ سے نظر نہ آتا تھا۔ دالان میں بیٹھی تھی۔ ''ماں، کیا شام کے کھانے کے لئے مرغی ذبح کر رہی ہو؟''

دریا بی بی چیخی ''ذرا ٹھہر جا حرامزادی، میں تجھ پہ چھری پھیرتی ہوں۔''

مناظر نے ماں کی سانس کو اپنے جسم پر محسوس کیا۔ اس کے دل کی دھڑکن سنی اور وہ بھی چپ چاپ آنسو بہاتا رہا۔

MashalBooks.org

اڑتیسواں باب

شکاری گھات لگانے میں ماہر ہوتے ہیں۔ یعقوب مکروفریب میں کسی سے کم نہ تھا۔ ایسے خونخوار جانور کی طرح کے منہ کو خون لگ چکا ہو، یعقوب اس گھر کے چکر لگاتا رہتا۔ لیکن اب پھر اس نے کسی بے احتیاط اور مجبور لمحے کا فائدہ نہیں اٹھایا۔

امجد کے لئے گھر کا ماحول ناقابل برداشت تھا۔ ماں ہمیشہ کسی نہ کسی خیال میں کھوئی رہتی۔ ذرا سی بھول پر ڈانٹ ڈپٹ لازمی تھی۔ وہ کبھی اتنا پریشان نہ ہوا تھا۔ اور وہی یہ خبر بھی لے کر آیا۔

''ماں، منی بھائی کا خط آیا ہے۔ وہ کل آرہے ہیں۔''

''کل''

''جی''

''اچھا۔''

امجد نے ماں کی شکل دیکھی۔ خوشی کا کہیں گمان بھی نہ تھا۔ جیسے وہ ایسے ہی روزانہ کی کوئی معمولی خبر لایا ہو۔

''ماں'' امجد نے پکارا۔

''کیا ہے!''

''میں نے لکھا تھا ابا فوت ہو گئے ہیں۔ گھر میں تنگی ہے۔ اور کبھی آ کے ہم سے مل جاؤ۔''

''کس نے کہا تھا تم سے یہ سب کچھ لکھنے کو؟'' دریا بی بی بیٹے پر غرائی۔ امجد کو اس کی طرف دیکھنے کی ہمت تو نہ ہوئی مگر بڑی نرمی سے بولا ''ماں، منی بھائی یہاں اس لئے نہیں آتے کہ ابا نے انہیں مارا تھا۔ تمہیں بتائے بغیر، میں نے یہ بات اس لئے لکھ دی تھی۔

''ٹھیک ہے'' دریا بی بی کوئی کام کرنے چلی گئی۔

MashalBooks.org

دوسرے دن اکیلا امجد گاؤں کی سڑک پر کھڑا انتظار کرتا رہا۔ ریلوے اسٹیشن تو بہت دور تھا۔ منی بھائی بہت تھکے ہوئے آئیں گے اگر یہاں تک آ کے بھی ان کا استقبال نہ کیا جائے تو انہیں اچھا نہیں لگے گا۔

مناظر واقعی آ گیا۔ شام کو دونوں بھائی جب گھر پہنچے تو نعیمہ نے چلانا شروع کر دیا۔

''ماں دادا آ گئے۔ دادا آ گئے۔''

اس وقت دریا بی بی باورچی خانے میں تھی۔ پانچ منٹ تک وہ کہیں نظر نہ آئی۔ مناظر چپ کھڑا انتظار کرتا رہا۔

''ماں کہاں ہیں، نعیمہ؟'' اس نے نعیمہ کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''باورچی خانے میں۔''

''امو، چلو اندر چلیں۔'' وہ باورچی خانے میں چلا گیا۔ آگ بھڑ بھڑ جل رہی تھی۔ بانس کے اسارے سے ٹکی دریا بی بی نیند میں غافل تھی۔

دونوں بھائی حیران رہ گئے۔ امجد نے پکارا۔ ''ماں دیکھو کون آیا ہے؟'' یک دم آنکھیں کھول کر دریا بی بی ایسے بھونچکی رہ گئی جیسے بجلی گر پڑی ہو۔ اس نے اشتیاق کے مارے بانہیں نہیں پھیلائیں۔

مناظر کے قد کاٹھ میں بہت تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ وہ اب پندرہ برس کا، بڑا سا لڑکا تھا۔ اس کے دہانے کے اوپر، گورے رنگ پر مونچھوں کی ایک لکیر کھنچ گئی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے دریا بی بی صرف اسی چیز کو دیکھ رہی ہو۔

امجد بولا ''ماں تم نے منی بھائی کو نہیں پہچانا؟ دیکھو تو کتنے بڑے ہو گئے ہیں۔''

کسی فالج زدہ کی طرح سے دریا بی بی کی آنکھ تک نہ جھپکی۔

مناظر نے پکارا ''ماں''

اس نے کوئی جواب نہ دیا صرف ایک بار آنکھ جھپکی اور پھر دیکھے چلی گئی۔

امجد کو حیرت ہو رہی تھی۔ نعیمہ بھی پاس آن کر کھڑی ہو گئی۔

مناظر ماں کو رسم کے مطابق تعظیم دینا بھول گیا تھا۔ وہ بیٹھا اور ماں کے پیر چھونے کو ہاتھ بڑھائے۔ دریا بی بی نے بیٹے کو بانہوں میں لے لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

MashalBooks.org

امجد کھیل کود کے گھر پلٹ رہا تھا۔ ماں کو جو گرجتے سنا تو جانوروں کے باڑے کی
طرف کھسک لیا۔ فضا صاف ہو جائے گی تو گھر آ جائے گا۔

MashalBooks.org

انتالیسواں باب

''دیکھوتو، بوبو، کتنا بڑا ہو گیا یہ'' امیرن نے دریا بی بی کو مخاطب کر کے کہا۔

''ہاں کچھ بڑا ہو گیا ہے، تین چار سال میں۔''

''کچھ نہیں، اس کی شکل دیکھو۔ جب اور بڑا ہو گا تو میری طرح ہمت والا ہو گا۔ تم دیکھ لینا۔''

''تمہارے پیر کے ناخن برابر ہونے کو زندہ رہے۔''

''خدا کرے یہ اتنے برس جیئے جتنے میرے سر پر بال ہیں۔''

امیرن کے دالان میں وہی مانوس لوگ جمع تھے۔ دریا بی بی، دوپہر کے ذرا بعد اس سے ملنے آئی تھی۔ ساس کی بات کی پرواہ کئے بغیر ہاشو نے بھی آنے کی ضد کی تھی۔ مناظر کو پسینہ آنے لگا۔ اچھا بھلا ہوشیار لڑکا تھا لیکن اس عجیب وغریب ماحول میں بجھ سا گیا تھا۔ امبیا منہ کھولے مناظر کو تکے جا رہی تھی۔ وہ یاد کر رہی تھی کہ پانچ برس پہلے ایک دھندلی سی شام کو اس نے اسے کیسا الو بنایا تھا۔ اس وقت امبیا کا سارا وجود لاج میں لپٹا ہوا تھا۔

امیرن نے اسے جھڑکا۔ ''کیا بیٹھی گھورے جا رہی ہے، کم بختی ماری۔ یہ تیرے منی بھائی ہیں۔ جاؤ جا کے کھیلو۔''

ماں کی ڈانٹ ڈپٹ سے پناہ میں رہنے کو وہ چپکے سے جا کر دریا بی بی کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کا وہاں سے ہلنے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا۔ رسماً ہاں نہ کہنے کے سوا مناظر نے ہاشو کے سامنے بمشکل زبان کھولی۔ ہاشو نے کہا۔ ''کچھ تو کہو، تم تو بالکل ہی بدل گئے۔ ہے نا؟''

مناظر نے سر جھکا لیا۔ ماں کا کہا مانتے ہوئے اس نے تعظیماً ہاشو کے پیر چھوئے تھے۔ لیکن تب سے بس چپ بیٹھا تھا۔

''اتنے شرمیلے کیوں ہو؟'' امیرن نے مناظر سے پوچھا۔

اس کا جواب اس کی ماں نے دیا۔ ''اب وہ بڑا ہو گیا ہے۔ سمجھ آ گئی ہے کہ بڑوں

MashalBooks.org

کے سامنے زیادہ بولنا بے تمیزی کی بات ہوتی ہے۔''

''جا، جا کے کھیل۔ جاؤ بھی امبیا'' امیرن نے لڑکی کو وہاں سے دھکیلا۔

امجد جو منی بھائی کے ساتھ کے علاوہ اور کچھ نہ چاہتا تھا۔ بولا ''چلو چلیں، دادا۔''

یہ مان لینے والی بات تھی۔ مناظر نے ہاں میں ہاں ملانے میں دیر نہ لگائی۔ امبیا بھی جھجکتے ہوئے آگے بڑھی اور ایک دو پل میں ہی وہ لڑکوں کی طرف بھاگی۔ عورتیں زور سے ہنس پڑیں۔ ہاشو بولی۔ ''کیسی لڑکی ہے! چونچال ہے نا! تم نے دیکھا کیسے بھاگی؟''

''جانے دو اسے'' امیرن بولی۔ بیٹی کی تعریف اسے نہ بھاتی تھی۔ ''نری آفت ہے۔''

''بوبو، آ گیا نا تمہارا بیٹا تمہارے پاس۔ میں نے تم سے کہا تھا، کہا تھا نا؟''

''اس کا کوئی بھروسہ نہیں۔''

''کیوں بری بات منہ سے نکالتی ہو۔''

دریا بی بی نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف ایک گہری سانس لی۔ امیرن نے پوچھا ''کتنے دن رہے گا؟''

''پرسوں واپس چلا جائے گا۔''

''ارے'' امیرن نے کہا اور کچھ فکرمند سی ہو گئی۔

''بوبو، تم اسے بتلا دو۔ اگر وہ پھر کہیں چلا گیا، تو میں بچ نہ پاؤں گی۔''

ہاشو اور امیرن ایک ساتھ بولیں ''ہاں ہاں کیوں، میں ضرور کہوں گی اس سے۔''

امبیا ہنستی ہوئی دوڑ کے واپس آئی۔ سب کی آنکھیں اسکی طرف اٹھ گئیں۔ ا

امیرن بولی ''منہ جلی، کیوں ہنسے جا رہی ہے۔''

ماں کے ایسے لاڈ کے جواب میں امبیا ہنستے ہنستے رک گئی۔ پھر بولی ''منی بھائی ایک پیڑ پر چڑھ گئے۔ اور گانا گانے لگے۔ اتنے میں ایک بندر آ گیا وہ جلدی سے نیچے اترے اور ایک لال چیونٹی نے انہیں کاٹ لیا۔''

''تو یوں ہنس رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ جانے یہ موئے بندر کہاں سے آ گئے۔'' امیرن آنگن میں پودوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ان سے تو پودے بچانا مشکل ہیں۔ اگلے دن

MashalBooks.org

ساری میری پھلیاں کھا گئے۔

دریابی بی بولی ''بہت مزے میں وقت گزرا تمہارے ساتھ۔''

''منی بیٹے، پلٹ آنا۔ تم تو پرسوں چلے جاؤ گے اور مجھے اس کم بخت کے ساتھ جینا ہے۔'' امیرن نے خوش دلی سے بیٹی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

MashalBooks.org

چالیسواں باب

مناظر کو چندر کی بات بہت اچھی لگی۔ اسے لکھنا پڑھنا تو آ گیا تھا وہ ان کے تھیٹر گروپ کا لیڈر بن جائے گا اور گیت لکھا کرے گا۔آج کل کے بابوؤں کو سیدھے سادے دیہاتی گیت اچھے نہ لگتے تھے۔مناظر زبان کی نوک پلک سنوار کرے گا۔

پھر بھی مناظر مقررہ وقت پر چلا گیا۔ جانے کیا وجہ تھی اس کا دل یہاں نہ لگتا تھا۔اسے ماں کی محبت میں بھی وہ گرم جوشی نظر نہ آئی۔ ان تین دنوں میں اسے اندازہ ہوا کہ اس کی ماں اب پہلے کی طرح نہیں چاہتی تھی۔ دریا بی بی کے بے تکے طور طریقے امجد کو دکھ پہنچاتے اور مناظر کو حیران کرتے۔جس دن وہ رخصت ہوا، دریا بی بی نے بار بار اس کی منت کی، کہ جب بھی چھٹی ملے وہ ضرور آئے۔

اب کچھ دنوں سے ہاشو برابر آیا کرتی۔ اس کے آس پاس ہمدردی کرنے والا کوئی اور نہ تھا۔ بے اولادی کی اذیت اسے اکیلے ہی بھگتنا تھی۔ یہاں آ کے وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی۔ دریا بی بی اس سادہ اور بے ضرر دیہاتی عورت سے بڑی شفقت برتتی۔ ہاشو کی ساس کو اس کا یہ آنا جانا اچھا نہ لگتا تھا۔اور بڑبڑاتی رہتی۔لیکن اس بارے میں ہاشو کے منہ پر کچھ نہ کہتی کیونکہ خود شاکر دریا بی بی کا بہت لحاظ کیا کرتا تھا۔ وہ اپنی ماں سے دریا بی بی کی حمایت میں حجت بھی کر لیتا۔

جس دن مناظر گھر ہے ہاشو جلدی آ گئی تھی۔ اور دیر ہونے کے باوجود اس نے جانے کا نام نہ لیا۔ وہ دریا بی بی کے چھوٹے موٹے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹاتی رہی،اور مسلسل بولتی رہی۔

''دکھی مت ہو، بوبو۔ایسا ہیرا بچہ۔تمہارے سوا وہ کسی اور کا تھوڑا ہی ہے۔'' لگتا تھا تسلی کے ایسے سارے لفظ اس کے ہونٹوں پر جم گئے ہوں۔

دل شکست دریا بی بی خود کو کاموں میں لگائے رہی، لیکن اس کا دھیان آپس کی اس

بات چیت میں بالکل نہیں تھا۔ بید کی ایک ٹوکری ٹوٹ گئی تھی وہ ہاشو کے ساتھ اس کی مرمت کرنے بیٹھ گئی۔

''بوبو، اللہ تعالیٰ کے فضل سے تمہاری تندرستی اچھی ہے۔ موٹی ہو رہی ہو تم۔'' ہاشو نے کہا۔''

دریابی بی نے جلدی سے اپنے سراپے پر نظر ڈالی کہ وہ اچھی طرح ڈھکی ہوئی ہے کہ نہیں اور بولی۔''سب کہتے ہیں تو ٹھیک ہے لیکن کسی کو نظر نہیں آیا کہ اس نے کنول گٹے کھا کھا کے دانت کالے کر لئے ہیں۔''

ہاشو گنگ ہو کے رہ گئی۔ دریابی بی کی آواز میں نرمی کا شائبہ تک نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا۔ جیسے لڑ رہی ہو۔

ہاشو نے سکھ کا سانس لیا جب اس نے اپنی ساس کو پکارتے سنا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دریابی بی ہاشو سے خفا ہو۔ سہمی ہوئی ہاشو نے آہستہ سے کہا''بوبو، میں اب چلتی ہوں۔''

دریابی بی بیٹھی ایک بانس چیرتی رہی اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے شاید ہاشو کی بات سنی ہی نہ تھی وہ اپنے کام میں اس طرح مصروف تھی۔ قصور وار سی ہاشو رخصت ہو گئی۔

اسی دن سہ پہر کو یعقوب اپنے بیٹے کے ساتھ آ گیا۔ لڑکے کو وہ دریابی بی کے پاس چھوڑ کر دو چار روز میں آنے کا کہہ کر خود چلا گیا۔

یعقوب سارے گھر کے لئے جنس لے کر آیا تھا۔ اس بارے میں دریابی بی کو کوئی فکر نہ تھی۔ اس کا اپنا بچہ، آج ہی گیا تھا اور اس پر کسی اور کے بچے کا بوجھ لاد دیا گیا تھا۔ لڑکا تیز تھا اور باتیں اچھی کرتا تھا۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے دریابی بی نے یعقوب کی گھریلو زندگی کے بارے میں اس سے ڈھیروں سوال پوچھے۔

''دو مائیں ہیں تمہاری۔ ہے نا؟''

''ہاں، چاچی، میں بڑی ماں کا بیٹا ہوں۔ ہم دو بھائی ہیں۔''

''تمہاری چھوٹی ماں کیسی ہیں؟''

''وہ میرے اماں ابا سے لڑتی رہتی ہیں۔''

MashalBooks.org

''تم سے بھی لڑتی ہیں کیا؟''

''جی، آج ہی ایک بات پر نصیحتہ ہوگیا۔ اسی لئے ابا مجھے اپنے ساتھ لے آئے۔''

''کیا لڑائی ہوئی تھی؟''

''لڑائی تو روز ہی ہوتی ہے۔ اسی لئے آج کل ابا گھر پر نہیں رہتے۔''

''کہاں رہتے ہیں پھر؟''

''باہر والے مکان میں سوتے ہیں۔ طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ کمزور ہو گئے ہیں۔''

لڑکے کو ساتھ لٹا کے دریا بی بی نے اور معلومات اکٹھی کیں۔ یعقوب کا گھر جہنم تھا۔ دیہات کے لحاظ سے وہ خوش حال تھی۔ اسی لئے کھانے پکانے کے علاوہ کوئی خاص کام نہ تھا۔ اپنے روپے پیسے اور گہنے لتے کے زعم میں وہ ہمیشہ لڑتی رہتیں۔

دو چار دن بعد یعقوب نے کہا ''دریا بی بی، میں لڑکے کو تمہارے پاس چھوڑنا چاہتا ہوں۔ اپنے گھر میں تو یہ کبھی ڈھنگ سے بڑا نہیں ہو پائے گا۔

امجد وہیں سامنے کھڑا تھا۔ دریا بی بی کو جواب دینا ہی تھا۔

''یہاں بانس کی اس جھونپڑی میں کیوں؟ جب کہ تمہارا اپنا پکا مکان ہے؟''

''ان کی مائیں ان کا ناس مار ڈالیں گی۔ وہاں سارا دن سوائے بک بک جھک جھک کے اور کچھ نہیں ہوتا۔''

دریا بی بی نے کوئی جواب نہ دیا۔

یعقوب بیٹے کو لے کر چلا گیا۔ امجد کی اس لڑکے سے دوستی ہوگئی تھی۔ وہ انہیں چھوڑنے گیا۔ ذرا دیر بعد پلٹا اور بولا ''ماں، تمہیں وہ یہ پندرہ روپیہ دے گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے دینا بھول گئے تھے۔

منی صرف دو روپیہ لے کر گیا تھا۔ اب صبح پیسے بھیجنا پڑیں گے۔ دریا بی بی اسی ادھیڑ پن میں رہی۔

MashalBooks.org

اکتالیسواں باب

کڑے دنوں کو، پورا زور لگا کر، دھکیلنا پڑا۔ ذرا سی لاپروائی یا سستی کی تو گنجائش ہی نہ تھی چاہے اپنے بدن کی رگیں ہی باغی نہ ہو جائیں۔ چڑھائی کے موڑوں پر بوجھ ہیبت بن کر مشقت کرتے ہاتھ پیروں پر طعنہ زنی کرتا۔ اور جو کہیں وادی میں طوفان اٹھ کھڑا ہوتا تو بیچارگی اور مایوسی بادلوں کی گرج گونجتی۔

دریا بی بی ایسی چوٹی پر آ پہنچی تھی جہاں جنگل شکار خوروں سے اٹے تھے۔ اتھاہ گھائیاں تھیں۔ جہاں پانی پیاس نہ بجھا پاتا تھا۔ نہ ٹھنڈی ہوا تھکن کو کم کرتی تھی۔

''ماں''

آنگن کی طرف پیٹھ موڑے دریا بی بی چاول بین رہی تھی۔ اس لئے اس نے نووارد کو نہ دیکھا۔ مڑی تو حیران رہ گئی۔ مناظر آیا تھا۔ کندھے پر ایک تھیلا اٹھائے وہ پسینہ سے شرابور تھا۔ سفر کی تھکن اسکی پھولی سانسوں سے عیاں تھی۔

''گرمی کی چھٹیوں میں ابھی تین مہینے ہیں۔ آج کل امتحان ہو رہا ہے۔ ایک ہفتہ کی چھٹی تھی۔ اس لئے میں چلا آیا۔''

''تم نے بہت اچھا کیا۔''

دریا بی بی نے مناظر کی قمیض اتاری اور اس کا پسینہ پونچھا۔ آوازیں سن کر امجد بھی آ گیا اور مناظر کو بید کا مونڈھا بیٹھنے کو دیا۔

دریا بی بی کھل اٹھی۔ اس نے چاول چڑھائے۔ وہ سب دوپہر کا کھانا ذرا دیر پہلے ہی کھا چکے تھے۔ اس لئے چاولوں کی دیگچی خالی تھی۔ امجد اپنے جیب خرچ کو کبھی کبھار ایک دو انڈے چھپا کر رکھ لیتا تھا۔ وہ ایک انڈا لے آیا۔

''انڈا کہاں سے ملا تمہیں؟'' دریا بی بی نے پوچھا۔

''لال والی مرغی جب جی چاہے دے دیتی ہے۔ کل گایوں کے باڑے میں مچان

پہ دیا تھا۔ میں تمہیں بتانا بھول گیا۔''

چیزوں کا دھیان کرنے کی ہوشیاری پر دریا بی بی اپنے بیٹے سے خوش ہوئی۔

وہ تو دال اور آلو کی بھجیا کا سوچ رہی تھی۔ اب یہ ایک انڈا مل گیا تھا تو کھانا پورا ہو جائے گا۔

مناظر تالاب پر نہانے چلا گیا۔ موج میں آ کر بہن بھائی سے خوب شیخیاں بگھاریں۔ مٹی کی دو چار گڑیاں نکال کر نعیمہ اور شری کو دیں۔ جو مارے خوشی کے کھل اٹھیں۔ امجد کے لئے اس نے لٹوؤں کی ایک بڑھیا جوڑی نکالی۔ جو اس تجویز پر اچھل پڑا کہ دونوں بھائی ان سے کٹھل کے پیڑ تلے کھیلا کریں گے۔

دریا بی بی کے لئے یہ سہ پہر گیت بن کر گزری۔ ایک مدت سے وہ بچوں کے ساتھ اس طرح خوش نہ ہوئی تھی۔ بڑے چاؤ سے وہ شام کا کھانا پکانے بیٹھی۔ امجد امیرن کے یہاں سے ایک کدو مانگنے گیا۔ اس نے اس کے ساتھ پکانے کو ایک مرغی بھی دے دی۔ دریا بی بی نے کدو اور مرغی پکانے میں اپنی ساری مہارت صرف کر دی۔

کھانا کھا کے وہ سب دالان میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ مناظر کو بھی کوئی گھبراہٹ نہ تھی۔ یہ ماحول اس کے لئے اب نامانوس نہیں تھا۔ دریا بی بی بھی بچوں کی اس ہڑدنگ میں بے تکلف شامل ہو گئی۔

دوسرے دن امجد اور مناظر دریا کے کنارے، کھیتوں میں۔ جھاڑیوں اور جنگلوں میں یونہی گھومتے پھرے۔ اس طرح کی آزادی امجد کو دل سے پسند تھی۔ لیکن اپنے طور پر وہ بودا اور شرمیلا تھا۔ مناظر کے ساتھ وہ اپنی بے ہمتی پر قابو پا لیتا۔ اس وقت وہ اور بھی خوش تھا کہ ماں کا مزاج ہنسی اور بے فکری کا تھا۔

مناظر نے چھوٹے بھائی سے پوچھا۔ ''امو، میرا خیال ہے ماں موٹی ہو رہی ہیں۔''

''ہاں، منی بھائی، مجھے لگتا ہے ان کی طبعیت اچھی نہیں۔''

''نہیں، ان کا قد کاٹھ میرا سا ہے۔''

''یہ سچ ہے۔ تم بڑے ہو کر چندر کاکا کی طرح چوڑے چکلے ہو گے۔''

''ہاں، شاید اسی وجہ سے میں اب تک بچا ہوا ہوں۔ ہوسٹل میں جس طرح کا کھانا

ملتا ہے اس سے تو میں بیمار پڑ چکا ہوتا۔''

اپنے بھائی کی مردانگی پر ناز کرتے ہوئے امجد نے تجویز پیش کی۔''شاکر چچا سے لٹھ بازی سیکھنا چاہتے ہو۔''

''سیکھونگا، جب میں گاؤں واپس آؤں گا۔ ہوشیار ہو جاؤں گا میں اس میں۔'' مناظر نے اس کو اپنے بازوؤں کے پٹھے دکھائے۔

وہ دونوں دریا کے کنارے ایک جگہ کھڑے تھے۔ چیت کا مہینہ تھا اور دریا سوکھا پڑا تھا۔ دریا کے دونوں کناروں پر ریت کے ٹیلوں پر نرسل اگ آئے تھے۔ وہ دونوں بڑی دری سے بے فائدہ سارس کے گھونسلے ڈھونڈھ رہے تھے۔ چالتا کے ایک موٹے تنے سے ٹیک لگائے دونوں نکھرے آسمان کو دیکھے جا رہے تھے۔ دھوپ میں کھیت چمچمارہے تھے۔ ہوا کی گہری سانسوں میں ناریل کے ایک اکیلے پیڑ کا لرزتا بدن شامل ہو گیا تھا۔ اپنی باتوں کے دوران، ان دونوں دیہاتی لڑکوں کو یہ احساس ہوا کہ دنیا کتنی وسیع ہے۔

بھوک لگی تو سیر کا مزہ غائب ہوا۔ گھر پہنچے تو دیکھا یعقوب پھر آیا ہوا تھا۔ ماں نے تو نہیں بتایا۔ امجد نے بتایا کہ اس آدمی نے پچھلے تین چار برس میں ان لوگوں کی بہت مدد کی ہے۔ مناظر غیر لوگوں سے بہت شرماتا تھا۔ وہ اپنے طور پر خود کبھی بات چیت نہ کر پاتا۔

جب بچے شام کا کھانا کھانے بیٹھے تو دریا بی بی ہاتھ باندھے غلام کی طرح اپنا فرض نبھاتی رہی۔ اتنی سنجیدہ فضا بدلنے کی خاطر امجد نے مناظر کے مذاق کیا اور ڈانٹ کھائی۔ پھر ان کا سارا دھیان بس کھانے ہی کی طرف رہا۔

صرف دو ہی تو کمرے تھے۔ تو یہ انتظام کیا گیا کہ ایک کمرے میں امجد یعقوب کے ساتھ سو جائے اور دوسرے میں مناظر ماں، نعیمہ اور شری کے ساتھ سو جائے گا۔

مناظر کی ماں سے کچھ زیادہ بات چیت نہ ہوئی۔ یہی سوچ کر کہ وہ سارا دن کتنا تھکی ہوگی، وہ بھی پڑ کے سو گیا۔

دریا بی بی دیر تلک جاگتی رہی۔ گرمیاں تھیں پھر بھی وہ گھٹنوں تک رضائی اوڑھے تھی۔ کھڑکی کے باہر آسمان پر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔

اسے کسی طرح نیند نہ آئی۔ سب کو سوتا دیکھ کر دریا بی بی نے آہستہ سے دروازہ کھولا

اور باہر صحن میں چلی گئی۔ کھڑکی کے پاس چاندنی، کٹھل کے پتوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ دو چار دھندلے تارے آسمان پر چمک رہے تھے۔ دریا بی بی بڑی دیر تک کھڑی رہی۔ ایک آدھ چڑیا کی آواز اور کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آواز، سوئے ہوئے گاؤں کے سناٹے کو توڑتی تھی۔

دریا بی بی خوش دلی سے شاید وہاں ہمیشہ ہی کھڑی رہتی۔ مگر اچانک چاندنی کے آر پار سایہ پڑا۔ کانپتے ہوئے وہ آنگن کی طرف بڑھی اور دیکھا کہ یعقوب اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جیسے اس پر جادو ہو گیا ہو، دریا بی بی اپنی جگہ پر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

''تم نہیں جانتیں دریا؟''

اتنے میں اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

شاید آپس میں کشمکش شروع ہو جاتی کہ اتنے میں مناظر نے کھڑکی سے سر نکال کر کہا ''ماں تم باہر اتنی دیر تک اکیلی کیا کر رہی ہو۔ مجھے کیوں نہیں بلا لیا؟''

''میں آ رہی ہوں، بیٹا۔ تم سو رہے تھے اس لئے میں نے تمہیں نہیں بلایا۔''

چوروں کی طرح یعقوب اندھیرے کی طرف کھسک گیا۔ لیکن اس کا لمبا سایہ چاندنی کی نظر سے نہ بچ سکا۔

دھڑکتے دل سے دریا بی بی کمرے کی طرف لپکی اور فوراً دروازہ بند کر لیا۔ مناظر ابھی تک کھڑکی سے لگا کھڑا تھا۔ اس نے کہا ''ماں شاید چور تھا کوئی۔ میں نے کٹھل کے پاس سایہ سا دیکھا تھا۔''

''نہیں'' دریا بی بی نے اندھیرے میں کہا ''اب سو جاؤ۔''

''اچھا، مگر تم رات برات اکیلی باہر مت نکلا کرو، ماں۔''

''چوروں کے لئے ہمارے پاس کیا دھرا ہے؟'' دریا بی بی بولی۔

مناظر کچھ دیر چاندنی کو دیکھتا رہا اور پھر دوبارہ سو گیا۔

دن بھر کی تھکن اور پریشانی کے مارے جاگتی دریا بی بی کی آنکھ صبح ہونے سے ذرا پہلے ہی لگی۔ اور زندگی میں پہلی دفعہ مرغ کی بانگ سے وہ نہ جاگی۔ جانے وہ کب تک سوتی رہتی کہ امجد اسے پکارتا ہوا دھڑ سے کمرے میں آیا۔

MashalBooks.org

''ماں، ماں''

نیند بھری آنکھیں لئے دریابی بی خفگی سے بولی، ''کیا ہے؟''

''منی بھائی کے کپڑے کہاں ہیں؟''

''وہاں بانس کی کھونٹی پر''

''وہاں نہیں ہیں۔''

دریابی بی نے آنکھ کھول کر دیکھا۔

''تمہارے کمرے میں نہیں ہیں وہ؟''

''نہیں، یعقوب چاچا تو سویرے سویرے ہی چلے گئے۔''

رضائی اپنے گرد لپیٹ کر دریابی بی آنکھیں ملتی اٹھ بیٹھی۔ مناظر کا تھیلا اور کپڑے کھونٹی پر نہیں تھے۔

''جاؤ جا کے تالاب پر دیکھو۔ وہیں ہوگا۔''

جیسے ہی امجد گیا دریابی بی ساتھ کے کمرے میں گئی او ر دیکھا کہ مناظر کی کتابیں بھی وہاں نہ تھیں۔

دریابی بی شاید بے ہوش ہو جاتی۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ نہیں بے ہوش ہونا اس کے حق میں اچھا نہ ہوتا۔

صدمہ کو سہہ جانے کی خاطر، اس نے اپنا چکراتا سر دونوں ہاتھوں سے تھاما اور دالان میں کسی نہ کسی طرح بیٹھ گئی۔ اپنے حواس قائم کرنے میں اسے تھوڑی دیر لگی۔

MashalBooks.org

بیالیسواں باب

ایک رات چندرامنی راجندر کے ساتھ گاؤں چھوڑ گئی۔ کوئی ایک مہینہ سے چندر بھی ملنے نہ آیا تھا۔ امجد اس سے ملنے گیا مگر وہ بہت بدل گیا تھا۔ وہ اب بھی پیتا تھا۔ مگر بالکل خاموشی سے۔ نہ غل غپاڑہ کرتا نہ گاتا۔ چندرامنی کے دونوں بچے ماموں کے پاس تھے۔

دریا بی بی نے ہاشو اور امیرن سے یہ قصہ سنا، لیکن کچھ کہا نہیں۔ امجد کو چندر کے پاس بھیجنا بے سود تھا۔ اسے اپنی ہی پریشانیوں نے پاگل کر رکھا تھا۔ دریا بی بی کو چندر کی بدنصیبی کا بہت افسوس تھا۔ پر کوئی کر بھی کیا سکتا تھا؟ ساری عمر بھائی پر بوجھ بنے رہنے کے بجائے چندرامنی کسی اور کا آسرا ڈھونڈھ لیا تھا۔ آخر دنیا کا کیا جاتا تھا؟

ایک شام دریا بی بی چندر کے ہاں جانا چاہتی تھی۔ امجد کا بھی جی چاہ رہا تھا۔ مگر جیسے اس کا اشتیاق ماند پڑ گیا ہو۔ پگلے چندر کے گھر جانے کو کس کا جی نہ چاہتا تھا؟ اظہر جیسا کڑا انسان بھی چندر کو ماننے لگا تھا۔ لیکن یہ خیال اس نے اظہر کی زندگی میں کبھی ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہاں کبھی نہیں جائے گی وہ۔ اس نے خود کو سمجھایا۔ گاؤں کی ریت میں ایک فرد کی رسوائی سارے گھرانے کو نیچا کر دیتی تھی۔

ایک مہینہ بعد امجد ماں کے پاس آیا اور بولا۔ ''ماں، منی بھائی کے پیسے واپس آ گئے۔ یہ دیکھو''

''پیسے واپس کیوں آ گئے؟''

''ڈاکیہ کہہ رہا تھا منی بھائی وہاں سے چلے گئے ہیں۔''

''چلے گئے ہیں۔'' دریا بی بی منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ لیکن بیٹے سے اور کچھ نہ کہا۔ پیسے ہاتھ میں لئے وہ پتھر کی مورت بنی بیٹھی رہی۔ ایک پاک دامن بیٹا آبرو باختہ ماں سے کچھ کیسے لے سکتا ہے۔''

امجد ہاشو کو پہلے ہی بتا آیا تھا، ڈاکیہ اس کے گھر کے پاس ہی تو ڈاک بانٹ رہا تھا۔

MashalBooks.org

ہاشو آئی۔ مگر روہانسی دریابی بی کو دیکھ کر کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ خاموشی سے اس کے پاس بیٹھ گئی۔ دریابی بی کا چہرہ آہستہ آہستہ اور بھی اداس ہوتا گیا۔ اس کے گورے بھرے بھرے گالوں پر آنسو بہنے لگے ہاشو نے امجد سے کہا ''بیٹا، تھوڑا سا پانی لا دو۔''

امجد نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔

دریابی بی کے آنسو پونچھتے ہوئے ہاشو بولی۔ ''بوبو، وہ لڑکا تو سیلانی ہے پھر واپس آجائے گا۔ لڑکوں کے لئے کوئی فکر تھوڑی ہی کرتا ہے۔''

دریابی بی نے کچھ جواب نہ دیا۔ ہاشو نے ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔

''شام ہونے کو ہے۔'' وہ بولی۔ ''تمہیں بہت سا کام نمٹانا ہے۔ چلو اٹھو۔''

آنگن میں کچھ بطخیں اور مرغیاں جنہیں شام کا دانہ نہ ملا تھا۔ چیخ چیخ کے بہرا کئے دے رہی تھیں۔

''اگر تم نہیں اٹھو گی تو میں بھی گھر نہیں جاؤں گی۔ ہاشو بضد رہی۔ ''تمہارا بیٹا تمہارا ہی رہے گا۔''

دریابی بی کے آنسو خشک ہو گئے تھے وہ اپنی سوچوں میں گم بیٹھی تھی۔ وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے ایسی جمی بیٹھی تھی جیسے بے حرکتی نے عورت کا روپ دھار لیا ہو۔

اس کا ہاتھ پکڑ کر ہاشو بولی۔ ''اٹھو۔ تمہاری اپنی طبیعت اچھی نہیں لگتی۔ تمہارا چہرہ سارا سوجا ہوا ہے۔ اگر تم ایسے ہی کرتی رہیں تو تمہاری صحت کب تک ساتھ دے گی؟''

''میں اٹھتی ہوں۔ تم اب گھر جاؤ۔'' دریابی بی نے رسانی سے کہا۔

''پہلے تم''

''میں اٹھ رہی ہوں۔ اب جاؤ تم۔''

''اچھا میں آنگن کے سرے تک پہنچ کے مڑ کے دیکھوں گی۔ اگر تم نہ اٹھیں تو میں پلٹ آؤں گی۔'' ہاشو نے ویسا ہی کیا جیسا کہا تھا۔ مگر دریابی بی واقعی اٹھ کھڑی ہوئی اور بطخوں اور مرغیوں کو دانہ دینے لگی۔

MashalBooks.org

تینتالیسواں باب

شاکر نعیمہ کو ضلع ہسپتال میں دکھانے لے گیا۔ اس کی بینائی بہت کم ہوتی جا رہی تھی۔ صبح کے وقت اس کی آنکھوں سے اتنی پیپ بہتی کہ وہ انہیں کھول نہ پاتی۔ دریا بی بی شاکر سے مدد مانگنے گئی۔ چندر نے تو مہینوں سے ادھر پیر نہ رکھا تھا۔ ہسپتال کے ڈاکٹر نے دوا تو لکھ دی تھی۔ مگر علاج یقینی نہ تھا۔ دریا بی بی نے ڈاکٹر کی رائے سنی مگر اس کو بہت زیادہ اہمیت نہ دی۔ اندھوں کے لئے وقت نہیں ٹھہرتا۔ ان کے دن بھی کٹ جاتے ہیں۔

پچھلے چند مہینوں سے دریا بی بی بہت خاموش اور سنجیدہ رہنے لگی تھی۔ اپنا کام کاج اسی ذمہ داری سے کرتی۔ لیکن سست رفتاری سے۔ جیسے اس کا دھیان کہیں اور رہوا اور کام کی حیثیت فرض کی ادائیگی سے زیادہ نہ ہو۔ اب وہ بچوں پر بھی خفا نہ ہوتی۔ شرمی اسے تنگ کرتی بھی تو ٹال دیتی۔ امجد کو اس کی اس حالت سے بھی ڈر لگتا جیسے وہ پہلے اس کی بدمزاجی سے خوف کھاتا تھا۔ اگلے دن ہی اس کی پرانی لنگی اور قمیض کھو گئی تو اس نے ماں کو بتایا۔ اس نے بس اتنا ہی کہا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

ڈانٹا نہیں۔ جیسے وہ ڈانٹنا بھول گئی ہو۔ امجد کو یہ صورت حال عجیب سی لگی اگر امیرن آتی تو دریا بی بی ذرا بشاش ہو جاتی ہاشو کا تو آنا برابر تھا وہ ہاشو سے ایک آدھ بات کر لیتی وہ بے چاری گھنٹوں ٹھہرا کرتی۔ باتونی تو دریا بی بی کبھی بھی نہ تھی پر اب جیسے ساری باتیں ہی ختم ہو گئی تھیں۔

ایک دن صبح کو یعقوب بڑے شاہانہ تحفے لے کر آیا۔ دریا بی بی کو بچوں کے سامنے فضیحتہ کرنا اچھا نہ لگتا تھا۔ اس لئے خاموشی سے ان سب کو ایک طرف رکھ دیا۔

یعقوب فوراً ہی امجد کے کمرے میں لیٹنے چلا گیا۔ اس کی آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں۔

ایسا لگتا تھا جیسے اس کا خون نچڑ گیا ہو۔

MashalBooks.org

ذرا دیر بعد دریابی بی امجد کے کمرے میں گئی۔

''سو رہے ہو؟''

یعقوب سے اس نے صحیح معنوں میں یہی پہلا سوال پوچھا تھا۔ وہ چادر سے منہ ڈھانپے لیٹا ہوا تھا۔ جیسے دن کی روشنی میں منہ دکھاتے ڈرتا ہو۔

منہ کھولتے ہوئے یعقوب نے دریابی بی کو دیکھا۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

''تم نے کچھ کہا؟''

کچھ کہے بغیر دریابی بی نے چاندی کے پندرہ سکے نیچے رکھ دئے۔''اب یہ پندرہ روپے دینے کی تمہیں ضرورت نہیں۔''

''کیوں نہیں؟''

یعقوب کا چہرہ پھیکا پڑا ہوا تھا۔ بخار سے اس کی ہڈیاں چیخ رہی تھیں۔

کمرے سے جانے کو، جیسے ہی دریابی بی مڑی، یعقوب نے گورکنارے بیمار کی سی بھاری آواز میں پکارا۔''سنو''

منہ پھیرے بغیر وہ ذرا سا مڑی اور بولی''کیا ہے؟''

''ایک ہفتہ سے بخار ہے۔ میں ذرا آرام کرنے آیا ہوں؟''

''تو ہم کون سے تمہارے کپڑوں کو آگ لگائے دے رہے ہیں؟ لگا رہے ہیں کیا؟'' دریابی بی نے کٹھور ہو کر کہا۔

''نہیں، یہی کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ تم نے اس دکھ میں مجھے پناہ دی ہے۔ میرے لیے تو میرے گھر میں بھی جگہ نہیں۔ میری طبیعت بھی اچھی نہیں۔ اگر تم یہ روپئے واپس لے لو تو میرا دکھ کم ہو جائے گا۔''

''ہمیں ضرورت نہیں پیسوں کی۔''

''نہیں؟''

''نہیں۔'' دریابی بی نے کہا۔''سا گودانہ کھاؤ گے تھوڑا سا؟''

''ہاں'' یعقوب کی آواز ایسی تھی جیسے تکلیف کی چیخ ہو۔

MashalBooks.org

اس بات کا انتظار کئے بغیر کہ مریض کو کچھ اور چاہئے تھا یا نہیں دریا بی بی جلدی سے باہر چلی گئی۔

ماں کی سرگرمی دیکھ کر آج امجد کو حیرت ہوئی۔ کئی طرح کی مچھلی تھی۔ یعقوب گھی کے علاوہ دو چار سیر بکرے کا گوشت اور ترکاری بھی لایا تھا۔ بڑے ہی دل سے دریا بی بی نے کھانا پکانے میں اپنی ساری مشاقی صرف کر دی۔ جیسے اپنے سے کہیں کم تر دشمن پر فتح پا کے اترا رہی ہو۔ کھانا کھاتے وقت بھی اشتیاق میں کمی نہ تھی۔ امجد نے ماں کو کبھی اس اشتہا سے کھاتے نہ دیکھا تھا۔ کھانا بہت بڑھیا تھا۔

اس ضیافت کے بعد تھوڑا سا سستا کر یعقوب کے کمرے میں ساگودانہ لے کر گئی تو وہ سو رہا تھا۔ بستر کے ایک طرف پیالہ رکھ کے دریا بی بی نے اسے دیکھا۔ ابھی تک اس نے اس کا چہرہ نظر بھر کے نہ دیکھا تھا۔ مرجھائے ہوئے پودے کی طرح وہ گھل گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اس کی حالت زار کی گواہی تھے۔

کھڑے کھڑے دریا بی بی نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ بے چارہ آدمی واقعی تکلیف میں تھا۔ ایک ہفتہ سے وہ بخار سے تپ رہا تھا اور اس حالت میں اپنے گھر سے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ اسے بڑا تیز بخار تھا۔ شاید آخری بار۔ اظہر کی زندگی کے آخری دن اس کے ذہن میں کوند گئے۔

یعقوب چین سے سو رہا تھا۔ یا آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ کون جانے؟ دریا بی بی کے دل میں ترس جوش مارنے لگا۔ یہ شخص اتنی دور سے کشتی پر آیا، میل بھر پیدل چلا اور اس حالت میں ابھی تک بے کھائے پیئے تھا۔ کیا دریا بی بی اب بھی متاثر ہوئے بغیر رہ سکتی تھی۔ اس کا جی چاہا اس کی آنکھ کھل جائے اور وہ ساگودانہ کھالے۔ وہ جگانے ہی کو تھی مگر یکا یک ٹھہر گئی۔ جیسے کسی نے اس کا گلا دبوچ لیا ہو۔

تکلیف میں مبتلا ایک شخص پناہ لینے اس کے دروازے پر آیا تھا۔ دریا بی بی کے دل سے ساری نفرت ڈھل گئی۔ اس نے یعقوب کو دیکھا۔ اس کا بدن ٹھیک سے ڈھکا ہوا نہ تھا۔ ایک طرف سے اس کا سینہ کھلا تھا اور گھٹنوں سے نیچے اس کی ٹانگیں بھی کھلی تھیں۔ اگر وہ ٹھیک سے اوڑھے لپیٹے نہ ہوا تو اس کا بخار تیز ہو سکتا ہے۔

MashalBooks.org

دریابی بی دھیرے سے آگے بڑھی اور بخار دیکھنے کو اسے چھوا۔ اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ اس کو تیز بخار تھا۔ اس نے احتیاط سے اسے چادر اڑھائی۔ ابھی اس نے چادر ہاتھ سے چھوڑی نہ تھی کہ یعقوب نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ دریابی بی اس طرح کانپ گئی جیسے بام مچھلی کے سوراخ سے اسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ تیزی سے وہ کمرے سے نکل گئی۔

''ساگودانہ پلنگ پر رکھا ہے۔ اٹھ کے کھالو۔'' اس نے کہا۔

یعقوب نے آنکھیں بند کر لیں شاید پھر سے سونے کو۔

MashalBooks.org

چوالیسواں باب

بخار کم نہ ہوا۔ یعقوب کے گھر سے لوگ پوچھنے کو آئے۔ سب سے نزدیکی ڈاکٹر دس میل دور رہتا تھا۔ یعقوب کو دوا علاج کی پرواہ نہ تھی۔ سو وہ واپس چلے گئے۔

تین دن بعد دریا کے گھاٹ سے خبر ملی کہ دو کشتیوں میں بھر کے یعقوب کی بیویاں آئی ہیں۔ اب گھر واپس جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا او رایسا ہی ہوا۔ یہ اس کا آخری پھیرا تھا۔ وہ بخار سے مرا نہیں۔ لیکن وہ پھر کبھی موہیش ڈنگا نہیں پلٹا۔

دو تین مہینہ بعد، جان لیوا افلاس بھوک او ربے چینی کے راستے پر اندھیرے میں کھیلتی وہ رات آئی۔ دریا بی بی کو اندھیرے کی ضرورت تھی۔ دریا بی بی نے اللہ تعالیٰ کے شکرانے میں ہاتھ جوڑ دیئے۔ کیا ہوتا اگر دن کی بھری روشنی میں ایسا ہو جاتا۔ لوگوں کے سامنے، بچوں کے سامنے؟ اللہ تعالیٰ تو کتنا مہربان ہے۔ ہزاروں شکر اس قدر مہربانی کے لئے۔''

موہیش ڈنگا پر رات کے سیاہ پر پھیلے ہوئے تھے۔ چاروں طرف نیند کا راج تھا۔ شاید رات کے پرندے جاگ رہے تھے۔ اور ان کی طرح دریا بی بی بھی۔

دریا بی بی جاگ رہی تھی۔ وہ اٹھی اور ہاتھ میں لیمپ لئے دالان میں کھڑی ہوگئی۔ ہلکی ہوا میں لیمپ کی لو تھرتھرانے لگی۔ ذرا دیر پہلے اس نے دروازہ باہر سے بند کیا تھا۔

امجد، شری او رتقریباً اندھی نعیمہ تینوں سو رہے تھے۔ اس نے کان کھڑے کئے اور بچوں کی سانس کی آواز سننے لگی۔ اس کے لئے اب زیادہ ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔

سانس روکے دریا بی بی باورچی خانے میں داخل ہوئی او راندر سے دروازے کا کھٹکا لگا دیا۔ اس نے دروازہ کھینچ کر دیکھا کہ وہ اچھی طرح بند ہوگیا ہے یا نہیں۔ پھر لیمپ نیچے رکھ کر اس نے چٹائی بچھا دی۔

اس کا سارا بدن لرز رہا تھا۔ مگر درد کی ٹیسوں میں بھی اس نے اف تک نہ کی۔ سارا

MashalBooks.org

بوجھ اس کی ذات پر تھا۔ اس کی مدد کو کوئی نہیں آئے گا۔

جیسے ہی اس نے چٹائی بچھائی اور پھٹا پرانا کرتا اتارا درد کی ایک لہر سے اسکا پورا بدن لرز گیا۔ اس نے جلدی سے کمر سے ساڑھی ڈھیلی کی تو کپڑوں کا ایک ڈھیر نیچے گر پڑا جس میں نعیمہ کی لنگی اور امجد کی قمیض بھی تھی۔ منتظر ماں کا پھولا ہوا پیٹ لیمپ کی روشنی سے جاگا نہیں۔ اس میں بھی اندھیری جگہ گوشہ عافیت میں حیرتوں کی حیرت لیٹی تھی۔ انسان کا بچہ۔ دریا بی بی نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ اسے امیرن کا کہنا یاد آیا ''بوبو بدن تو پھٹا پڑ رہا ہے۔ کاش پھٹ ہی پڑتا۔ کیسی خوشی کی بات ہوتی۔ دریا بی بی نے سکھ کا سانس لیا۔ ابھی تو بہت کچھ کرنے کو تھا۔ کوکھ کی اندھیرے میں باہر آنے کو بے تاب بچہ چاہے کتنا ہی چلائے، دریا بی بی کی زندگی بھر فرض نبھانے کی ریاضت میں کمی نہ ہوسکتی تھی۔ اس نے دیوار میں لگے تختے پر سے نہالچے اور چھوٹی رضائیاں اتاریں اور انہیں چٹائی کے ایک کنارے رکھ دیا۔

پیٹھ کے بل لیٹ کر اس نے زور سے چٹائی پکڑ لی۔۔ کاش اسے ذرا سا چیخ لینے کی آزادی ہوتی۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کہ بچے جاگ نہ جائیں اس نے انہیں دن میں سونے نہ دیا تھا۔ اور امجد کو سارا دن کام پر لگائے رکھا تھا۔ دریا بی بی جانتی تھی کہ تھک ٹوٹ کر بڑی گہری نیند آتی ہے۔ اب پہلی دفعہ درد کے مارے دریا بی بی کا چہرہ بگڑ گیا۔ اس کے ہاتھوں سے چٹائی پھسل گئی اس نے ہاتھ پھیلا کر کچے فرش پر جما دئے۔ اپنی ماں کے سوا زمین کی بیٹی کو اور کہاں سے طاقت مل سکتی تھی؟

جان لیوا درد بھی دریا بی بی کو بے ہوش نہ کر سکا۔ وہ نامانوس مہمان کی ذلت گوارا نہ کر سکتی تھی۔ ایک ہاتھ پیچھے کئے وہ اس احتیاط میں تھی کہ کہیں نووارد زمین پر نہ پھسل پڑے۔

دریا بی بی کی آنکھوں میں اب کوئی سوال نہ تھے۔ اور ہمیشہ سے پیدا ہونے والے بچے، آنے میں ذرا جلدی کرلے۔ اتنے درد اور کرب میں بھی تیری ماں تیرے آنے کے انتظار میں ہے۔ کتنی شرم، کیسی ذلت اور ساری دنیا کی طعن و تشنیع میرا انتظار کر رہی ہے۔

اور میں تیری منتظر ہوں۔ اپنے آپ سے کئی مرتبہ لڑتے ہوئے یہ باوقار عورت ہار گئی تھی لیکن اس وقت وہ ایک ماں اور دایہ کی حیثیت سے فتح مند تھی۔ اس نے خود اپنے بدن کو زور زور سے ہلایا۔

MashalBooks.org

ایک گھر والے کی پیاری بیوی کی طرح وہ زیادہ دیر زچگی سے نہیں گزر سکتی تھی۔ ماں اور دایہ دونوں وہی تو تھی۔ اس نے ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔

چھوٹے سے باورچی خانے میں بچے کی بے کس سی چیخ نے خطرے کی گھنٹی سی بجا دی۔ مٹی کا کونڈا اور پانی تیار تھا۔

دریا بی بی نے بچے کو کلیجے سے لگالیا۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہتی اگر بچے کی چیخ اسے ہوش میں نہ لے آتی۔ اس اطلاع پر دریا بی بی نے بچے کو آنسو بھری شکر گزار آنکھوں سے دیکھا اور اسے کونڈے میں اچھی طرح نہلایا۔ بستر کے لئے اس نے کچھ پتلے نہالچے بچھائے دوسرے دو کپڑوں میں بچے کو لپیٹ دیا۔ اس کے اپنے کپڑے بے ڈھب سے ہو گئے تھے۔ اب اس نے اپنے آپ کو صاف کیا اور نئے مہمان کے سامنے اپنا سینہ کھول دیا۔ شیر خوار کے دودھ پینے کی کیسی انگیز آواز؟ کیسا گورا گول مٹول بچہ! دریا بی بی نے اسے اپنے لمس کی گرمی دی۔ بچے کو دیکھتے دیکھتے اچانک دریا بی بی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے ڈھلک پڑے اور اسے خبر تک نہ ہوئی۔ باہر دور کہیں لومڑیوں نے گھڑیال بجایا۔ دوالوؤں نے ایک دوسرے سے بحث کی اور پھر ایک ساتھ مل کر دونوں نے گھوگھو ہوہو کی۔

کیا بدن میں کہیں درد تھا، یا کوئی معذوری تھی؟ شاید نہیں، دریا بی بی سپاٹ چہرہ لئے بیٹھی رہی۔ ماں کی گود کی گرمی سے بچے کو نیند آ گئی۔ اس کے چہرے پر بھی کوئی کیفیت نہ تھی۔ باہر ساری دنیا سوئی پڑی تھی اور اندر باورچی خانے میں کیسا سکون تھا! بچہ اور ماں ایک دوسرے کی قربت میں دنیا سے بے نیاز ہو گئے تھے۔

کیا انسانوں کے لئے بھول جانا آسان ہوتا ہے؟ کہیں ایک مرغے نے بانگ دی۔ صبح ہونے کو تھی۔ دریا بی بی نے دل میں سوچا صبح ہونے کو ہے۔ ابھی ذرا دیر میں سورج نکل آئے گا۔

ایک اور مرغا بولا۔ ''شاکر کے گھر کی طرف سے اس نے یہ آواز سنی۔ اس نے بچے کو جیسے ہی لٹایا وہ کانپ سا گیا۔ اس نے کچی نیند میں خلل سے اپنے ہاتھ پیر ہلائے۔ اور ذرا دیر میں وہ پھر سکون سے سو گیا۔

پلک جھپکے بغیر دریا بی بی بچے کو دیکھتی رہی اور پھر اسے کئی بار چوما۔

MashalBooks.org

پھر وہ جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ کام میں سستی کے لئے اسے کبھی کوئی ٹوک سکتا تھا؟

صبح کی ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا چھت کے اس سوراخ میں سے آیا جو بانس کڑی کے پاس تھا۔ باہر ابھی تک اندھیرا تھا۔

مچان پر کھڑے ہو کر دریا بی بی نے چھت کی کڑی میں رسی باندھی۔ وہ صرف ماں اور دایہ ہی نہ تھی وہ ایک جلاد بھی تھی۔

وہ بچے کی طرف پلٹی وہ ابھی تک سو رہا تھا۔ ایک لڑکا۔ چپکے چپکے اسے دو چار پیار کر کے وہ کھڑی ہوگئی۔ وہ مرغے مرغیاں کتنی وفادار تھیں جنہیں دریا بی بی روزانہ اپنے ہاتھ سے دانہ کھلاتی تھی ممنون پرندے صبح کی شہنائی بجا رہے تھے۔

دریا بی بی نے اپنے آپ سے کہا۔ اب دیر کرنے کا موقعہ نہیں۔ اچانک اسے عاشق جان کا خیال آ گیا۔ بوڑھی عورت ،لٹھیا ٹیکتی چالیسویں کی فاتحہ سے کھانے کی پوٹلی لئے واپس آ رہی تھی۔

دریا بی بی نے پھندے کو دیکھا۔ روز بھر کی تھکن اور پریشانیوں کو سولی دے کر خود چین سے سو جانا چاہتی تھی۔

اس سے پہلے اس نے لیمپ کو پھونک مار کر کمرے سے اندھیرا کر دیا۔

MashalBooks.org

پینتالیسواں باب

سورج پیڑوں تک اونچا ہو گیا تھا۔ آسمان پر دھول چھا گئی تھی۔

آج ماں نے نہیں اٹھایا تو امجد نعیمہ اور شری پڑے سوتے رہے۔

وہ جاگے تو انہیں پتہ چلا کہ وہ کمرے سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ انہوں نے چیخنا، چلانا شروع کر دیا۔ شاکر کی ماں نے ہاشو کو بھیجا کہ دیکھ کر تو آئے۔ اس نے جا کر ان کے لئے دروازہ کھولا۔

باہر سے باورچی خانہ کھولنے کی ترکیب بھی اسی کو سوجھی۔ سب سے پہلے اس کی نظر نومولود بچے پر پڑی جو رنگا رنگ نہالچوں میں لپٹا ہوا تھا۔

پھر اوپر دیکھتے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔ خوف و ہراس کے اس عالم میں اس نے بچے کو نہالچے سمیت اٹھایا اور سینے سے لگا لیا اور پھر اسے کہیں لٹایا نہیں۔

ذرا سی دیر میں چھدری آبادی کے اس گاؤں کے ان جانے آنگن میں لوگوں کی تھوڑی سی بھیڑ جمع ہو گئی۔ رحیم بخش، روہنی چودھری چوکیدار شاکر امیرن اور بہت سارے۔ وہ بڑے امیر جنہوں نے غریب اظہر کے آنگن میں کبھی اپنے پیروں کی دھول نہ جھاڑی تھی وہ بھی آئے۔ وہ جو موت کے دروازے بھی سجائے رکھتے تھے انہیں ہی موت کی وجہ جاننے کی سب سے زیادہ کرید تھی۔ وہ اپنے تجسس کی تسکین کو آئے تھے۔

بچہ کو کلیجہ سے لگائے ہاشو گھر چلی گئی۔ شاکر نے بہت اعتراض کئے مگر ہاشو یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ وہ بچہ اس کے پاس نہ رہے۔ ہاشو کی مستقل مزاجی اور ہمت کے سامنے کوئی مخالفت نہ ٹھہر سکی۔ وہ کہتی تھی کہ اس سب میں بچے کا کیا قصور ہے۔

امیرن نے امجد، نعیمہ اور شری کو ٹھکانا دیا۔

دو چار مہینہ بعد مناظر آیا۔ اب وہ ایک جوان آدمی تھا۔ اسے پٹ سن کی فیکٹری میں نوکری مل گئی تھی۔ اب اس سے ایک سرکشی جھلکتی تھی۔

MashalBooks.org

امیرن اس کے ہاتھ پکڑ کر دیر تک زور زور سے روتی رہی۔ مناظر نے کہا کہ چاہے کام وہ شہر میں کرے لیکن موہیش ڈنگا اس کا گھر رہے گا۔

امجد کے ساتھ مناظر چندر کے گھر گیا۔ مناظر ایک ہفتہ کی چھٹی لے کر آیا تھا لیکن گاؤں سے جانے کو اس کا جی نہ چاہتا تھا۔

مناظر نے چندر سے پوچھا کہ'' کیا گاؤں کی اپنی سوانگ منڈلی بنائی جا سکتی ہے؟''

چندر نے کہا''لوگ اب گانا سننے کو تیار نہیں۔ گانے گا کے کسی کا پیٹ نہیں بھرتا۔''

مناظر کو مایوسی ہوئی۔ چندر نے بتایا گاؤں میں مستقل ملازمت نہیں ملتی۔

مناظر نے کہا''تو پھر شہر چلیں۔ تم وہاں جی لگا کر کام کر سکتے ہو۔ وہاں تمہاری بڑی آؤ بھگت ہو گی۔''

''سچ مچ؟''

''ہاں، کاکا، میں اپنے دوست سے کہوں گا تمہارے لئے ملازمت ڈھونڈھ دے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم کب جا رہے ہو؟''

''پرسوں۔ میں امجد کے لئے بھی کچھ نہ کچھ کام تلاش کرونگا۔''

''میں چلوں گا۔''

چندر کو نئی نئی چیزوں کو جاننے کا بڑا شوق تھا۔ پھر بھی وہ دیر تلک چپ تاڑ کے پیڑوں اور افق تک پھیلے کھیتوں کو دیکھتا رہا۔ رات کے بسیرے کے لئے چڑیوں کے جھنڈ کے جھنڈ اندھیرے کی طرف اڑ رہے تھے۔ چندر گاؤں کی فضا میں کھویا ہوا تھا۔ اس کا دل عجب طرح سے اداس تھا۔

اس نے پوچھا''کس وقت نکلو گے تم؟''ہم اسٹیشن اکٹھے چلیں گے۔''

جیسے وہ امجد اور منی کے ساتھ دنیا کے دوسرے سرے تک جانے کو تیار ہو۔ شام کے جھٹ پٹے کا وقت تھا۔

چاروں طرف ہلکا سا اندھیرا چھا رہا تھا ڈوبتے سورج کے رنگ بجھ رہے تھے۔ تین

سائے دریابی بی کی قبر کے پاس کھڑے تھے۔ انہیں پہچانا جا سکتا تھا۔ مناظر، امجد اور چندر۔

مناظر سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ وہ اب شہر میں رہتا تھا۔ پچھلے چھ مہینوں میں وہ پٹ سن کی فیکٹری میں کام کرنے والوں سے ملا جلا تھا۔ ان سے اسے ایک نئی بصیرت ملی تھی۔ اب دنیا کے متعلق اسے بہت کچھ پتہ تھا۔ پھر بھی اس سے آنسو روکے نہ رک رہے تھے درد بھرے راگوں کا الاپ اس کے دل میں موجیں مارنے لگا۔ آخر کا وہ بولا ''اپنے دل میں میرے لئے ذرا سی جگہ رکھنا، ماں۔'' اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

چندر اس کے پاس گیا اور کہا ''مرد اپنی ماؤں کے لئے اتنا نہیں روتے بیٹا۔ میری بھی تو ماں نہیں ہے۔ چلو چلیں۔ دیر ہو رہی ہے۔''

مگر چندر کا اپنا بھی جی بھر آیا۔ آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں بولا ''دریابی بی، سلام، سلام، سلام۔''

اپنے دونوں طرف کھڑے بھائیوں کے گرد اس نے بانہیں ڈال دیں۔ وہ تینوں جانی پہچانی.....ان جانی سڑک پر چلنے لگے۔

☆☆☆

MashalBooks.org

شوکت عثمان

شوکت عثمان مغربی بنگال کے ایک کٹر مذہبی خاندان میں 1917ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے سینٹ ژیویئر کالج کلکتہ سے گریجویشن کی اور کلکتہ یونیورسٹی سے بنگال زبان وادب میں ایم اے کیا۔ 1942ء میں وہ کلکتہ انسٹی ٹیوٹ آف کامرس میں لیکچرر ہوئے۔ آزادی کے بعد وہ اس وقت کے مشرقی پاکستان چلے گئے جہاں وہ چاٹگام اور ڈھاکہ کالج میں پڑھاتے رہے۔ 1977ء میں وہ ریٹائر ہوئے اس وقت تک مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن چکا تھا 1962ء میں ان کا ناول ''غلام کا قہقہہ'' پاکستان رائٹرز گلڈ نے انعام دیا تھا۔ یہ ناول ایوب خان کی آمریت کے خلاف تھا۔ اگرچہ یہ انعام ایوب خان نے صدر کی حیثیت سے خود پیش کیا تھا لیکن بعد میں جب معلوم ہوا کہ اس کی کہانی اور اس کا موضوع حکومت کے خلاف ہے تو رائٹرز گلڈ نے غیر سرکاری طور پر وہ انعام واپس لے لیا تھا۔ ان کے دوسرے ناولوں میں آدم کے بچے (1945) بھیڑیوں کا جنگل(1980) کیڑوں مکوڑوں کا پنجرہ(1983)اور سرکاری گواہ(1985)شامل ہیں ان کے افسانوں کے بھی کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ آج کل وہ ڈھاکہ میں رہتے ہیں۔

ڈاکٹر عارفہ سیدہ زہرا

ڈاکٹر عارفہ سیدہ زہرا نے اس ناول کا اردو ترجمہ عثمان جمیل کے انگریزی ترجمہ سے کیا ہے۔ عثمان جمیل بنگلہ دیش کے معروف ماہر تعلیم ہیں۔ ڈاکٹر عارفہ سیدہ پاکستان کی ممتاز ماہر تعلیم اور ادیب ہیں۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو او رہوائی یونیورسٹی امریکہ سے جنوبی ایشیا کی ثقافتی او رادبی تاریخ میں ایم اے او رجنوبی ایشیا میں علم و دانش کی تاریخ پر پی ایچ ڈی کیا ہے۔ اردو ہندی کے علاوہ وہ عربی، فارسی اور فرانسیسی زبان پر بھی دسترس رکھتی ہیں۔ برکلے، ہوائی اور شکاگو یونیورسٹیوں سے انھوں نے علم تاریخ، ریسرچ کا طریقہ کار اور ادب کی تخلیق پر بھی اعلیٰ اسناد حاصل کی ہیں۔

وہ آج کل گورنمنٹ کالج برائے خواتین گلبرگ کی پرنسپل ہیں۔ ڈاکٹر عارفہ نے مشعل کے لئے ایک مراکشی ناول ''ابابیل'' کا ترجمہ بھی کیا ہے جسے علمی و ادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا ہے۔

MashalBooks.org

MashalBooks.org